بہترین انشا پرداز

یعنی

رسالۂ الناظر لکھنؤ کے انعامی مقابلہ کے مضامین

…حالی - نذیر احمد و شبلی کی انشا پردازی پر تبصرہ ، اور ان کی ادبی خصوصیات کا باہم موازنہ کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ

(۱) سب سے بڑا انشا پرداز کون تھا

اور

(۲) سب سے زیادہ اردو کی خدمت کس نے انجام دی

دستخط شدہ

…سعید انصاری بی اے (جامعی) | (۴) مولوی محمد منظور مولوی فاضل
…سید نجیب اشرف ندوی بی اے | (۵) مولوی محمد عبد اللطیف صدیقی
…ایل ایل بی | (۶) مولوی محمد یوسف اسلامی

مرتبہ

ظفر الملک علوی (ایڈیٹر الناظر)

الناظر پریس لکھنؤ میں طبع ہوا

پرنٹر : اسحاق علی علوی
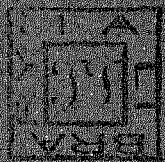
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادب اردو کے عناصر اربعہ

میں

علامہ شبلی کا درجہ

تمہید جس طرح حیاتِ انسانی مرکب ہے اربعہ عناصر سے، یعنی آب، باد، آتش، وخاک، اسی طرح ہمارے اردو لٹریچر کی ترکیب اصلی بھی چار بڑے عناصر سے ملکر ہوئی ہے یعنی آزاد، نذیر احمد، حالی، وشبلی۔ انھیں علحدہ کرلو تو اردو ایک قالب بے جان اور ایک تہی مایہ زبان رہجاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں عنصر اعظم کون ہے؟ اسی کا جواب دینا اس مضمون کا مقصد ہے۔ لیکن اصل میں اس سوال کی دو حیثیتیں ہیں (۱) ادبی (۲) علمی۔ ادبی حیثیت یہ کہ سب سے بڑا انشاپرداز کون ہے؟ اور علمی حیثیت یہ کہ کس نے سب سے زیادہ اردو کی خدمت کی؟ سب سے پہلے ہم سوال کے حصہ اول کو لیتے ہیں۔

اردو انشاپردازی کے ادوار یہ ایک بحث طلب امر ہے کہ آیا مصنف اپنے ماحول کا پابند

ہوتا ہے یا ماحول کو وہ اپنا پابند بنا لیتا ہے؟ تاریخ جہاں ایسے مصنفین کی فہرست پیش کرتی ہے جو اپنے گردوپیش کے اثرات کا شکار رہوئے، وہاں اس کے اوراق میں ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے ماحول سے نکلکر مستقبل پر بھی بہت کچھ اثر ڈالا۔ ہمارے یہ مشاہیر اردو بھی اس قانون فطرت سے باہر نہیں۔ اس بنا پر مذکورہ بالا مصنفین کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے زمانہ کی لسانی و ادبی تغیرات کی تصویر ہے اور ہر ایک اپنا اپنا جدا رنگ رکھتا ہے۔ اگرچہ تاریخ میں بعض وقت زمانہ یا دوُر کی تقسیم ایک خود اختیاری فعل سمجھا جاتا ہے لیکن ایسا کرنا ضروری بھی ہوتا ہے۔ اس بنا پر ان مصنفین کی انشا پردازی کے چار مختلف دوُر نظر آتے ہیں۔

پہلا دوُر ادب اردو کی نشو و نما کا زمانہ وہ تھا جبکہ مغلیہ سلطنت کا چراغ سحری گل ہو چکا تھا اور حکومت انگریزی کا آفتاب افق مشرق سے طلوع ہوکر سارے ہندوستان پر چمک رہا تھا۔ اسلامی حکومت کے ساتھ اسلامی زبان و علوم بھی رخصت ہو چکے تھے لیکن چلتے چلتے اپنی بہت کچھ یادگار چھوڑ گئے۔ اردو زبان کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اس کے مصنفین پر یہ دشوار گزار فرض عاید ہوا کہ اسلاف کے اس ترکہ میں سے صرف وہی سامان لیں جو قابل قبول اور ضروری ہوں۔ انگریزی زبان کے مصنفین آج تک اس امر کے برابر کوشاں ہیں کہ اپنی زبان سے یونانی، لاطینی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے اثرات اگر یکسر مٹا نہ سکیں تو حتی الامکان انھیں کم سے کم کردیں۔ اس عہد اسلامی میں تعلیم و تعلم، درس و تدریس، شعر و شاعری سب کام فارسی یا عربی میں ہوتے تھے۔ فارسی، حکومت وقت کی زبان تھی اور عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان سمجھی جاتی تھی۔ علاوہ ان کے سنسکرت، بھاشا اور دوسری پراکرت زبانیں بھی ہندوستان میں پہلے سے موجود تھیں جب اردو نے

ان زبانوں کی جگہ لینی چاہی، تو اسوقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا لے اور کیا نہ لے۔
پروفیسر آزاد جنھیں ان عناصر اربعہ میں اولیت کا شرف حاصل ہے، اپنے زمانہ کے
ان اثرات کا بیّن نمونہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں فارسی وعربی الفاظ کے علاوہ کثرت سے
تشبیہات واستعارے ملتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تشبیہ واستعارہ کا استعمال متقدین
شعرائے فارسی کے ہاں بھی تھا لیکن متاخرین نے نہ تو ان میں کوی جدت پیدا کی اور
نہ اعتدال کو ملحوظ رکھا اور انھی کی تقلید کورانہ ہمارے اردو شعرا و مصنفین نے کی جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ وہی شے جو قدما کے رخ کلام کا خال تھا، اردو انشا پردازی کے چہرہ پر
بدنما مسّہ معلوم ہونے لگا۔ پروفیسر آزاد کی ہر بات تشبیہ واستعارہ میں ہوتی ہے اور
وہ بھی اکثر غیر مشبہ تشبیہوں اور مستعار استعاروں میں۔ ایک دوسرا اثر جو ان کی تحریر سے
نمایاں ہے، وہ ہندی اور بھاشا کا ہے۔ ہر چند کہ یہ یہاں کی اصلی زبانیں تھیں لیکن
ان سے وہی افعال واسما لینا چاہیئے تھا جو فارسی وعربی کے ساتھ کھپ سکتے۔
انشا پرداز یا شاعر کا ایک بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ جس زبان اور طرز ادا میں
اپنے خیالات کا اظہار کرے، وہ زبان اور طرز ادا زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قایم رہنے
والی ہوں۔ سعدی اور حافظ کو آج تقریباً چھ سو برس کا عرصہ گزر گیا لیکن ان کی
زبان آج بھی ویسی ہی تر و تازہ اور بانکیت معلوم ہوتی ہے، جیسی ان کے زمانہ میں
تھی۔ ان کے کلام و تحریر کا آج بھی ہر لفظ فارسی دانوں میں ویسا ہی گوش آشنا اور
متعارف ہے، جیسا چھ صدی پیشتر تھا۔ پروفیسر آزاد کی وفات کو ابھی صرف ۲۴ برس
گزرے ہیں لیکن ان کی زبان میں ایک طرح کی اجنبیت اور مغایرت کی جھلک
نظر آتی ہے اور یہ کیفیت جتنا ہی پیچھے ہٹتے جایئے اسی قدر زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے
ان کی تحریر کے بیسیوں الفاظ آج متروک ہو چکے ہیں، سیکڑوں تشبیہیں اور استعارے
ایسے ملیں گے جن کا آج استعمال کرنا ذوق سلیم کو غالباً پسند نہ ہوگا۔ طرز ادا میں

ایک طرح کی کہنگی اور دیرینہ پن نظر آتا ہے۔ یہ تمام باتیں بدرجہ غایت ایک تحریر میں پیش کرنا تو ناممکن ہے لیکن ان کا عام انداز بیان ظاہر کرنے کے لئے دربار اکبری سے یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"غرض رات نے صبح کی کروٹ لی، ستارہ نے آنکھ ماری، اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جاکر بہ آواز بلند چلایا کہ سنو! بے خبرو! کچھ خبر بھی ہے؟! بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہونچے اور دریا بھی اتر لیئے۔ اس وقت خان زماں کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے۔ مجنوں خاں قاقشال کو بھونس پتا بھی نہ سمجھتا تھا۔ کچھ پروانہ کی" (دربار اکبری، صفحہ ۲۲)

دوسرا دور | اردو انشاپردازی کا دوسرا دور ڈپٹی نذیر احمد سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے خالص اردو لکھنے کی کوشش کی۔ ان کا وطن اگرچہ بجنور تھا لیکن قیام زیادہ تر دلی میں رہا اس لئے انھیں ٹکسالی زبان لکھنے کا اچھا موقع حاصل تھا۔ ان کی تمامتر کوشش یہ تھی کہ ہر واقعہ اور ہر خیال عام فہم طریقہ پیرا اور سہل زبان میں ادا کیا جائے چنانچہ اسی لئے وہ بالکل ٹھیٹھ اور عامیانہ الفاظ و محاورے استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارے ان کے ہاں کم ہیں اور جو ہیں وہ زیادہ تر دیسی لیکن اس کوشش میں وہ غالباً اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ عام بول چال اور ہوتی ہے اور تصنیفی زبان کچھ اور۔ بدقسمتی سے ادنیٰ اور اعلیٰ دو طبقے ہر زمانہ اور ہر ملک میں رہے ہیں اور اس بنا پر دونو طبقوں کی زبانیں بھی مختلف رہی ہیں۔ انگریزی زبان میں لندن کو وہی درجہ حاصل ہے جو اردو میں دلی کو۔ لیکن انگلستان میں باوجود تعلیم عام ہونے کے لندن کے بازاروں میں جو زبان بولی جاتی ہے، وہ علمی طبقہ کی زبان سے بالکل جداگانہ ہے۔ کوئی انگریزی زبان کا مصنف اگر لندن کی بازاری زبان لکھنے کی کوشش کرتا ہے، یا بھولے سے کوئی لفظ یا محاورہ

استعمال کرلیتا ہے، تو نقادان زبان کی زد سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ ڈپٹی صاحب بھی روزمرہ اور ٹکسالی زبان لکھنے کے جوش میں ایسی زبان لکھ گئے ہیں، جو دلی کے بعض مخصوص محلّوں اور کوچوں میں بولی جاتی ہے۔ روزمرہ لکھنا ہر چند کہ مقبول اور پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے لیکن وہ نہ اس قدر محدود اور ادنیٰ طبقہ کی زبان ہو کہ اس سے باہر دوسرے حلقوں میں سمجھی نہ جاسکے اور اس کے سیکھنے کے لئے انھیں دور دراز مسافت طے کرکے اس مخصوص علاقہ میں آنا پڑے۔ خود ڈپٹی صاحب نے اس خامی کو محسوس کیا اور لغات مروجہ پر اکتفا نہ کرکے انہیں اپنے ترجمۂ قرآن میں اپنے مخصوص استعمال کردہ الفاظ و محاوروں کی ایک طویل جدید فرہنگ لگانی پڑی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ہر قوم میں روزانہ بول چال کی زبان اور ہوتی ہے اور علمی یا تصنیفی زبان اور۔ جہاں تک ڈپٹی صاحب کے افسانوں اور ناولوں کا تعلق ہے، ممکن ہے کہ ان کی زبان زیادہ ناگوار نہ ہو لیکن اس امر پر اتفاق ہونا ممکن نہیں کہ یہ زبان سنجیدہ علمی مضامین، یا مقدس مذہبی خیالات کی بھی متحمل ہوسکتی ہے۔ ڈپٹی صاحب نے بعض آیات قرآنی کے ترجمہ کرنے میں ایسے رکیک اور سخیف الفاظ استعمال کئے ہیں جنھیں سنکر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

آسان اور عام فہم زبان لکھنی اگرچہ ڈپٹی صاحب کی خصوصیت نمایاں ہے لیکن خود چونکہ عربی کے جید عالم تھے۔ زمانہ طالب علمی سے عربی زبان و ادب سے خاص ذوق رکھتے تھے، عربی کے اثر نے ساتھ نہ چھوڑا۔ دلی کی زبان لکھنے بیٹھے ہیں لیکن عربی کے غیر معروف اور مشکل الفاظ بھی جا بجا لکھتے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں مفرد کی بجائے مرکب اور وہ بھی تین چار مفردات سے مرکب الفاظ استعمال کرجاتے ہیں عربی اقوال اور ضرب الامثال کی آمد بھی کچھ کم نہیں۔ قرآن کی آیات بھی گاہ گاہ آجاتی ہیں۔ یہ ہے وہ اجتماع اضداد جسے ڈپٹی صاحب باوجود کوشش کے نہ نباہ سکے اور یہ معجون مرکب

نہ تو اُن کے ادبِ لطیف کے لئے پورے طور پر راس آیا، اور نہ مذہبی لٹریچر ہی کے لئے۔ ان کے انداز بیان کا ہر پہلو تو یہاں پر دکھانا ممکن نہیں لیکن ان کی تحریر کا عام رنگ اس عبارت سے معلوم ہو جائے گا۔ اپنی مشہور کتاب توبۃ النصوح کی ابتداء اس طرح کرتے ہیں:۔

"اب سے دو ایک سال پہلے دہلی میں ہیضے کا اشتداد رہا کہ ایک حکیم بقا کے کوچہ سے ہر روز بیس تیس چالیس چالیس آدمی کھنچنے لگے۔ ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی، جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی، جن بازاروں میں آدھی آدھی رات کھوے سے کھوا چھلتا تھا، ایسے اجڑے پڑے ہیں کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کٹوروں کی جھنکار موقوف سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا، اختلاط و ملاقات، آمد و شد، بیمار پرسی و عیادت، بازدید و زیارت، مہمانداری و ضیافت کل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا، مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس، کہنے کو زندہ پر مردے سے بدتر، دہلی میں ہمت نہ پاؤں میں سکت، یا تو گھر اٹھوا نٹی کھٹوا نٹی لیکر پڑ رہا یا کسی بیمار کی تیمارداری کی یا کسی عزیز آشنا کا مرنا یاد کرکے کچھ رو پیٹ لیا۔ مرگ مفاجات انہی دنوں کی موت تھی۔ نہ نشان نہ گمان، اچھے خاصے چلتے پھرتے یکایک طبیعت نے مالش کی۔ پہلی ہی کلی میں حواس خمسہ مختل ہو گئے۔ الا ماشاء اللہ کوئی جنا بچ گیا تو بچ گیا، ورنہ جی کا متلانا اور قضا سے مبرم کا آجانا"۔ (توبۃ النصوح صفحہ ۲۰۵)

تیسرا دور | مولانا حالی کے پیش نظر ایک طرف پروفیسر آزاد کی وہ زبان تھی جو تشبیہات و استعاروں سے پُر، دوسری جانب ڈپٹی نذیر احمد کی زبان جو فارسی عربی اثرات کے ساتھ ساتھ دلی کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات سے مملو تھی۔ مولانا حالی نے ان کی ترکیب باہمی سے ایک نئی زبان پیدا کرنی چاہی جو دونوں طرز تحریر کے حامیوں میں مقبول اور پسند ہو۔ ان کی تحریریں اس بات کا صاف پتہ دیتی ہیں کہ اس غرض کو

پورا کرنے کے لئے آزاد کے ہاں سے فارسیت اور عربیت لیگئی ہے اور نذیر احمد سے سادگی بیان۔ لیکن مولینا نے دونو طرز تحریر کی اصل روح لینے کی بجائے، صرف ان کی ظاہری خصوصیات کی تقلید کی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زبان بلا کی پھیکی اور بے مزہ ہوگئی ہے صفحے کے صفحے پڑھ جایئے، نہ جذبات میں کوئی حرکت اور نہ قلب پر کوئی اثر۔ سر سید کی لایف کا پہلا اڈیشن کم وبیش ایکہزار صفحوں کی کتاب ہے، شروع سے اخیر تک پڑھ جایئے لیکن ایک ٹکڑہ عبارت کا بھی ایسا نظر نہیں آتا جس سے قلب پر رنج وخوشی، محبت ونفرت، درس وعبرت، کا کوئی اثر طاری ہوتا ہو۔

مولینا حالی کے ادبی شباب کا وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزی حکومت کا پورے طور پر تسلط ہوچکا تھا۔ انگریزی علوم وادب، تہذیب وتمدن کا ہر طرف چرچا تھا۔ انگریزی لکھنا، بولنا ایک فخر سمجھا جاتا تھا۔ آزاد کی طرح حالی بھی اپنے اس جدید ماحول کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے اور اردو میں بلا تامل انگریزی زبان کے الفاظ اور فقرے استعمال کرنے لگے۔ انھوں نے اچھے خاصے اردو الفاظ کے ہوتے ہوے انگریزی کے مفردات ومرکبات استعمال کئے ہیں لیکن یہاں بھی اسی ظاہری تقلید کا خیال رکھا ہے انگریزی زبان سے جدید خیالات یا تشبیہات واستعارات کو کسیقدر تصرف کے ساتھ اردو میں لاتے تو وہی آج اس زبان کے رخ زیبا کے خط وخال بنتے یا بضرورت ایسے انگریزی الفاظ لیے جاتے جن کے ہم معنی الفاظ اردو میں نہ ہوتے تو آج اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ لیکن بد قسمتی سے ظاہری تقلید نے مولینا کی زبان کو نہایت پھیکی، غیر دلچسپ اور بے اثر بنا دیا ہے ذیل کی عبارت ان کے عام انداز بیان کا ایک نمونہ ہے:

"سر سید اگر گھر کے انتظام اور نون تیل لکڑی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات جو انھوں نے گزشتہ چالیس پچاس برس میں سرانجام کیں، وہ کون کرتا؟ انھوں نے اپنے کاموں کے لئے جو ہندوستان میں

اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن پر خرچ کرنے کی ان کو بالکل عادت نہ تھی دس بارہ لاکھ سے کم وصول نہ کیا ہوگا۔ اگر وہ کفایت شعاری کو کام فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیسے میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اگر وہ اپنے گھر کو مہمان سرا نہ بناتے تو علی گڈھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیونکر بن سکتا تھا۔ اگر وہ ہزار ہا روپے اپنے پاس سے صرف کر کے اطراف ہندوستان میں چندہ کے لئے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفر خرچ کمیٹی کے ذمے ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈھتے کیونکر اپنا وقار قایم رکھ سکتے تھے۔ اگر وہ یورپین طبقہ پر ہائی لائیف نہ رکھتے تو ہندوستان کے ارکان سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیونکر متوجہ کر سکتے تھے۔" (حیات جاوید، صفحہ ۲۱۴)

چوتھا دور علامہ شبلی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔ انھوں نے آزاد کی "شاعرانہ اردو"، نذیر احمد کی "سوقیانہ اردو" اور حالی کی "پھیکی اردو" دیکھی۔ خود ایک دور بیں نظر اور نقد پسند طبیعت رکھتے تھے۔ معاملہ کی اصل تہ کو پہونچے۔ انھوں نے سوچا کہ آزاد کے تشبیہات و استعارات کی آورد اردو کی قوت برداشت سے باہر ہے، نذیر احمد کا عامیانہ طرز بیان اور سوقیت زبان اردوے معلّٰی کی شان سے پست تر ہے، حالی کی بے نمکی اور پھیکا پن انشا پردازی کے حق میں سم قاتل ہے۔ زمانہ کا بھی رنگ دیکھا کہ اب نہ وہ پہلی سی اسلامی حکومت ہے کہ فارسی و عربی کا اثر باقی رہ سکے اور نہ ہندوستان کا ہر شہر دہلی و لکھنؤ ہے، جہاں کی ٹکسالی زبان تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور نہ انگریزی راج کے ساتھ انگریزی کا یہ اثر دیرپا ہے کہ انگریزی زبان کا ہر لفظ اور ہر فقرہ قابل قبول ہو سکے، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ "برادران وطن" ناگری رسم خط کے ساتھ ہندی کی ترویج میں کوشاں ہیں۔ ان تمام زمانی و مکانی دشواریوں کا لحاظ کر کے علامہ شبلی نے وہ طرز ادا اور

زبان اختیار کی جسمیں بہ یک وقت آزاد کی شوخی تحریر، نذیر احمد کی روزمرہ اور حالی کی سادگی ادا بھی موجود ہو، مگر ہر ایک اعتدال کے ساتھ نہ اس قدر تشبیہات و استعارے کی بھر مار کہ زبان صرف شاعری کے کام کی ہوجاے' نہ اسقدر سوقیت اور عامیانہ پن کہ سنجیدہ اور علمی و مذہبی مضامین کو اس کا جامہ پہننے سے عار آئے اور نہ ایسی پھیکی اور بے مزہ کہ سامع پر کوئی اثر یا جذبہ پیدا نہ ہو۔ بلکہ اس زبان کو لیجئے اور اُسے خواہ شاعری سے نازک اور لطیف مضامین کے لئے استعمال کیجیے، خواہ علمی، مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کو اسکے ذریعہ ادا کیجیے یا اسے ادب لطیف میں برتئے۔ ہر صنف ادب اور ہر طرز ادا میں قدرے تغیر و تبدل کے ساتھ یکساں طور پر استعمال ہوسکتی ہے۔ ایم۔ مہدی حسن ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اردوے خاصہ" کی داد ملتی، جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اُٹھتی تھیں، آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانیوں پر آئی ہوئی نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی، مدتوں شعراسے گاڑھا اختلاط رہا۔ بہ اقتضائے سن بری طرح کھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے، اور بہتیرے بنائے بگاڑے کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا لیکن یہ باتوں ہی میں سب کو ٹالتی رہی۔ بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہوکر رہ گئے اور بال بال بچی۔ آخر آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول نویس تو یہاں تک ہاتھ دھوکر پیچھے پڑے کہ اسکی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ کبھی کبھی دبی زبان سے اسے یہ کہتے سنا۔ 'اری اٹھ جاؤں گی میں صحنک'۔ لیکن دفعتہً اسکی حالت نے پلٹا کھایا، کثرت فواحش باعث سنجیدگی ہوگئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علماء کی کنیزوں میں داخل ہے لیکن سنا گیا ہے خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب انھی کے تصرف میں رہتی ہے۔" (افادات مہدی صفحہ ۲۰۰-۲۰۱)

شبلی کی "اردوئے خاصہ" کی داد ایک غالب ہی سے کیوں چاہیئے '

آج اگر انصاف سے دیکھا جایے تو علامہ شبلی کی اس خدمت کا جو انھوں نے اردو کو حیات جاوید بخشکر کی ہی' ہر شخص معترف ہوگا۔ اردو زبان ان کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی جنھوں نے اسکو "دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملانے کے" قابل بنایا' جنھوں نے اسکو ملک کے "منچلوں" کی "پردہ دری اور بے آبروئی" سے "بال بال بچایا"' جنھوں نے "کل کی چھوکری" کو "مقدس علما کی کنیزوں" میں داخل ہونے کا شرف بخشا۔ دلی اور لکھنؤ بلبل کی تذکیر و تانیث' "کسو" اور "تلک" کے استعمال و ترک استعمال' دشوار قوافی و ردیف اور سنگلاخ زمینوں میں شعر نکالنے میں مصروف تھے اور ایک پورب کا رہنے والا دلی سے سیکڑوں اور لکھنؤ سے بیسیوں میل دور کا باشندہ اردو کو آب بقا سے سیراب کرنے اور اس کے لئے حیات جاوید کے سامان فراہم کرنے میں سرگرم تھا خوش ہوں اہل دہلی اور اہل لکھنؤ کہ اس نے "ان کی" زبان کو وہ زندگانی بخشی کہ اغیار اس کے مٹانے کی کوشش کریں گے اور وہ نہ مٹ سکیگی' اس نے اسکو وہ مرتبہ بخشا جسپر ہندوستان کی دوسری زبانیں رشک کریں گی' اس نے اسے اس قابل بنایا کہ آیندہ نسلیں اسے اپنے خیالات کے بے تکلف اظہار کا ذریعہ بنائیں گی' اس نے اسمیں قبول عام اور دیرپا قیام کے اجزا کی ایسی ترکیب دی جو آیندہ "ہند بھاشا" ہونے کا دعوی کر سکے گی۔ مولینا شبلی کا عام انداز بیان اس طرح کا ہوتا ہی:-

"دنیا میں جسقدر حکمراں گزرے ہیں ہر ایک کی حکومت کی تہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا' یہاں تک کہ اگر اتفاق سے وہ مدبر یا سپہ سالار نہ رہا تو دفعۃً...... فتوحات بھی رک گئیں یا نظام حکومت کا ڈھانچہ بگڑ گیا۔ سکندر ہر موقع پر ارسطو کی

ہدایتوں کا سہارا لے کر چلتا تھا، اکبر کے پردہ میں ابوالفضل اور ٹوڈرمل کام کرتے تھے،
عباسیہ کی عظمت وشان برامکہ کے دم سے تھی لیکن حضرت عمر کو صرف اپنے دست و بازو کا
بل تھا۔ خالد کی عجیب وغریب معرکہ آرائیوں کو دیکھکر لوگوں کو خیال پیدا ہو گیا تھا
کہ فتح وظفر کی کلید انہی کے ہاتھ میں ہے، لیکن جب حضرت عمر نے ان کو معزول کر دیا تو
کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ کل سے کونسا پرزہ نکل گیا ہے؟۔ سعد وقاص فاتح ایران کی
نسبت بھی لوگوں کو اسی قسم کا وہم پیدا ہو چلا تھا، وہ بھی الگ کر دیے گئے اور
کسی کے کان پر جوں بھی نہ چلی۔ یہ سچ ہے کہ حضرت عمر خود سارا کام نہیں کرتے تھے
اور نہ کر سکتے تھے لیکن جن لوگوں سے کام لیتے تھے، ان میں سے کسی کے پابند نہ تھے۔
وہ حکومت کی کل کو اس طرح چلاتے تھے کہ جس پرزے کو جہاں سے چاہا نکال لیا اور
جہاں چاہا لگا دیا، مصلحت ہوئی تو کسی پرزے کو سرے سے نکال دیا اور ضرورت ہوئی
تو نئے پرزے تیار کر لئے۔" ("الفاروق" صفحہ ۲۴۴ و ۲۴۵)

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ ان مصنفین کی انشا پردازی پر ایک اجمالی
ریویو تھا اور ہر ایک کی تحریر کا ایسا نمونہ پیش کیا گیا جس سے اس کے عام انداز بیان
کا پتہ چلتا ہو۔ لیکن اس امر کے تصفیہ کے لئے کہ ان میں سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟
ضرورت اسکی ہے کہ سب سے پہلے انشا پردازی کا ایک معیار قایم کیا جائے اور
اسکی ضروری خصوصیات بیان کی جائیں، پھر دیکھا جائے کہ کون اس معیار پر پورا
اترتا ہے؟ اور کس میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں اور کہاں تک؟۔

انشا پردازی کی تعریف سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ انشا پردازی کسے کہتے ہیں؟
اگر یہ صرف مافی الضمیر کے اظہار کا نام ہے تو اس میں حیوان و انسان دونو برابر ہیں۔
فرق اتنا ہے کہ اول الذکر اکثر اعضا کے اشارات سے اپنے اندرونی جذبات کا
اظہار کرتا ہے یا کبھی اپنی مخصوص بولی ہیں۔ اور انسان کے جذبات ولی موضوع

الفاظ کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً کتے کو جب اس کا مالک پیار کرتا ہے تو وہ محبت سے دُم ہلانے لگتا ہے۔ یا بلی جب بھوکی ہوتی ہے تو مسکینت بھری آواز سے "میاؤں میاؤں" کرنے لگتی ہے لیکن انسان جذبۂ محبت یا خواہش گرسنگی کے اظہار کے لئے موضوع کلمات زبان سے نکالتا ہے۔ چنانچہ اسی وصف کو جو حیوان و انسان کے درمیان مابہ الامتیاز ہے، عربی میں "نطق" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر انسان کو "حیوان ناطق" کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر نطق ہی کا نام انشا پردازی ہے تو یوں بولنے کو جاہل و عالم، دیہاتی و شہری سب بولتے ہیں مگر ہر ایک محض انشا پرداز نہیں سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک دریا طغیانی پر ہے، ایک دیہاتی اسکو پار کرکے اپنے گاؤں کو جاتا ہے گھر پہنچکر وہ اپنے بیوی بچوں میں راستہ کی سرگذشت کا جس معمولی طریقہ پر ذکر کرے گا اُسے انشا پردازی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اسی واقعہ کو جب کوئی بڑا انشا پرداز بیان کرے گا تو وہ پانی کے تلاطم، کشتیوں کے تھپیڑے کھانے، کھڑی فصلوں کے تہِ آب ہونے اور جل تھل سب ایک ہو جانے کو جس موثر طریقہ پر بیان کرے گا، اس سے سننے والے یا پڑھنے والے پر خوف و رنج اور حیرت و استعجاب کا ایک اثر طاری ہو جائیگا۔ دور کیوں جایئے، اصل لفظ کے معنی پر غور کیجیے۔ "نشا" کے لغوی معنی اُبھرنے ابھارنے، یا بلندی و ترفع، کے ہیں، چنانچہ "نشا" کے لغوی معنی میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے اور مجازی معنی "شعر کہنے یا خطبہ دینے" کے ہیں اور وہ اسی بنا پر کہ شاعر یا خطیب ایک تو خود مشتعل جذبات سے پُر ہوتا ہے، دوسرے وہ اپنے کلام یا بیان کے زور سے اَوروں کے جذبات ابھارنا چاہتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ جذبات انگیز نثر نگاری کے لئے بولا جانے لگا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بڑا "منشی" ہے یعنی اعلیٰ درجہ کا لکھنے والا ہے (گو اب یہ لفظ گرکر عرف عام میں محرر یا کلرک کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔)

خطابت، شاعری، و انشا پردازی کا فرق مذکورہ بالا تشریح کے مطابق جب انشا پردازی کی غرض اصلی اثر ریزی اور جذبہ انگیزی ٹھیری تو پھر خطابت، شاعری اور انشا پردازی میں فرق ہی کیا رہا؟ (یہاں پر فنون لطیفہ کی صرف ان اصناف سے بحث ہے، جو الفاظ کی شکل میں بذریعہ تقریر یا تحریر ظاہر ہوتی ہیں۔ اس بنا پر مصوری، ہنگری ونقاشی وغیرہ ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہیں) ۔ خطابت میں زیادہ تر فوری جوش واثر کا پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، کوئی اتفاقی واقعہ پیش آیا اور اس کے لئے سامعین کے جذبات کو تھوڑی دیر کیلئے مشتعل کر دیا گیا لیکن جیسا ہنگامی اس جوش وخروش کا چڑھاؤ ہوتا ہے، ویسا ہی فوری اسکا اتار بھی ۔ مدوجزر کی طرح ان جذبات کو کوئی قیام نہیں ہوتا۔ اس وقتی اثر ریزی کے لئے خطیب کو قریبی گرد وپیش کی اشیا سے ہی کام لینا پڑتا ہے، تشبیہ واستعارہ یا مثل وحکایت کے لئے اسے بعید از قیاس یا دیر فہم چیزوں سے کام لینا مناسب نہیں ۔کیونکہ سامعین کے جذب ب توجہ یا غور وفکر میں ذرا سی تاخیر بھی خطیب کی تمام محنت کو رائگاں کر دیگی ۔ مثلاً ایک مقرر اپنے مخاطبین کو قتل وخونریزی کی یاد دلانا چاہتا ہے تو وہ بجائے اس کے کہ میدان کربلا کا نقشہ کھینچے یا کسی خونریز جنگ کے واقعات بیان کرے اس کا صرف یہ کہدینا کافی ہوگا "مجھے تم میں سے کتنوں کے سر تن سے جدا نظر آتے ہیں؟ کتنوں کی لاشیں زمین پر تڑپتی دکھائی دے رہی ہیں!" یا مثلاً وہ سامعین کو صلح جوئی اور امن پسندی کی تلقین کرنی چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ فلسفہ امن وصلح بیان کرے، وہ ہاتھ سے اشارے کر کرکے یہ کہتا ہے کہ "تم جس غرض سے آج اس چھت کے نیچے جمع ہوئے ہو، کیا سمجھتے ہو کہ اس چپہ زمین سے ایک رائی برابر امن بھی اپنے دامن میں (دامن کو ہاتھ سے پکڑ کر) لیکر اٹھو گے؟" غرض خطابت کی جوش انگریزی اور اثر ریزی صرف وقتی اور ہنگامی ہوتی ہے ۔ یہ جوش

وخروش نہ اس سے زیادہ ٹھہرتا ہی اور نہ زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت ہوتی ہی۔

شاعری کا مفہوم عام طور پر کلام موزوں سمجھا جاتا ہی یعنی کلام میں ایک طرح کا وزن پایا جائے۔ آگے چلکر قوافی و ردیف کی شرط بھی آجاتی ہی۔ لیکن بعض محققین کے نزدیک شاعری نام ہے تخئیل کا۔ یعنی ایسا کلام جسے شاعر کی قوت تخئیل نے نہایت لطیف اور پر اثر طریقہ پر ادا کیا ہو۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہی کہ شاعری ایک طرح کی محاکات ہی اور وہ محاکات کے دائرہ کو اسقدر وسعت دیتا ہی کہ تخئیل اس سے باہر نہیں جاسکتی۔ اس گروہ کے نزدیک واقعات زمانہ یا مناظر قدرت کا نقشہ اس طرح پر پیش کیا جائے کہ کلام کے سننے والے پر وہی اثر طاری ہو جو ان واقعات و مناظر کو خود دیکھنے سے ہوتا۔ معنی کے لحاظ سے اگرچہ موخرالذکر دونو گروہ پہلے گروہ سے مختلف ہیں لیکن کلام میں وزن ہونے سے انھیں بھی انکار نہیں۔ یہ اسکو شاعری کا ایک جزو سمجھتے ہیں گو اول الذکر گروہ کی طرح اسی کو اصل شاعری نہیں قرار دیتے۔ ایک اور خاص فرق جو خطابت اور شاعری میں ہے، وہ یہ کہ شاعر کو اپنے مخاطب یا سامع سے کوئی غرض نہیں۔ وہ جن جذبات سے خود متاثر ہوتا ہی، یا جو واقعات اسکی نظر سے گزرتے ہیں، ان جذبات و واقعات کو ظاہر کردینا اسکی غرض اصلی ہے لیکن اس طریقہ پر کہ کوئی شخص جب پڑھے یا سنے تو وہ بھی انہی جذبات سے متاثر ہو۔ شاعری کی ظاہری حیثیت سے ایک خاص بات جو اسمیں ہی، وہ کسی میں نہیں۔ یعنی کلام میں وزن کے التزام اور قافیہ و ردیف کی پابندی سے ضروری و مناسب الفاظ کی آمد ہر موقع پر ممکن نہیں ہوتی اور نہ اس قید اور پابندی کی وجہ سے یہ کلام ہر شخص اور ہر وقت کے لئے مناسب اور ممکن ہوسکتا ہی۔ دوسرے، معنوی لحاظ سے شاعری میں صحت واقعات اور اظہار حقیقت کی شرط کوئی لازمی امر نہیں۔ ممکن ہی اور بہت ممکن ہی کہ اظہار جذبات کے جوش اور

تخئیل کی بلند پروازی میں صحتِ واقعہ اور حقیقت امر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔
ان دونوں کے برعکس انشا پردازی کی غرض وغایت کچھ اور ہے۔ اس کا مقصد خطابت کی طرح نہ تو فوری جوش وخروش کا ابھارنا ہنگامی اثر پیدا کرنا ہوتا ہے اور نہ شاعری کی طرح اظہار جذبات یا خیال آرائی ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ایک مستقل بالذات شے ہے۔ اس کا مخاطب نہ تو کوئی انسانی مجمع ہوتا ہے اور نہ وہ تمام تر متکلم ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ وہ اپنی اثر انگیزی میں ایک خاص ثبات اور مناسبت رکھتی ہے جو نہ بالکل وقتی ہوتی ہے اور نہ ضرورت سے زاید۔ اس کے ہاں نہ تعجیل اثر کا لحاظ ہے جس سے انشا پرداز صرف اپنے گرد وپیش کی چیزوں پر اکتفا کرے، نہ اوزان وقوافی کی قید، جس سے غیر ضروری یا نامناسب الفاظ کی بھرتی کرنی پڑے اور نہ اس کے ہاں تخئیل کی بلند پروازی اور محاکات کی شرط، جس سے صحت واقعات اور اظہار حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انشا پردازی اظہار خیالات اور تحریر واقعات کا ایسا ذریعہ ہے جو الفاظ کی بے جا نمایش اور معانی کے مبالغہ وغلو سے پاک ہے اس کے ذریعہ واقعات نہایت سیدھے سادہ طریقہ سے ادا کئے گئے ہوں۔ خیالات میں بعد اور پیچ نہ ہو۔ تشبیہ واستعارہ کی جگہ زیادہ تر نفس واقعہ سے کام لیا گیا ہو۔ غرض یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو ہر معمولی شخص کیلیے ممکن الحصول اور قابل عمل ہے۔

الفاظ ومعانی | اسی سلسلے میں ایک نہایت لطیف اور دلچسپ بحث یہ آتی ہے کہ آیا انشا پردازی کا دار مدار الفاظ پر ہے یا معانی پر۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ انشا پردازی نام ہے بہترین الفاظ کے بہترین طریقہ پر استعمال کا۔ نئے معانی وخیالات ہر روز نہیں پیدا ہوتے۔ ایک ہی خیال ہوتا ہے جو مختلف انشا پرداز مختلف طریقہ پر ادا کرتے ہیں، لیکن ان میں جو فرق ہوتا ہے وہ انتخاب الفاظ اور طرز ادا کا۔ کوئی اسی خیال یا واقعہ کو اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا،

کسی کا طریقہ بیان اور انتخاب الفاظ ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے سے ایک خاص کیف اور اثر طاری ہونے لگتا ہے۔ انگریزی زبان کے جاننے والے اس نکتہ کو اس مثال سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ انگلستان کی تاریخ ہزاروں مصنفین نے لکھی ہے لیکن جو کیفیت اور اثر لارڈ میکالے کی تاریخ کے چند ابواب پڑھکر ہوتا ہے، وہ اور کسی کی تحریر سے نہیں

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ انشا پردازی یا حسن کلام موقوف ہے اعلیٰ معانی اور حسن خیالات پر۔ جبتک معانی میں کوئی ندرت یا خیالات میں کوئی کشش نہ ہوگی نرے الفاظ کا کوئی اثر نہیں۔ تحریر میں اثر اسی وقت ہوتا ہے جب خیالات پر اثر ہوتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ "انچہ از دل خیزد بر دل ریزد"۔ دنیا کے اکثر بڑے بڑے مصلحین بڑے انشا پرداز بھی مانے جاتے ہیں۔ انگریزی لٹریچر میں زبان کے لحاظ سے انجیل کا جو درجہ ہے، وہ کسی کتاب کا نہیں۔ بعض نقادان فن مہاتما گاندھی کے طرز تحریر کو انگریزی انشا پردازی کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ الفاظ و معنی کا تعلق جسم و روح کا تعلق ہے جس طرح تنہا روح یا خالی جسم پر زندگی کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اسی طرح لفظ کو معنی سے یا معنی کو لفظ سے جدا کر کے انشا پردازی کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ اگر الفاظ نہایت شاندار اور پر شکوہ ہیں لیکن بے معنی، ممکن ہے کہ پڑھنے والا بادی النظر میں ان سے متاثر ہو جائے لیکن جہاں ذرا سنبھلا اور خیال معنی کی طرف گیا کہ وہ اثر ایکدم غائب ہو جائیگا۔ انشا پردازی کے متعلق اکثر غلط فہمیاں اسی قسم کی ہوئی ہیں۔ یہی حال معنی کا ہے۔ خیالات اور معانی خواہ کتنے ہی بلند اور اعلیٰ ہوں لیکن ان کے ادا کرنے کے لیئے الفاظ ناقص اور غیر موزوں استعمال کیئے گئے ہیں تو ان مضامین و خیالات کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ دنیا میں کتنے ہی بلند خیالات اور اعلیٰ معانی ظاہر ہوئے لیکن اسوجہ سے مقبولیت اور رواج نہ پاسکے کہ ان کا طریقہ اظہار اور طرز ادا

پسندیدہ اور پُر اثر نہ تھا۔ غرض الفاظ و معانی کا تعلق باہمی لاینفک ہے، اور انشا پردازی ان دونوں کی باہمی اور مشترک خوبی اور موزونیت کا نام ہے، جسکی بہترین مثال ہماری کتاب قرآن حکیم ہے۔

اسی بنا پر علمائے ادب نے انشا پردازی کی دو بڑی جامع اور مانع خصوصیات بیان کی ہیں (۱) فصاحت اور (۲) بلاغت جن میں سے ایک کا تعلق زیادہ تر الفاظ سے ہے اور دوسری کا معانی سے۔ اب ہم ان میں سے ہر خصوصیت اور اس کی جزئیات سے بحث کریں گے اور اسی کے مطابق ان مصنفین کی تحریروں کے نمونے پیش کرتے جائیں گے جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ علامہ شبلی میں یہ خصوصیات کس حد تک پائی جاتی تھیں اور ان کے دوسرے معاصرین میں اس کی کس قدر کمی تھی۔

فصاحت اور اسکی جزئیات

فصاحت میں زیادہ تر کلام یا تحریر کی لفظی حیثیت سے بحث ہوتی ہے۔ یعنی الفاظ اپنی ظاہری حیثیت سے کیسے ہیں؟ بولنے یا سننے میں وہ کیا اثر رکھتے ہیں؟ صرفی قاعدہ سے ان کا کیا درجہ ہے؟ اور تحریر بہ لحاظ مجموعی کیسی ہے؟

فصاحت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تحریر کے الفاظ نہایت صاف اور شستہ ہوں۔ صفائی اور شستگی الفاظ سے مراد یہ ہے کہ ان کے بولنے میں زبان کو آسانی ہو اور سننے میں کانوں کو بھلا لگے۔ مثال کے طور پر مولینا شبلی کی یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں:۔

"آج میں نے ایک عجیب دلآویز خواب دیکھا۔ عجیب اس لئے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں اور دلآویزی کی یہ کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے۔ مفصل سنیے۔ آج جمعہ کا دن ہے اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا، میں بھی ہمہ تن شوق بنکر گیا۔ جامع حمیدیہ میں داخل ہوا۔ سلطان المعظم، بڑی شوکت و شان سے آئے لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا کیونکہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو گزرگاہ سلطانی پر پہلے سے موجود

ہوتے ہیں اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کرسکتے۔" (مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ)

اسی کے برعکس تحریر کا ایک بڑا نقص یہ سمجھا جاتا ہے کہ الفاظ ثقیل اور کریہہ ہوں جن کے بولنے سے زبان پر گرانی اور سننے میں کانوں کو ناگواری محسوس ہوتی ہو۔ بعض وقت تحریر میں دو ایک ثقیل لفظ کا آجانا عبارت کو بے لطف اور بدمزہ کردیتا ہے۔ دربار اکبری کی چند سطریں بطور مثال پیش ہیں :۔

"ایک سوار حکم شاہی لیکر دوڑا اور آواز کی طرح پہاڑ سے پھرا، معلوم ہوا کہ محاصرے کو چھوڑ کر اختیار الملک ادھر پلٹا ہے۔ لشکر میں کھلبلی پڑی۔ بادشاہ نے پھر بہادروں کو للکارا۔ نقارچی کے ایسے اوسان گئے کہ نقارہ پر چوٹ لگانے سے بھی رہ گیا۔ یہاں تک کہ اکبر نے خود برچھی کی نوک سے ہشیار کیا۔ غرض سب کو سمیٹا اور پھر فوج کو لیکر دل ٹہلاتا ہوا دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ چند سرداروں نے گھوڑے جھپٹائے اور تیراندازی شروع کی۔ اکبر نے پھر آواز دی کہ نہ گھبراؤ۔ کیوں کھنڈے جاتے ہو۔ دلاور بادشاہ شیر مست کی طرح خراماں خراماں جاتا تھا اور سب کو دلاسا دیتا جاتا تھا۔ غنیم طوفان کی طرح چڑھا چلا آتا تھا۔ مگر جوں جوں پاس پاس آتا تھا، جمعیت کھنڈی جاتی تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوا کہ اختیار الملک چند رفیقوں کے ساتھ جمعیت سے کٹکر جدا ہوا ہے اور جنگل کا رخ کیا ہے۔ وہ فی الحقیقت حملہ کرنے نہیں آیا تھا متواتر فتحوں کے سبب سے تمام ہندوستان میں دھاک بندھ گئی تھی کہ اکبر نے تسخیر آفتاب کا عمل پڑھا ہے اب کوئی اس پر فتح نہ پاسکے گا۔ محمد حسین مرزا کی قید اور تباہی لشکر کی خبر سنتے ہی اختیار الملک بے اختیار محاصرہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔ تمام لشکر اس کا جیسے چیونٹیوں کا قطار۔ برابر سے کترا کر نکل گیا۔ اس کا گھوڑا بگٹٹ چلا جاتا تھا یہ کمبخت بھی تھوہر میں الجھا اور خود زمین پر گر پڑا۔" (دربار اکبری صفحہ ۲۳ و ۲۴)

صفائی، دلکشی اور ثقل و کراہت کی تمیز تو بہتر طور پر انسان کا لطیف سامعہ ہی

کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کچھ اصول بھی مقرر ہیں۔ مثلاً بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ زبان سے آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے اور کانوں کو ان کا سننا بھی بھلا لگتا ہے جیسے بے، تے، رے، زے وغیرہ۔ بعض حروف ایسے ہیں جن کا بولنا اور سننا دونو ناگوار ہوتا ہے جیسے ٹے، ڈال، ڑے وغیرہ۔ اسی طرح الفاظ میں بھی ان حرفوں میں سے کسی ایک کے آنے یا ان میں سے دو یا تین کے قریب قریب جمع ہو جانے، یا ایک ہی حرف کے مکرر ہونے سے ثقل و کراہت پیدا ہو جاتی ہے اور اس بنا پر زبان میں شستہ اور لطیف، ثقیل اور کریہ الفاظ ہو گئے ہیں۔ مکاتیب کی پہلی عبارت میں یوں تو شاید ہی کوئی ثقیل یا کریہ بتایا جا سکے بلکہ "دلاویز"۔ "سماں"۔ "شوق"۔ "سیر" کے آجانے سے زبان و گوش دونو کو ایک خاص حظ محسوس ہوتا ہے۔ برعکس اس کے دربار اکبری کی دوسری عبارت میں "کھنڈے"۔ "جھپٹاے"۔ "فیتوں" "بگٹوٹ"۔ "کھنڈی"۔ "تھنور" کے الفاظ سے پڑھنے والے اور سننے والے دونو کو ایک طرح کی گرانی اور ناگواری معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے بعض جگہ ہائے دوچشمی، چے، اور ڈال کے قریب قریب آجانے سے یا "تھا" پر فقروں کے ختم ہونے سے عبارت میں موسیقیت باقی نہیں رہتی۔

فصاحت کی ایک بڑی خوبی روزمرہ اور بول چال کا استعمال ہے۔ روزمرہ سے مراد وہ زبان ہے جو نہایت سادہ اور عام فہم ہو اور جسے لکھے پڑھے اہل زبان استعمال کرتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی زبان کے الفاظ و محاورات بالکل رائج الوقت ہوں گے۔ علامہ شبلی سے بڑھکر اس نکتہ کو شاید ہی کسی نے سمجھا ہو۔ انھوں نے نہ تو جید اور متبحر علما کی معرب اردو اور نہ اہل زبان کی بازاری اردو لکھی، بلکہ اہل زبان کے پڑھے لکھے طبقہ کی زبان کو اپنے لئے انتخاب کیا جس کا اندازہ اس ٹکڑہ سے بخوبی ہو سکتا ہے:۔

"مدت سے قدمبوسی نہیں ہوئی اور بہت جی چاہتا ہے۔ میرا تو آنا نہیں ہو سکتا اس لئے

امید کرتا ہوں کہ آپ ہی قدم رنجہ فرمائیں۔ ۱۱۔ دسمبر سے یہاں نہایت عمدہ جلسہ اور سیریں ہوں گی اور ۱۹۔ دسمبر تک کالج ایک تماشا گاہ بنا رہیگا۔ پھر بیچ میں وقفہ ہو کر ۲۷۔ دسمبر سے کانفرنس شروع ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ۱۱۔ تاریخ تک تشریف لائیں۔ بیچ میں دلی اور آگرہ کی سیر بھی ہو سکیگی اور آپ نہایت محظوظ ہوں گے۔" (مکاتیب شبلی، حصہ اول، صفحہ ۲۷۳ و ۲۷۴)

لیکن بعض وقت روزمرہ کے مفہوم سے ایک بڑا مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے، یعنی اکثر سادگی بیان اور سہل زبان کے یہ معنی لئے جاتے ہیں جو سوقیت اور ابتذال کے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ خواندہ اور ناخواندہ جبتک یہ دو طبقے کسی سوسائٹی میں موجود ہیں، اسوقت تک ان کی زبانوں میں بھی فرق رہیگا اور اس اختلاف مراتب کی بنا پر ہر دو طبقہ کے مستعمل الفاظ و محاورات اور اقوال و امثال بھی مختلف رہیں گے ایک انشا پرداز کا فرض یہ ہے کہ انتخاب زبان کے وقت اس فرق کو ملحوظ رکھے۔ ہمارے عناصر اربعہ میں اس کے متعلق سب سے بڑی غلط فہمی ڈپٹی نذیر احمد کو ہوئی ہے، جنھوں نے روزمرہ لکھنے کے جوش میں سوقیت کو دخل دیا ہے اور وہ بھی بری طرح۔ توبۃ النصوح میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"ادھر تو نصوح اور سلیم دونو باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، اُدھر اُتنی ہی دیر میں نہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوڑ ہو گئی۔ نعیمہ اسوقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔ پانچ مہینہ کا پہلونٹی کا لڑکا گود میں تھا۔ ناز و نعمت میں پلی، نانی کی چہیتی، ماں کی لاڈو، مزاج کچھ تو قدرتی تیز، باپ کے لاڈ پیار سے دہی کہاوت ہے کریلا اور نیم چڑھا، اور بھی چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیوں گزر ہونے لگا تھا۔ گھونگھٹ کے ساتھ منہ کھلا اور منہ کا کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہو گیا۔ اب چھ چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی

مگر رسی جلی پر بل نہ گیا۔ باوجودیکہ اجڑی ہوئی بیکے پڑی تھی مزاج میں وہی طنطنہ تھا،
کوار نبے ہی میں سواگز کی زبان تھی۔ کچھ یوں ہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا، سو بیاہ ہے
سے ان کو بھی دھتکار بتائی۔ بیٹیا جنے پیچھے تو اور بھی کھل کھیلی، مردوں کا لحاظ اٹھا دیا۔
فہمیدہ نے میاں کے روبرو بیٹوں کا بیڑا اٹھاتے تو اُٹھا لیا لیکن نعیمہ کے تصور سے
بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جی ہی جی میں کہتی تھی کہ ذرا بھی اس بھڑوں کے
کے چھتے کو چھیڑوں گی تو میرا سر مونڈ کر بھی بس نکرے گی" (توبۃ النصوح صفحہ ۲۹)۔

یہ ہے اُس زبان کا نمونہ، جو اردو بولنے والی موجودہ اور آیندہ نسلوں کے بولنے اور لکھنے کے لئے پیش کیگئی ہے۔ روزمرہ ہر زبان کے ناول اور افسانوں میں ہوتا ہے مگر وہ اسقدر محدود رقبہ کی زبان نہیں ہوتی جسے دوسری جگہ کے لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اس زبان کے بولنے اور سمجھنے کا پورا پورا لطف تو گزشتہ صدی میں دلّی کے بعض محلے اور کوچے ہی کے لوگ اٹھا سکتے تھے۔

فصاحت کے سلسلہ میں ایک بڑی نازک بحث سلاست وعدم سلاست کی آتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ سلاست و روانی بذاتہ کوئی وصف نہیں بلکہ روزانہ کے بول چال اور کثرت استعمال سے تحریر میں سلاست و روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کلام مجید کا جب یہ وصف ابوالعلا معرّی سے (جس نے قرآن کا جواب لکھا تھا) بیان کیا گیا تو اُس ملحد نے جواب دیا کہ "ہاں ابھی نہیں، میرا کلام بھی جب کچھ عرصہ تک نمازوں میں متواتر کثرت سے پڑھا جائے، تو اُسمیں بھی وہی سلاست و روانی پیدا ہو جائیگی"۔ لیکن اس طرز استدلال میں ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔ سلاست و روانی کا دارمدار کثرت استعمال پر ہرگز نہیں بلکہ خود الفاظ، محاورات اور ترکیبوں میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں جن سے تحریر میں سلاست یا اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً بعض لفظ میں ایک طرح کی نزاکت و لطافت اور بعض میں

ایک شان و شکوہ پایا جاتا ہے جن کے آنے سے تحریر میں ایک روانی پیدا ہوتی ہے، مگر بعض الفاظ بڑے اور بھونڈے ہوتے ہیں جن سے عبارت میں ایک رکاوٹ اور مغایرت آجاتی ہے ان کی خصوصیات مع مثال کے ذیل میں زیادہ تصریح کے ساتھ آئیں گی۔

تحریر میں عدم سلاست یا مغایرت کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر الفاظ و محاورات متروک ہوتے ہیں، یا طریقۂ بیان بدلا ہوا ہوتا ہے، یا بعض وقت اسماء و ضمایر کی غیر ضروری تکرار ہوتی ہے۔ ان اسباب سے تحریر میں وہ روانی اور سلاست باقی نہیں رہتی جو ایک مروجہ الفاظ اور غیر متروک انداز بیان کی عبارت میں ہوتی ہے۔ ذیل میں پروفیسر آزاد کی یہ عبارت اسکو واضح کردیگی۔ لکھتے ہیں کہ:-

"سلیم شاہ کے محلوں میں ایک کشمیرن بی بی تھی، اس سے سلیم شاہ کی ایک بیٹی تھی، وہ خانخاناں کے لشکر کے ساتھ حج کو چلی تھی، وہ خانخاناں کے بیٹے مرزا عبدالرحیم کو بہت چاہتی تھی اور وہ لڑکا بھی اس سے بہت ہلا ہوا تھا اور خانخاناں اپنے فرزند مرزا عبدالرحیم سے لڑکی کی شادی کرنی چاہتا تھا۔ اس بات کا افغانوں کو بہت خار تھا ایک دن شام کے قریب سہس لنگ وہاں کے تلاؤ میں نواڑے پر بیٹھا، پانی پر ہوا کھاتا پھرتا تھا۔ مغرب کے قریب کشتی سے نماز کے لئے اترا" (دربار اکبری صفحہ ۱۹۱)۔

اس مختصر سی عبارت میں اتنے الفاظ مثلاً "ہلا ہوا"، "خار"، "تلاؤ"، "نواڑے" ہیں جن کا استعمال یا تو بالکل ہی ترک ہوگیا ہے، یا بعض کا موقع استعمال بدلگیا ہے لیکن اس سے بڑھکر طرز بیاں کی اجنبیت ہے۔ دیکھو کہ ابتدائی چاروں جملے ترتیباً "تھی" کے لفظ پر ختم ہوتے ہیں اور بعد کے جملوں میں "تھا" کا التزام ہے۔ اس کے علاوہ بعض الفاظ مثلاً "خانخاناں"، "مرزا عبدالرحیم"۔ اور "وہ" کی تکرار سے عبارت میں کسقدر اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ عیب آزاد کی تحریر میں

بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ ہزاروں متروک الاستعمال الفاظ و محاورات مثلاً "پٹخ پٹخ کر"۔ "ناک گھسنی کرنا"، "باسن"۔ "چھند پانا"۔ "کھوانا" ان کے ہاں ملیں گے۔ طرزِ ادا میں عام طور پر ایک طرح کی کہنگی اور دیرینہ پن پایا جاتا ہے۔

اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کی تحریر میں اگر ایک طرف عربی کے دقیق لغات ہیں تو دوسری جانب اردو کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات بھی ہیں جن سے کہیں کہیں تحریر کی روانی و سلاست میں فرق آجاتا ہے۔ اول الذکر الفاظ اپنی دشواری کی وجہ سے چل نہ سکے، موخر الذکر اپنی عمومیت کے سبب ترک ہوگئے۔ عربی الفاظ و ضرب الامثال اور آیات قرآنی کے استعمال میں تو ڈپٹی صاحب اپنی کمال عربی دانی اور حافظ قرآن ہونیکی وجہ سے مجبور رہتے جسکی مثالیں طوالت کے اندیشہ سے دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن عامیانہ و سوقیانہ الفاظ کے استعمال کی کثرت تو افراط کی حد کو پہونچ جاتی ہے جنمیں سے بعض الفاظ کا نقل کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مثلاً "سٹک جانا"، "چھیڑ خانی"۔ "پھٹکنا"، "لتاڑ"۔ "اکڑ پھول"۔ "کنی کاٹنا"۔ "چیلے چانٹے"۔ "تتو تھمو"۔ "چھدار کھنا" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سنکر غالباً اور حیرت ہوگی کہ یہ تمام الفاظ قرآن مجید کے ترجمہ میں استعمال کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض الفاظ تو ایسے ہیں کہ ایک تحریر کیا ایک تصنیف میں آجانے سے نہ صرف اسکی سلاست کو بلکہ اسکی وقعت کو گھٹا دینے کیلئے کافی ہیں۔

مولینا حالی کی تحریر بھی جو سیدھی سادی زبان لکھنے کے لئے مشہور رہیں، اس عیب سے پاک نہیں نظر آتی۔ ان کی تصانیف سے بھی ایک طویل فہرست ایسے الفاظ کی تیار کیجا سکتی ہے جو یا تو دقیق ہونے کے باعث رفتار زبان کا ساتھ نہ دے سکے یا حد سے زیادہ عام فہم ہونیکی وجہ سے زبان کا مذاق لطیف ان کو نہ نبھا سکا۔ عربی کے ایسے دقیق الفاظ مثلاً "مسنوہ بالشان"۔ "استطرادی"۔ "مطارحات"۔

"معارست"۔ "مادراکد" کا اردو زبان بولنے والے طبقہ میں رواج پانا دشوار تھا برعکس اس کے ایسے عامیانہ الفاظ جیسے "تلپٹ"۔ "ادو"۔ "تیکھاپن"۔ "بھینجڑا" وغیرہ وغیرہ کو قوم کا ادبی مذاق کب گوارا کر سکتا تھا!۔

یہاں تک تو عربی فارسی کے دقیق یا ہندی و بھاشا کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات سے گفتگو تھی جو تحریر میں مانع سلاست و روانی کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اب ایک تیسرے عنصر سے بحث ہے جو نہ صرف مانع سلاست ہو سکتا ہے بلکہ خود زبان کے حق میں مضر ہے۔ اس عنصر سے ہماری مراد انگریزی ہے۔ پروفیسر آزاد کے زمانہ میں عربی و فارسی کا بچا کھچا اثر اسقدر باقی تھا کہ انگریزی کی جو ہندوستان میں ابھی اپنے عہد طفولیت میں تھی، کچھ پیش نگئی اور خیر سے پروفیسر موصوف اس زبان سے کچھ ایسا واقف بھی نہ تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان بھی اپنا اثر جماتی گئی اور ایسا کیوں نہ کرتی، بادشاہ وقت کی زبان تھی۔ اسمیں "ہاں" "نہیں" کہنا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی جس کسی کو انگریزی کی ابجد بھی آتی، وہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا یہی اسباب تھے جن کی بنا پر ہمارے دوسرے اور تیسرے مصنفین (نذیر احمد و حالی) اس انگریزی کا بے طرح شکار ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو انگریزی ملازمت کے تعلق سے اس زبان کا سیکھنا ناگزیر تھا چنانچہ انھوں نے اسے بڑے شوق سے سیکھا اور جلد سیکھ لیا۔ یہ اسی شوق حصول کا اثر ہے کہ انگریزی کا رنگ ان کے ابتدائی مضامین میں بہت زیادہ نظر آتا ہے خصوصًا لکچروں میں تو صریح آورد معلوم ہوتی ہے۔ کثرت استعمال کا یہ حال ہے کہ ان کے درباری لکچر کے صرف ایک صفحہ پر "سپورٹ" (کفالت کرنا) "ٹالرشن" (رواداری) "رلیجس نیوٹریلیٹی" (مذہبی غیر جانبداری)۔ "اناکیولیشن (ٹیکہ)۔ "کوالٹی" (قسم یا صفت)۔ "کوانٹیٹی" (مقدار)

اتنے الفاظ آئے ہیں، حالانکہ ان میں سے ہر ایک کیلئے بہتر اردو کا لفظ موجود تھا۔ نہ صرف الفاظ بلکہ انگریزی امثال، فقرے اور مرکبات بھی استعمال کر گئے ہیں مثلاً "ٹوبی آر ناٹ ٹوبی" (To be or not to be)۔ "جیک آف آل ماسٹر آف نن" (Jack of all master of none) "دی لاسٹ دو ناٹ دی لیسٹ" (The last though not the least) "اپ ٹو مارک" (Upto mark) "سینیر ممبر" (Senior member) "ریوینیو بورڈ" (Revenue Board) وغیرہ وغیرہ۔

مولینا حالی بھی اثر کا اس سے کچھ کم شکار نہ ہوئے اور یہ عیب ان کی سب سے بڑی تصنیفات حیات جاوید اور یادگار غالب تک میں پایا جاتا ہے۔ صفحے اُلٹتے چلے جائیے اور آپ کو انگریزی کے مفرد و مرکب الفاظ ملتے جائیں گے مثلاً "ورکس" (تصانیف)۔ "امیجینیشن" (تخیل)۔ "میٹریل" (مواد)۔ "رفارمیشن" (اصلاح) "ججمنٹ" (فیصلہ)۔ "ایشیاٹک پوئٹری" (ایشیائی شاعری)۔ "ڈسپاٹک گورنمنٹ" (مطلق العنان حکومت) "سلف رسپکٹ" (خوداری)۔ "پبلک اسپیکنگ" (مجمع عام میں تقریر کرنا)۔ "ام مورل" (خلاف تہذیب)۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز وہ مرکبات ہیں جنہیں ایک انگریزی لفظ ہے اور دوسرا اردو۔ مثلاً "کرسچینیٹی سلطنت" (عیسائی سلطنت)۔ "کرٹکل طریقہ" (ناقدانہ طریقہ)۔ "لٹریری دنیا" (علمی دنیا) وغیرہ۔ قوسین میں دیکھو کہ مذکورہ بالا الفاظ میں سے ہر ایک کا اردو مرادف اُسی زورِ معنی کے ساتھ ملسکتا تھا، لیکن کیا اسے مذاقِ ادبی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ خواہی نہ خواہی اس بن بلائے مہمان کو جگہ دیگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ انشاپرداز کو قوم کا بہت بڑا انباض اور زمانہ کا نباض ہونا چاہئے جو سوسائٹی کے میلان طبع اور رفتار زمانہ کے رخ کو پہچان لے۔ اسے معلوم ہوجائے کہ قوم کا مذاق ادبی کیا ہونیوالا ہے اور زمانہ کس طرف کو لیجا رہا ہے۔ علامہ شبلی

اس راز سے بخوبی واقف تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ اردو کا خمیر کچھ اور ہی ہے' اسمیں عربی وفارسی کی آمیزش صرف وہیں تک ہونی چاہیئے جہاں تک اس کے اصلی مزہ میں فرق نہ آئے وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اردو دہلی اور لکھنو تک محدود نہ رہیگی بلکہ اُسے ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلنا ہے ۔ انگریزی کے اس قبول عام کو دیکھکر انھوں نے اندازہ کیا کہ یہ رنگ جمنے والا نہیں' جسدن ہندوستانی جیتے' یہ رنگ اُڑ جائیگا ۔ اس لئے اس زبان سے صرف وہی الفاظ لینے چاہئیں جو ناگزیر ہوں یا جو اپنے ساتھ کوئی مخصوص معنی ومفہوم رکھتے ہوں ۔ یہ اسی حقیقت شناسی کا نتیجہ ہو کہ علامہ شبلی کی ابتدائی سے ابتدائی تحریر اُٹھا کر دیکھئے' اِن عیوب سے بالکل پاک ہوگی ۔ سر دست جو پرانی سے پرانی تحریر دستیاب ہوسکی ہو' وہ مئی ۱۸۸۷ء کا لکھا ہوا ایک خط ہو جسے انھوں نے نینی تال سے اپنے والد بزرگوار کو بھیجا تھا ۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"گو میرا قلم' خامۂ نقاش کی ہمسری کرے جس سے میں اس عجیب وغریب مقام (نینی تال) کی پوری تصویر کھینچ سکوں' تاہم مجھکو امید نہیں کہ اس کوشش سے عزیزانِ وطن کو جو میرے خط پر آنکھ لگائے بیٹھے ہوں گے' اپنے شوق وانتظار کا صلہ ملجائے ۔ میں بے تکلف تسلیم کرتا ہوں کہ نینی تال ایک عجیب اور حیرت انگیز مقام ہے لیکن اگر "تعجب انگیز" اور "دلچسپ وفرحت زا" ہونا دو جداگانہ چیزیں ہیں تو مجھ ایسے ایشیائی خیال آدمی سے یہ امید رکھنا عبث ہو کہ میں اسکو "فرحت زا" بھی مان لوں گا رہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں' ان کا مذہب کیا پوچھنا ؎ ہر چہ آید در دلم غیر تو نیست'

اب حالات سنیئے کارٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہو اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہو ۔ کارٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے مگر تمام راستہ قدرت الٰہی کی نیرنگی

وعظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ، چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے جس پر رستہ چلتا ہے۔
باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جسکی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے۔
دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت
سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دار السلطنۃ
ہوتے ...“ (مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۱۰۹)۔

فصاحت میں جہاں تک الفاظ کا انفرادی تعلق تھا، گزشتہ صفحات میں اس پر
کافی بحث ہو چکی لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی یعنی عبارت کی صورت میں
انشا پردازی کی اس خصوصیت کو کہاں تک دخل ہے؟ اس کے لئے علمائے فن نے
دو اصول قرار دیے ہیں ایک تو یہ کہ مضامین اور مثلیں اسقدر عامیانہ اور رکیک
نہوں کہ ان سے تنفر پیدا ہو بلکہ نہایت دل پسند اور خوشکن ہوں۔ دوسرے
یہ کہ تحریر نہ اتنی طول ہو کہ سنتے سنتے جی گھبرا جائے اور نہ اتنی کوتاہ کہ مطلب خبط ہو جائے۔
ان دو خصوصیات کے اندازہ کے لئے کوئی آلہ اور پیمانہ تو ہو نہیں سکتا، البتہ صحیح مذاق ہی
اس کا بہتر اندازہ کر سکتا ہے۔ مولینا حالی نے ”شعر و شاعری“ میں جہاں شاعری
کی تدریجی رفتار کا ذکر کیا ہے اسکو ایک مثال کے ذریعہ اسطرح واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اسکی مثال ایسی سمجھنی چاہیئے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم
کچے اور اَلُونے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے۔ انھیں پانی میں
ابال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا، انھوں نے اپنی معمولی غذا سے اسی کو بہت
غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھو کر اور
مناسب مصالح اور گھی، دال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی
کے پکانے میں اپنی استادی ظاہر کرنی چاہتا ہے اس کے سوا اور کوئی موقع تنوع
پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی

ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے" (مقدمہ شعر و شاعری، صفحہ)

اور پھر اسی کے بعد تین چار مثالیں یکے بعد دیگرے اسی مضمون کو واضح کرنے کیلئے بیان کرتے ہیں لیکن ان میں نہ تو آپسمیں کوئی خاص فرق ہے اور عامیانہ پن اسقدر کہ ان کے پڑھنے سے طبیعت میں ایک طرح کی بدمزگی پیدا ہوتی ہے لیکن اسی ارتقاء شاعری کے مضمون کو علامہ شبلی صرف ایک مثال سے بیان کرتے ہیں جسے پڑھکر طبیعت سیر ہو جاتی ہے اور جی خوش ہو جاتا ہے۔ انھوں نے شاعری کی رفتار کی مثال ایک قوم کی مادی ترقی سے دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"مثلاً ابتدا میں رہنے سہنے کے لئے پھونس کے جھونپڑے اور خس پوش کچی دیواریں ہوتی ہیں پھر پختہ عمارتیں بنتی ہیں۔ پھر ان میں مختلف حصے، شہ نشین، دالان، صحنچیاں، بالاخانے قایم کئے جاتے ہیں۔ کمرے فرش فروش سے سجاتے ہیں، جھاڑ فانوس دیوار گیریاں لگاتے ہیں تاہم اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے۔ پھر سنگ مرمر کی عمارتیں بننی شروع ہوتی ہیں، جواہرات کی پچی کاری ہوتی ہے، دیواروں پر طلائی نقش و نگار بنتے ہیں، اطلس و کمخواب کا فرش بچھتا ہے، دروازوں پر گوہر نگار پردے آویزاں کرتے ہیں، کافوری شمعیں جلاتے ہیں، یہ ترقی کا آخری دور ہے جس کے بعد تنزل شروع ہوتا ہے اور قوم تباہ ہو جاتی ہے" (شعر العجم حصہ، صفحہ ۱۱)۔

دوسرے اصول (یعنی تحریر نہ طول ہو نہ کوتاہ) اسکی مثال میں سیرۃ النبی کی ابتدائی چند سطریں پیش کیجا سکتی ہیں جنمیں اتنا وسیع مضمون کہ تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس کے کیا طریقے ہونے چاہیئں نہایت اختصار اور خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ:۔

"(اس کا) سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے

'بلکہ فضایل کا ایک پیکر مجسم سامنے...... آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جسکی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ ادا مر سلطانی نجا بیے۔ دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوس قدسیہ کا پر تو ہے۔ دیگر اور اساسے، صرف ایوان تمدن کے نقش و نگار ہیں" (سیرۃ النبی حصہ صفحہ)

اسی مضمون کو اگر پروفیسر آزاد بیان کرتے تو دفتر کا دفتر سیاہ کر ڈالتے۔ زور بیان پیدا کرنے کے لئے آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتے لیکن نہ جانے یہ بات بھی پیدا ہوتی یا نہیں جو ان چند سطروں میں ہے۔

بلاغت اور اسکی جزئیات | انشا پردازی میں فصاحت کا جہاں تک تعلق تھا، اس کا بیان ہو چکا، اب اسکی دوسری خصوصیت، بلاغت کا ذکر ہوگا بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ اسمیں فصاحت کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی تحریر یا الفاظ اسوقت تک بلیغ نہیں کہے جا سکتے جبتک وہ فصیح نہ ہوں۔ لیکن بالخصوص بلاغت کا تعلق الفاظ و تحریر کی معنوی حیثیت سے ہے۔ یعنی جو الفاظ استعمال کئے گئے ہوں وہ معانی کے لحاظ سے بالکل مناسب اور باموقع ہوں۔ نازک اور لطیف مضامین کے لئے ویسے الفاظ ہوں اور شاندار و پر شکوہ واقعات کے لئے دیسے۔ اظہار رنج و غم کے لئے درد آمیز اور غمناک اور مسرت و خوشی کے لئے سرور بخش و فرحت زا الفاظ استعمال کئے گئے ہوں۔ تاکید اور زور پیدا کرنے کے لئے الفاظ موکد اور مکرر ہوں، غرض جس واقعہ یا جس خیال کو انشا پرداز ادا کرنا چاہتا ہے، اس کا صحیح صحیح اور پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے مناسب اور موزوں الفاظ کے ذریعہ کھینچ کر رکھ دے۔ بلاغت کا ایک بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس سماں کو انشا پرداز پیش کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ایسے الفاظ اور ایسا طریقہ بیان اختیار کرے جس سے معلوم ہو کہ اس حالت کے وقت وہ خود موجود تھا۔ علامہ شبلی نے سیرت میں جہاں رسم قربانی سے

بحث کی ہو، حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ ذبح کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو زبانیں بلاغت کی مثال اس سے بہتر ملنی مشکل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی باہمی گفتگو کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:-

"اب ایک طرف نود سالہ پیرِ ضعیف ہو جسکو دعاہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جسکو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ اب اسی محبوب کے قتل کیلیے اسکی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہو۔

"دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ ہی کا مہر پر درہات اس کا قاتل نظر آتا ہو۔ ملائکہ قدسی، فضاہائے آسمانی، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتہً عالم قدس سے آواز آتی ہے کہ

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ (صفٰت)

(ابراہیم تونے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں)

طفیانِ ناز ہیں کہ جگر گوشہٗ خلیل

در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند" (سیرۃ النبی حصہ۱، صفحہ۱۱)

غور کرو اور دیکھو کہ اس مختصر سی عبارت کے پڑھنے کے بعد جو نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہو، کیا وہ یہ نہیں ہو کہ ایک ضعیف کہن سال شخص دل مضبوط کر کے ایک کمسن مسکین بچے کے گلے پر چھری پھیرنا ہی چاہتا ہو کہ اتنے میں آسمان سے ایک آواز آتی ہے اور وہ اپنے ارادہ سے باز آجاتا ہو۔

بلاغت کی ایک دوسری خوبی جیسا کہ بیان کیگئی یہ ہو کہ الفاظ مناسب موقع و محل ہوں یعنی جنگ و جدل کے واقعات بیان کرنے کیلئے شاندار اور پُرشکوہ الفاظ لائے جائیں اور حسن و عشق کی داستان کے لئے نازک اور لطیف الفاظ استعمال کئے جائیں

یہی فرق ہے جسے اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو کلام یا تحریر کا اثر کما حقہ نہیں ہوتا۔ یہ فرق اردو کے دو بڑے انشا پرداز کی تحریروں سے واضح ہو جائیگا۔ علامہ شبلی، ''جنگ قادسیہ'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''سعد نے یہ دیکھکر کہ ہاتھی جس طرف کا رخ کرتے ہیں، دَل کا دَل پھٹ جاتا ہے۔ ضخم و مسلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے، بلاکر پوچھا کہ اس بلائے سیاہ کا کیا علاج ہے، انھوں نے کہا کہ ان کی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر اور گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے۔ ایک ابیض اور دوسرا اجرب کے نام سے مشہور تھا۔ سعد نے قعقاع، عاصم، حمال، ربیل کو بلاکر کہا کہ یہ مہم تمھارے ہاتھ ہے۔ قعقاع نے پہلے کچھ سوار اور پیادے بھیجدیے کہ ہاتھیوں کو نرغہ میں کرلیں پھر خود برچھا ہاتھ میں لیکر پیل سفید کی طرف بڑھے، عاصم بھی ساتھ تھے، دونوں نے ایکساتھ برچھے مارے کہ آنکھوں میں پیوست ہو گئے۔ ہاتھی جھرجھری لیکر پیچھے ہٹا ساتھ ہی قعقاع کی تلوار پڑی اور سونڈ مستک سے الگ ہو گئی۔ ادھر ربیل و حمال نے اجرب پر حملہ کیا وہ زخم کھاکر بھاگا تو تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہوئے اور دم کی دم میں یہ سیاہ بادل بالکل چھٹ گیا اب بہادروں کو حوصلہ افزائی کا موقع ملا اور اس زور کا رَن پڑا کہ نعروں کی گونج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی''۔ (الفاروق، صفحہ ۹)۔

تحریر بالا میں دیکھو کہ مضمون کی مناسبت سے الفاظ کیسے کیسے آئے ہیں مثلاً ''دل کا دل''، ''بلائے سیاہ''، ''مہیب و کوہ پیکر''، ''مہم'' ''سوار و پیادے''، ''نرغہ''، ''سیاہ بادل'' ''رَن''۔ اسی طرح ایک جنگ کے حالات پروفیسر آزاد نے ''دربار اکبری'' میں بیان کئے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

''عصر کا وقت تھا کہ اکبری شفقت کا دریا چڑھا و پر آیا۔ بہت سے بہادر انتخاب کیے کہ کشتیوں پر سوار ہو کر جائیں اور میدان جنگ کی خبر لائیں۔ قلعہ والوں نے دیکھکر اوپر سے

گولے برسانے شروع کئے اور اٹھارہ کشتیاں ان کے روکنے کو بھیجدیں۔ بیچ منجدھار میں ٹکر ہوئی۔ دیکھ گئے تھے کہ بادشاہ بہار دیکھ رہا ہے۔ دریا کے دھوئیں اڑاتے اور آگ برساتے پانی پر سے ہوا کی طرح گزر گئے، حریف دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر بھی چڑھاؤ کی چھاتی توڑ کر جانا کچھ آسان کام نہ تھا اور کمک کو غنیم نے دریا میں روکا ہوا تھا۔ دور ہی سے مقام جنگ کو گولے مارنے شروع کئے۔ ان کے گولوں نے غنیم کی ہمت کا لنگر توڑ دیا اور کشتیاں ہٹانی شروع کیں اب ایک کے ملاح پہلو کاٹ کر چلے۔ اگرچہ قلعہ سے گولے پڑنے شروع ہوئے مگر یہ بھاگا بھاگ ایک موقع کے گھاٹ پر جا پہنچے اور وہاں سے کشتیوں کو چھوڑ کر تیر کی طرح سیدھی معرکہ جنگ پر آئیں۔ بادشاہی فوج کناروں پر اتری ہوئی تھی اور سینہ بسینہ لڑائی ہو رہی تھی۔ افغانی سرداروں نے کوچہ بندی کر کے بھی لڑائی ڈالی مگر تقدیر سے کون لڑ سکے۔ خلاصہ یہ کہ حاجی پور فتح ہوگیا اور بادشاہی فوج قلعے پر قابض ہوگئی" (دربار اکبری صفحہ ۲۴۱، ۲۴۲)۔

اسی کے آگے فتح پٹنہ کا بیان آتا ہے جو اس سے کچھ کم قصہ نما نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد بنگالہ فتح کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور آیندہ کا نقشۂ جنگ مرتب کیا جاتا ہے۔ فن جنگ کے جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کسقدر سنجیدگی طلب اور غور و فکر کا موقع ہوتا ہے لیکن آزاد کا رنگینی پسند قلم یہاں بھی گل و بلبل کی ہمنوائی سے نہیں چوکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"خلوت کے چمن میں حکم ہوا کہ مشورت کی بلبلیں آئیں کہ بنگالہ کے لئے کیا صلاح ہے بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملک مقبوضہ کا بند و بست ہو، جاڑے کی آمد میں بنگالہ پر خونریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائیے۔ بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم کو دم نہ لینے دو۔ اڑ جائیں اور چھری کٹاری ہو جائیں کہ یہی بہار ہے۔ فتح کے گلچیں اور سلطنت کے باغبان نے کہا کہ ہاں یہی ہانک سچی ہے" (صفحہ ۲۴۳)۔

بلاغت کی ایک اور بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ جب ایک ہی معنی کے متعدد

الفاظ ہوں تو اُن میں سے صرف ایسے الفاظ کا انتخاب کر لیا جائے جو معنی کے لحاظ سے وہاں سب سے زیادہ موزوں ہو۔ ورنہ یوں ادائے مطالب کے لئے تو ہر شخص لکھ لیتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطالب کا جو ہجوم ایک لفظ میں ہوتا ہے، وہ سطروں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک اچھے انشا پرداز کا بڑا وصف یہ بھی ہے کہ انتخاب الفاظ کا صحیح مذاق اسمیں موجود ہو۔ علامہ شبلی کی نقد پسند طبیعت اس نکتہ کو خوب سمجھتی تھی۔ چنانچہ وہ ایک موقع پر شیخ سعدی کے سومنات جانے کے واقعہ کو اسطرح پر لکھتے ہیں کہ:۔

"وہ (شیخ سعدی) سومنات آیے، یہاں ایک عظیم الشان تبخانہ تھا۔ پوجاریوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ ایکدن ایک برہمن سے کہا کہ مجھکو سخت حیرت ہے کہ ایک پتھر کو لوگ کیوں پوجتے ہیں، وہ نہایت برہم ہوا اور تمام تبخانہ میں چرچا پھیل گیا۔ سب اُن پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ بت کے ظاہری حسن و خوبی کا میں بھی معترف ہوں لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ معنوی کمال کیا ہے! برہمن نے کہا ہاں یہ پوچھنے کی بات ہے۔ میں نے بھی بہت سفر کئے اور ہزاروں بت دیکھے لیکن جو معجزہ اسمیں ہے کسی میں نہیں، یہ ہر روز صبح کو دعا کے لئے خود ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن شیخ نے یہ شعبدہ خود اپنی انکھوں سے دیکھا۔ شیخ کو نہایت حیرت ہوئی اور اس فکر میں ہوئے کہ اصل راز کیا ہے؟ تقیۃً بت کے ہاتھ چومے اور بہت خشوع و خضوع ظاہر کیا۔ اور تبخانہ میں اس عقیدت کے ساتھ رہنے لگے جیسے پوجاری مندر میں رہا کرتے ہیں" (شعر العجم حصہ۲، صفحہ۴۰)۔

مندرجہ بالا عبارت میں دیکھو کہ جو خاص الفاظ استعمال ہوئے ہیں، انھیں ان کے مرادفات پر کیا وجہ ترجیح ہے۔ "راہ و رسم" کے ہم معنی اردو میں بہت سے الفاظ ہیں مثلاً "ملاقات"، "شناسائی"، "دوستی"، "جان پہچان"۔ لیکن ملنے جلنے کی ابتدا کرنے اور آمد و رفت رکھنے کا جو مفہوم "راہ و رسم" میں پایا جاتا ہے، وہ انمیں سے

کسی میں نہیں ۔ پھر "پتھر" کے ایک لفظ کہدینے سے بت کی شان میں حقارت و مذمت کا جو اظہار ہوتا ہے، اسکے لئے پجاریوں کی برہمی اور ہنگامہ آرائی کافی دلیل ہے۔ اسی مفہوم کو حقارت و مذمت کے لفظ کے ساتھ ایک سطر میں ظاہر کرتے تو اسمیں بلاغت کی وہ شان نہ رہتی۔ آگے چلکر ایک لفظ "معجزہ" کا آیا ہے جو عین اقتضائے حال کے مطابق ہے۔ اس ایک پنج حرفی لفظ میں مذہبی تقدس اور جذبات عقیدت کے جو مفہوم داخل ہیں، ان کو برہمن کی زبان سے ادا کرنے کے لئے اردو میں کوئی دوسرا لفظ ہو نہیں سکتا تھا۔ اسی کے بالمقابل سعدی کی زبان سے بت کے اسی فعل کو "شعبدہ" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ اِن دونو الفاظ میں عقیدت اور عدم عقیدت کا جو فرق پایا جاتا ہے، وہ فن بلاغت کا ایک باریک نکتہ ہے جس کا لحاظ شبلی سا نقاد فن ہی کر سکتا تھا۔ "شعبدہ" کے قریب المعنی الفاظ اور بھی بہت سے تھے مثلاً 'کرشمہ'، 'ماجرا'، 'تماشا' لیکن ان میں سے کسی میں وہ بات نہیں جو شعبدہ کے لفظ میں ہے۔ "چومنا" اور 'بوسہ دینا' ان دونو لفظوں میں بظاہر کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لیکن اول الذکر سے جس عقیدت و خلوص کا اظہار ہوتا ہے، وہ دوسرے سے اُسقدر نہیں بلکہ اس سے ایک حد تک تکلف و تصنع ٹپکتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایک خالص اردو کا مفرد لفظ فارسی کے مرکب لفظ پر بہر صورت مرجح تھا۔ بعینہ یہی فرق "پوجنے" اور 'پرستش کرنے' کے الفاظ میں بھی ہے جس مذہبی عقیدت اور خلوص کو ظاہر کرنے کیلئے اور الفاظ آئے ہیں، اسی غرض کے لئے "خشوع و خضوع" کا استعمال بھی ہے جسکے بغیر لائے ہوئے کسی مذہبی عقیدت و خلوص کے خیال کا اظہار مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

بالکل اسی واقعہ کو مولینا حالی نے بھی اپنی حیات سعدی میں بیان کیا ہے، ذیل میں ان کی عبارت کو پڑھو اور دیکھو کہ کیا انھوں نے بھی بلاغت کی اِن خوبیوں کو ملحوظ رکھا ہے؟ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"جب میں (سعدی) سومنات پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کیلیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھکو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بیجان چیز کی کس لئے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے پہلے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اسقدر فریفتہ ہیں؟ اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کردی۔ سب نے مجھکو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اسکے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی سے نہیں کی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں لیکن چونکہ میں نووارد ہوں اور اسرار نہانی سے واقف نہیں ہوں، اس لئے اسکی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اسکی پوجا کروں۔ اس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو مندر میں رہ تجھکو اصل حقیقت معلوم ہو جائیگی میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنسکر مجھ سے کہا۔ کیوں اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہا؟ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لئے برہمن بنگیا۔" (حیات سعدی صفحہ ۴۲ و ۴۵)

ایک اور طریقہ۔ اقوام یا افراد کی اہلیت اور قابلیت کے اندازہ کرنے کا ایک منصفانہ طریقہ یہ ہی کہ یہ دیکھا جاسے کہ وہ قوم یا اس کے افراد ابھر کر کہاں تک پہونچے؟ اُن کی بلند پروازی کی آخری حد کہاں تک پہنچتی ہی؟ ان کی ترقی کا پارہ زیادہ سے زیادہ کس درجہ پر آتا ہی اور پھر اس کے بعد باہم مقابلہ کر کے دیکھا جائے کہ ان میں کون سب سے آگے ہی؟ اب تک ہم نے انشا پردازی کی تعریف، اسکی غرض اور اسکی دو بڑی خصوصیات

فصاحت و بلاغت مع ان کی جزئیات سے بحث کی ہے اور اُن کے ثبوت میں ہر چار مصنفین کی تحریروں کے نمونے پیش کئے ہیں جس سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ علامہ شبلی کا درجہ ان کے دیگر معاصرین انشا پردازوں میں کسقدر بلند ہے اب ہم اس جدید طریقہ کے مطابق ان مصنفین کی تحریروں کے منتخب اور چیدہ نمونے (جو ان کے اختراع فائقہ (ماسٹر پیس) کہے جاسکتے ہیں) پیش کرتے ہیں اور فیصلہ خود ناظرین کے مذاق ادبی اور انصاف پر چھوڑتے ہیں۔ سب سے پہلے آزاد کو لو' دربار اکبری میں اکبر کے خصایل و عادات بیان کرنے میں انھوں نے اپنے پورے زور قلم سے وہ کام لیا ہے جسکی نظیر ان کی تمام تصانیف میں کہیں دوسری جگہ نہیں ملسکتی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"اسکی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا کبوتر ونیں اڑایا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے۔ اور بڑے ہوئے گھوڑے بھگانے اور باز اڑانے لگے۔ نوجوانی تاج شاہانی لیکر آئی۔ بیرم خاں وزیر صاحب تدبیر ملگیا تھا۔ یہ سیر و شکار' اور شراب و کباب کے مزے لینے لگے لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگان دین سے عتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوع جوانی میں آکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیزگار نمازگزار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے اور نماز کے لئے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالب علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار تھا اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا' سواری شکاری بھی برابر جاری تھی۔ مگر وہ علم کا عاشق علم و حکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کے لئے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک دیوانی فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علما سے شریعت کے

ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ ان کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہی تو آپ کام کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرتا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی، یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم ہوتا تو پہلے امرائے دولت کو جمع کرتا، ہر شخص کی رائے کو بے روک سنتا اور سنا تا اور اتفاق رائے اور صلاح و اصلاح کے ساتھ عمل درآمد کرتا" (دربار اکبری، صفحہ ۱۲۰ و ۱۲۱)

ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تصانیف میں توبۃ النصوح ان کی سب سے بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اور اس میں بھی بالخصوص وہ حصہ جہاں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے بندہ کی توبیخ کی ہے، روز بیان کیلئے مشہور ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"اگر تو ہم کو صمیم قلب سے حاضر و ناظر، سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا، تو گناہ پر تجھکو کیونکر جسارت ہوتی تھی؟ تو بھول کر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا؟ کبھی کھولتے پانی میں تو تو نے ہاتھ نہیں ڈالا؟ کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا؟ مگر تو گناہوں کا نہایت بے باکی سے مرتکب ہوتا تھا۔ ضرور ہے کہ یا تو تجھکو یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتش دوزخ ہے، یا اگر یقین تھا تو تو اسکو دنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ، جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھکو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا، کیا تو نے اسکو ہمیشہ اپنی حسن تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا؟ جو تکلیف تجھکو دنیا میں پہنچی، اگرچہ تو اپنی ہی ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلھاڑی مارا کرتا تھا، مگر کیا تو اسکا الزام ہماری ذات مستجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا۔ اے احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھپر کئے اور تجھ سے اتنا نہ ہوسکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکر بے شمار نعمتیں میں نے تجھ کو عطا فرمائیں مگر تجھ پہ اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پہ تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا، اتنا ہی تو میری مخالفت پر کمر بستہ رہا، جتنی میں

تیری رعایت کرتا رہا، اسیقدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا۔ اس حیات بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہوگیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر لے چلا تھا۔ اس چند روزہ زندگی پر تو اسقدر مغرور تھا کہ دائرہ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا" (توبتہ النصوح، صفحہ ۱۰۱)

مولینا حالی کی تصانیف میں تو اسقدر بلند اور پرزور عبارت ملنی مشکل تھی، البتہ ان کے متفرق مضامین میں "زبان گویا" کے عنوان سے ایک خطیبانہ پرزور مضمون ملگیا ہو جس کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو:۔

"اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری قاصد، اے میری ترجمان! اے میری وکیل، اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہو؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد، نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہو جس کے زہر کی دارو، نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی"

"اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔۔۔۔۔"اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور اے میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا، نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں تو زہر ہے

اور کہیں تریاق" (مضامین حالی، صفحہ ۲۲)

آزاد، نذیر احمد اور حالی کی انشا پردازی کے اختراعات فائقہ (ماسٹر پیسز) آپ نے دیکھ لئے، جو عام طور پر اردو کے انتخابات میں داخل ہیں، اب ایک میری طرف سے شبلی کی انشا پردازی کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو، "ظہور قدسی" کے عنوان سے آنحضرت صلعم کی ولادت کا واقعہ وہ اس طرح لکھتے ہیں :۔

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرۂ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سرو سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

"لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاعہائے گراں ارزشاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔

"آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ زبان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہوگیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنمخانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک

کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔

"یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا، اللّٰھم صلِّ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلّم۔" (سیرۃ النبی حصہ اول، صفحہ ۱۲۳ و ۱۲۴)

(۲)

گزشتہ صفحات میں، جہاں تک سوال کے پہلے جزو کا تعلق تھا، ہم نے انشا پردازی اور اسکی خصوصیات سے کسیقدر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، تاکہ انشا پردازی کا ایک صحیح مفہوم اور معیار قایم ہو جائے۔ اب تک اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز کی تعیین میں جو غلطی ہوتی چلی آئی ہے اُس کا سبب یہی تھا کہ انشا پردازی کا کوئی صاف و صریح مفہوم پیشِ نظر نہیں ہوتا تھا۔ اسی غرض سے ہم نے ان مصنفین کی تحریروں سے مختلف نوعیتوں کے نمونے بھی دیے ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ علامہ شبلی کا درجہ اپنے معاصرین انشا پردازوں میں کسقدر بلند ہے! سوال کا دوسرا جزو اسقدر پیچیدہ اور بحث طلب نہیں ہے۔ کم و بیش ہر شخص سمجھتا ہے کہ اردو کے ذخیرۂ علمی میں سب سے بڑا اور بیش بہا حصہ علامہ شبلی کا ہے، تاہم ان میں سے ہر ایک کی تصانیف پر ایک سرسری نظر ڈال لینے سے اس خیال کی مزید تصدیق ہو جائیگی۔

اردو کا سرمایۂ علمی ہم جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں، اردو ادب (یہاں ادب سے مراد

صرف نثر کا ذخیرہ ہی) کی ترکیب اصلی انہی چار عناصر سے ہی، یعنی آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی، یعنی اردو کا تمامتر ذخیرۂ علمی انھیں چار مصنفین کی کوششوں کا اندوختہ ہی، باقی دوسرے مصنفین ایک حثیت ثانوی رکھتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہی کہ انمیں سے ہر ایک کا کسقدر حصہ ہی اور کس قیمت کا؟ پروفیسر آزاد سے پہلے جنھیں اِن عناصر اربعہ میں اولیت کا فخر حاصل ہی اردو ادب کا سرمایہ بہت ہی مختصر اور معمولی تھا۔ پرانے خیال کے لوگ زیادہ تر فارسی و عربی کی تحصیل اپنی تعلیم کا مقصد سمجھتے تھے، کوئی کچھ لکھنا چاہتا، تو انھی زبانوں میں لکھتا۔ ان میں بھی فارسی کو زیادہ رواج حاصل تھا، کیونکہ پہلے حکومت وقت کی زبان رہ چکی تھی، اس کا رعب اب بھی لوگوں کے دلوں پر باقی تھا۔ علاوہ اس کے اسلامی اور دینی علوم بھی انھیں دونو زبانوں میں تھے۔ اگر کسی نے بڑی ہمت کی تو تھوڑی بہت انگریزی سیکھ لی، کیونکہ بعد میں یہی زبان ذریعہ معاش ہوگئی۔ اردو کی طرف کسی نے اگر بڑی توجہ کی تو چند غزلیں اور قصیدے لکھ لئے یا فارسی و عربی سے بعض افسانے اور قصے ترجمہ کرکے رکھ دیے۔ بعد میں کچھ انگریزی کے ناولوں اور افسانوں کے بھی ترجمے ہوئے۔

تصانیف آزاد غرض یہ کل سرمایہ تھا جو پروفیسر آزاد کو وراثت میں ملا، اسمیں سے بھی شاعری کے جزو کو نکالدیجئے تو یہ ترکہ اور بھی قلیل اور حقیر رہجاتا ہے۔ آزاد نے اردو کی اس بے مائگی کو محسوس کیا اور لٹریچر کی ہر صنف میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہی کہ آج ان کے قلم کی مختلف اصناف ادب میں تحریری یادگاریں باقی ہیں۔ مثلاً ادب میں افسانے، قصے اور ڈرامے ہیں۔ تاریخ میں زبان اور لٹریچر کی تاریخ اور اشخاص کے سوانح زندگی بھی ہیں۔ علوم میں علم الانسنہ ان کا سب سے نمایاں کارنامہ ہے۔

ان کی ایک اہم تصنیف جو شاعرانہ خیال آرائیوں اور ادبی گلکاریوں کی

وجہ سے آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھی جاتی ہے، "نیرنگ خیال" ہے۔ انگریزی زبان میں لٹریچر کی ایک صنف "مائی تھالوجی" ہے جسمیں انسانی جذبات اور مذہبی معتقدات مشخص طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ انسان کا تخئیل اشکال و صور کو جلد گرفت کر سکتا ہے مثلاً غصہ اور رحم کو ان کے خصایص طبعی کی بنا پر ویسی ہی انسانی شکلوں میں پیش کیا جائے تو پڑھنے والے پر اس کا صحیح اور زیادہ اثر پڑتا ہے۔ انگریزی میں اسی طرز بیان میں ایک مشہور کتاب "ترقیِ زایر" (پلگرمس پروگرس) کے نام سے ہے جسمیں عیسوی مذہب کے عقاید اور محاسن اخلاق کو مادی صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انجیل کے بعد جس کتاب نے مسیحیت کے قبول کرنے کی سب سے زیادہ ترغیب لوگوں کے دلوں میں پیدا کی، وہ یہ "ترقی زائر" ہے۔ اس کتاب کے مقبول عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ۸۴ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اسی طرز بیان کو سامنے رکھکر آزاد نے بھی "نیرنگ خیال" لکھی ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ "یہ چند مضمون جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے ہیں ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اسے لکھ دیا" غرض اصل کتاب میں انسان کے اوصاف و خصایل، اس کے جذبات خواہ نیک ہوں یا بد، مشخص طور پر دکھائے گئے ہیں۔ مثلاً سچ، عدل، رحم، شہرت طلبی، غصہ، خود پسندی وغیرہ اپنی اپنی خصوصیات کے مطابق مرد یا عورت کی شکل میں ظاہر کیگئی ہیں۔ اخیر میں عرب، ایران و ہندوستان کے مشہور و معروف شعرا و سلاطین کی بھی جیتی جاگتی تصویریں الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کی گئی ہیں۔ لیکن باوجود ان سب کے "نیرنگ خیال" کو وہ قبول عام کہاں حاصل ہوا جو "ترقی نامہ" کو ہوئی! پروفیسر آزاد کی تاریخی تصانیف میں "دربار اکبری" سب سے مشہور کتاب ہے۔ اس میں اکبر اور اس کے دربار کے بڑے بڑے امرا مثلاً بیرم خاں

بیربل، فیضی، ابوالفضل، ٹوڈرمل وغیرہ کے حالات درج ہیں۔ اردو زبان میں اکبری عہد حکومت کے واقعات اس قدر تفصیل کے ساتھ ملنے مشکل ہیں۔ جہاں تک وقایع نگاری کا تعلق ہے یہ کتاب چھوٹے بڑے تمام واقعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن واقعہ نگاری اور تاریخ نویسی میں بہت بڑا فرق ہے۔ جو اس تصنیف میں صاف نظر آتا ہے۔ اکبر اور اس کا عہد حکومت اس کے امرا اور رعایا میں کچھ ایسا مقبول ہا ہو کہ اس کے متعلق بہت سے مصنوعی مبالغہ آمیز قصوں کا رواج پا جانا کچھ بھی خلاف امید نہیں۔ اکبر کی حکمت عملی (پالیسی) ایسی مرنجاں ومرنج کی رہی ہے اور دیگر مذاہب کے ساتھ اس کا ایسا بے تعصبانہ اور روادارانہ رویہ رہا ہے، جو سترہویں صدی عیسوی میں ایک حیرت انگیز واقعہ ہو، بالخصوص ہندو مسلمانوں کے ساتھ اس کا یکساں مساویانہ سلوک اس زمانہ میں ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہو لیکن اسی کے ساتھ خود اس کے اسلام میں شبہ کرنا بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں۔ یہ چند مہتم بالشان امور تھے جو بہت زیادہ نقد وبحث کے قابل تھے اور جسکے محض ضمنی تذکرہ کر دینے سے اکبر کا سوانح نگار کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ علاوہ اس کے عہد اکبری کی بعض زراعتی واقتصادی اصلاحات بھی جن پر ہمارا موجودہ نظام زراعتی بہت حد تک مبنی بتایا جاتا ہو کسی طرح نظر انداز کر دینے کے قابل نہ تھیں۔ اکبر کے زمانہ حکومت میں بعض علوم وادب مثلاً ہیئت ونجوم اور فارسی شاعری کی ترقی اور اکثر فنون لطیفہ مثلاً مصوری نقاشی وموسیقی وغیرہ کی رفتار بھی بہ تفصیل ذکر کئے جانے کے لائق تھیں۔ تاریخ کا اقتضا یہ تھا کہ دیگر سلاطین مغلیہ سے جو بعد میں تخت دہلی پر بیٹھے اور غیر ملکی معاصر حکمرانوں سے (مثلاً ملکہ الزبتھ جو تقریباً اسی زمانہ میں انگلستان پر حکومت کرتی تھی) اکبر اور اسکی طرز حکومت کا مقابلہ وموازنہ کیا جاتا، تو آج دربار اکبری تاریخی حیثیت سے نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ایک بلند پایہ تصنیف سمجھی جاتی۔

اشخاص کی تاریخ لکھنے کے علاوہ پروفیسر آزاد نے زبانوں کی تاریخ بھی لکھی ہے اور نہ صرف تاریخ بلکہ ایک حد تک فلسفۂ زبان کی طرف بھی توجہ کی ہے یعنی ایک زبان کا دوسری زبانوں سے تعلق اور الفاظ کی اصل اور معنی کے تغیرات کے اسباب سے بھی بحث کی ہے ۔ یہی علم آج مدوّن صورت میں علم الالسنہ یا انگریزی میں "فیلالوجی" کے نام سے موسوم ہے ۔ اس کا شوق انھیں اہل یورپ کی غیر زبانوں میں تحقیق و تفتیش کو دیکھکر پیدا ہوا ۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے فارسی زبان کی تاریخ و تحقیق کی طرف توجہ کی ۔ اور اس کے لئے ایران اور بخارا وغیرہ کی دشوار گزار مسافت بھی اختیار کی ۔ ان ممالک میں جاکر انھوں نے وہاں کے رسم و رواج لوگوں کے عادات و اطوار کا مطالعہ کیا ۔ نیز ژند، پہلوی اور دری زبانوں کے متعلق بھی بہت کچھ معلومات حاصل کئے ۔ ہندوستان رہکر سنسکرت زبان اور یہاں کے رسوم و عادات سے کم و بیش واقفیت حاصل کی غرض ان کی اس علمی و لسانی تحقیق و کاوش کا اصل مظہر "سخندان فارس" ہے ۔ جس میں زبان فارسی کی تاریخ اور اسکی عہد بعہد کی ترقیوں سے بحث کی گئی ہے ۔ علاوہ اس کے مشہور شعرا و مصنفین کے کلام کے نمونے بھی دکھایے گئے ہیں، ایرانیوں کے رسوم و رواج کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ اسی سلسلہ کی دوسری کتاب "نگارستان فارس" ہے جسمیں رودکی سے لیکر واقف بٹالوی تک کے مشاہیر شعرا کی سوانحعمریاں درج ہیں ۔ یہ سب کچھ سہی لیکن زمانہ کی تیز رفتاری کا ساتھ کون دیسکے ؟ پروفیسر آزاد نے جہاں زبانوں کی تقسیم و تفریق کی ہے وہ علم السنہ کی موجودہ ترقیوں کے لحاظ سے ایک ابتدائی معلومات کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ۔ علاوہ اس کے یہ علم چونکہ واقعات نہیں بلکہ زیادہ تر قیاسات عقلی پر مبنی ہے اس لئے اس کے نظریے دن بدن بدلتے رہتے ہیں ۔ اس بنا پر آج سے ۴۰، ۵۰ برس پہلے کا کوئی نظریہ کیونکر قابل قبول ہو سکتا ہے ۔ یوں الفاظ کی

باہمی مشابہت و مناسبت بتاتی خواہ صوری ہو یا معنوی، ایک دلچسپ مشغلہ ہی اور پر لطف مطالعہ بھی۔ اس نوعیت کی ایک دوسری تصنیف "آبحیات" ہے جو مصنف کی انشا پردازی، تاریخی و لسانی تحقیق، اور ادبی خصوصیت کا مجموعہ سمجھی جاتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اسکی عہد بہ عہد کی ترقیوں پر اردو میں اس سے پیشتر کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہ تھی۔ اسی سلسلہ میں آزاد کا ترتیب دیا ہوا "دیوان ذوق" بھی آجاتا ہے۔ گو ذوق کے حالات اور ان کی شاعری کا تذکرہ "آب حیات" میں بھی آچکا ہے لیکن استاد ہونیکی حیثیت سے آزاد کو جو عقیدت ان کے ساتھ تھی وہ ایک مستقل تصنیف کی متقاضی ہوئی۔ لیکن ان تمام تنقیدی تصانیف میں بجائے اس کے کہ کہیں فلسفۂ شاعری اور اس کی خصوصیات سے بحث کیجاتی، صرف نمونۂ کلام اور شاعری کی تدریجی ترقی کے دکھانے پر اکتفا کیا گیا۔ کم ازکم دیوان ذوق ہی میں اس ضرورت کو ملحوظ رکھا جاتا اور ذوق و غالب کی شاعری کا تفصیل کے ساتھ باہم مقابلہ و موازنہ کیا جاتا اور ہر دو کی خصوصیات شاعری بیان کرکے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیجاتی تو آج اردو لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ لیکن ذوق کی بعض غیر مطبوعہ غزلوں کو شایع کر دینا کافی سمجھا گیا جو کسی طرح ہماری امیدوں کے مطابق نہیں۔

غرض باوجود ان سب کے پروفیسر محمد حسین آزاد نے اردو نثر کے دامن کو جسمیں اب تک قصے و حکایات کے سوا کچھ نہ تھا، تاریخ و ادب کے جواہر ریزوں سے بھر دیا اور سچ پوچھئے تو اردو لٹریچر کا سنگ بنیاد انہی نے رکھا اور اس حیثیت سے انھیں ادب اردو کا بانی کہا جائے تو بیجا نہیں۔

تصانیف نذیر احمد — ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تصنیفات پر نظر ڈالنے سے ایک عجیب اجتماع ضدین نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو اُن کے ناولوں اور افسانوں کا مجموعہ ہے،

دوسری طرف ان کی مذہبی سنجیدہ تصانیف ہیں ۔ اصل یہ ہو کہ اعلیٰ درجہ کی
عربی قابلیت اور قرآن، حدیث وفقہ پر عبور کلی ہونے کا اقتضا تو یہ تھا کہ ان کے
قلم سے انہی مذہبی علوم پر کتابیں نکلتیں لیکن بعض خارجی اثرات کی کشش نے انھیں
اس جادۂ مستقیم سے ہٹادیا اور ناولوں اور قصوں کی یہ طویل فہرست جو ان کے
مصنفات میں نظر آتی ہے، اسی بے راہ روی کا نتیجہ ہے ۔ ان کے تصنیفی شغلہ کا
آغاز ایک عجیب طرح سے ہوا جو خود انہی کی زبان سے سننے کے قابل ہے ۔ اپنے
"دربار ی لیکچر" میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں
چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں ۔ ڈھونڈھا، تلاش کیا، کہیں پتہ نہ لگا ۔
ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال آپ کتابیں بنانی شروع کیں ۔ بڑی لڑکی کیلئے
"مراۃ العروس" چھوٹی کے لئے "منتخب الحکایات" بشیر کے لئے "چند پند" ۔
یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں تب پڑھانی شروع کیں ۔ نہیں بلکہ ہر ایک کتاب کے
چار چار پانچ پانچ صفحے لکھکر ہر ایک کے حوالے کردیے ۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں
کہ جسکو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لئے اور جسکو ایک صفحے کی
استعداد تھی وہ ورق کے لئے مستعجل تھا ۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی، کہ میرا
سبق کم رہ گیا ہے ۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھد یا کرتا ۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان
پورا ہوا" لیکن ان قلمی مسودات کو کتابی صورت میں لانے کا ڈپٹی صاحب کو کوئی
خیال بھی نہ تھا ۔ انھوں نے تو یہ قصے اور افسانے اپنے بچوں کی خانگی تعلیم کی غرض سے لکھے تھے
انھیں کیا معلوم تھا کہ آیندہ نسلیں ان قصے کہانیوں کو میری تصنیفات کی سرفہرست قرار دینگی
بہرحال ان قلمی مسودات کا مطبوعہ صورت میں آنے کا واقعہ پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ ہے ۔
وہ لکھتے ہیں کہ ایکدن انکے چھوٹے لڑکے بشیر کی کہین صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم سے اتفاقیہ
ملاقات ہوگئی ڈاکٹر صاحب نے بشیر سے پوچھا کہ آجکل تم کیا پڑھتے ہو؟ بشیر نے جو ان کتابوں کا نام لیا تو صاحب نے

تعجب سے کہا کہ ان ناموں کی کتابیں کوئی اردو میں نہیں ہیں ۔ اس پر بشیر نے جواب دیا کہ یہ کتابیں تو ابا نے میرے اور آپ کے لئے لکھدی ہیں ۔ پھر کپتان صاحب نے کہا کہ اچھا دوڑ کر انھیں لے آؤ ۔ بشیر دوڑا ہوا گھر گیا اور چند بند، مراۃ العروس اور منتخب الحکایات کے قلمی نسخے اٹھا لایا ۔ ڈائرکٹر صاحب نے جب انھیں دیکھا تو مراۃ العروس کو بہت پسند فرمایا اور گورنمنٹ سے اس پر انعام دیے جانے کی سفارش کی ۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب کو اس کتاب پر ایکہزار روپیہ نقد اور ایک قیمتی ٹائم پیس انعام میں ملا ۔ اس سے بڑھکر یہ کہ ان کا نام گورنمنٹ گزٹ میں نکل گیا ۔ پھر کیا تھا بقول خود انھوں نے وہ تصنیف کا ڈربہ کھولدیا ۔ ۔ ۔ ۔ مراۃ العروس کے بعد بینڈ فورڈ کی طرح ایک ناول "بنات النعش" لڑکیوں کے لئے لکھا اور اسکو بھی بطمع انعام سرکار میں چلتا کیا ۔"

غرض ڈپٹی صاحب کے تصانیف کی ابتدا اپنے بچے بچیوں کی خانگی تعلیم دینے کے خیال سے ہوئی، اور سرکاری انعامات نے انہیں ان کی مزید ہمت افزائی کی ۔ ان کی تمام ابتدائی تصانیف میں ان دونوں میں سے کسی نہ کسی ایک جذبہ کی کار فرمائی ہوتی تھی ۔ چنانچہ انھوں نے صرف ونحو میں دو رسالے اپنے لڑکے کے لئے لکھے جن کا نام مَا یَغْنِیْکَ فی الصرف اور مَا یُغْنِیْکَ فِي النَّحْوِ رکھا ۔ ان رسالوں میں انھوں نے قدیم طریقۂ درس کے خلاف کیسقدر جدت سے کام لیا تھا جسے بد قسمتی سے اس زمانہ کے صرفی ونحوی مولویوں نے پسند نہ کیا اور اس پر انھیں کچھ انعام بھی نہ ملا ۔ اس کے بعد انھوں نے سرکاری اعلان پر منطق میں ایک رسالہ "مبادی الحکمۃ" لکھا جو مقبول ہوا اور پانسو انعام کا مستحق قرار پایا ۔ اسی زمانہ میں گورنمنٹ کی طرف سے علم ہیئت کی ایک انگریزی کتاب "گولمنز ہون" کے ترجمہ کا اشتہار مع ایکہزار انعام کے شایع ہوا تھا ۔ ڈپٹی صاحب کے بعض دوستوں نے انھیں اس کام پر آمادہ کیا

چنانچہ بڑے اصرار کے بعد انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور پورا کرکے گورنمنٹ ہند کو بھیجدیا۔ ایک عرصہ کی ردوکد کے بعد سرکار سے وہ ترجمہ مع ایکہزار انعام کے واپس ملا۔ (نہ جانے اس کے طبع ہونے کی بھی نوبت آئی یا نہیں۔) ان متفرق چھوٹی چھوٹی تصنیفات کے علاوہ ڈپٹی صاحب کے قلم سے سرکاری روئداد وں وغیرہ کے ترجمے بھی وقتاً فوقتاً نکلتے رہے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہو کہ تعذیرات ہند کے اردو ترجمہ میں بھی ڈپٹی صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ڈپٹی صاحب کے تصنیفی مشغلہ کی ابتدا خواہ کسی طرح پر ہوئی ہو لیکن افسانہ نویسی ان کا طبعزاد رنگ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے تمام ناولوں میں "توبۃ النصوح" کو غالباً سب سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے اقتباسات نہ صرف سرکاری مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں بلکہ پوری کتاب نووارد انگریزی حکام کے نصاب میں داخل ہے۔ ہر انگریز مبتدی کے لئے جو اردو سیکھنا چاہتا ہے اس کتاب کا پڑھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ قصے میں چونکہ صوم وصلوۃ کی تاکید، خیرات وزکوٰۃ کی ہدایت اور دیگر اسلامی عقاید مثلاً جنت ودوزخ جزا وسزا وغیرہ کا ذکر ہے اس بنا پر شروع شروع میں گورنمنٹ نے اپنی مذہبی غیر جانبدارانہ پالیسی کے منافی سمجھکر اسے رواج دینا مناسب نہ سمجھا تھا لیکن پھر بعد میں کوئی خاص نقصان نہ دیکھکر اسکی اشاعت کی اجازت دیدی اور اسکی وہ قدر افزائی کی کہ مسلم غیر مسلم ہر طبقہ سے اسکی مانگ آنی شروع ہوگئی۔ "ترقی نزایر" (پلگرمس پروگرس) جس کا "نیرنگ خیال" کے سلسلہ میں اوپر ذکر ہو چکا ہو، عام مضمون کے لحاظ سے "توبۃ النصوح" سے ایک حد تک بہت ملتی جلتی ہو لیکن اس میں اسلام کے ان بنیادی اور عالمگیر عقاید ومسایل کی تصریح کرنیکی کوئی کوشش نہیں کیگئی ہے جس سے یہ کتاب بے تعصب غیر مسلموں کے دلوں کو اپیل کر سکتی۔ ممکن ہو ایک محدود طبقہ میں اصلاح اخلاق اور پابندی مذہب میں

کسی حد تک ممد ثابت ہوئی ہو۔

"مراۃ العروس" جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ڈپٹی صاحب نے اپنی بڑی لڑکی کے پڑھانے کے لئے لکھنا شروع کیا تھا لیکن در اصل اسکی تہ میں ایک اور مقصد نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سلطنت مغلیہ کے چراغ گل ہو جانے سے کتنے اسلامی گھرانے بےچراغ ہو رہے تھے۔ باہر کی حالت تو جیسی کچھ تھی، ظاہر تھی، گھر کے اندر اس سے بھی بدتر کیفیت تھی۔ عورتوں میں نہ کوئی تعلیم و تربیت، نہ کچھ مذہبی و اخلاقی روح اور نہ زندگی کے کوئی آثار نظر آتے تھے۔ لے دے کے کچھ پرانے رسم و رواج باقی رہ گئے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ بچہ کی تعلیم و تربیت کی پہلی معلم ماں ہے، اس کا پہلا مکتب گھر کی چہار دیواری ہے اس لئے مردوں کی تعلیم و تربیت سے مقدم اور ضروری عورتوں کی اصلاح و تربیت ہے چنانچہ اس غرض کے لئے انھوں نے متعدد قصے اور افسانے لکھے تاکہ انھیں پڑھکر عورتیں اپنی حالت سدھاریں اور ان کی گودوں سے اچھے تربیت یافتہ بچے نکلیں۔ غرض عورتوں کے عادات و اطوار، ان کی معاشرتی اور مذہبی خرابیوں اور ان کی جاہلانہ رسوم و رواج کا جس عبرت انگیز طریقہ میں اس میں ذکر ہے، اس کے لحاظ سے یہ کتاب معناً بھی 'مراۃ عروس' ہے جسے پڑھکر عورتیں اپنی اخلاقی و مذہبی حالت درست کر سکتی ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ "بنات النعش" کے نام سے موسوم ہے جسمیں علمی معلومات حاصل کرنے کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی گئی ہے۔ "مراۃ العروس" کو تھوڑے ہی عرصہ میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ انگریزی، بنگالی، گجراتی، بھاشا، پنجابی اور کشمیری زبانوں میں اس کے ترجمے ہو گئے۔ اس سلسلے کی سب سے آخری کتاب غالباً "رویائے صادقہ" ہے جو بعض کے نزدیک ان کا سب سے بہتر ناول خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں دہلی کی معاشرتی زندگی کا بہت ہی پر اثر نقشہ کھینچا گیا ہے،

لیکن ڈپٹی صاحب کی آخری قلمی یادگاریں کچھ دوسری نوعیت رکھتی ہیں اور وہی اُن کا اصلی اور فطری رنگ معلوم ہوتا ہے جو اخیر زمانہ عمر میں صاف طور پر نمایاں ہو کر رہا۔ اس سے ہماری مراد مذہبی رنگ ہے۔ حیدر آباد کے سکون بخش زمانہ ملازمت میں ڈپٹی صاحب جب سرکارِ انگریزی کے بارِ احسان سے کسیقدر سبکدوش ہوئے اور حکومت کی برکات سے کنارہ کش ہو کر اطمینان و عافیت کی زندگی بسر کرنے لگے تو اسوقت انھیں خدا یاد آیا۔ عربی زبان و ادب کا ذوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ کلام جاہلیت کے سیکڑوں ہزاروں اشعار اور نثر میں صفحے کے صفحے زبانی یاد تھے۔ اسی ذوق ادبی کی بنا پر قرآن کا بھی بہت حصہ یاد کر لیا تھا چنانچہ بعد میں صرف چھ مہینے کی محنت سے پورے حافظ ہو گئے۔ کلام مجید سے ایک تو ذاتی شغف اور دوسرے احباب کا ایک بامحاورہ ترجمہ کا اصرار، یہ اسباب تھے جنھوں نے ڈپٹی صاحب کو اس خدمتِ دین پر آمادہ کیا۔ ہر چند کہ کلام الٰہی کا رعب اس جرأت کی اجازت نہ دیتا تھا لیکن آخر کار کمر بستہ ہو گئے اور تین سال کی مدت میں اس کام کو انجام دیا جو آج "مصحف القرآن" کی شکل میں ہر مسلمان کے ہاتھ میں نظر آتا ہے اور جو عرف عام میں "ڈپٹی صاحب کے قرآن" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کے ترجمے اس سے پیشتر بھی ہو چکے تھے لیکن وہ یا تو فارسی میں تھے یا تحت اللفظ اردو میں۔ ڈپٹی صاحب جو فن ترجمہ سے خوب واقف تھے، تمام دشواریوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ فارسی ترجمہ ملک کی عام ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا اور نہ تحتِ لفظی کا طریقہ مطالب قرآنی کے سمجھنے میں مفید ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر عام فائدہ رسانی کی غرض سے انھوں نے قرآن کا بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا اور ربط مطلب کے لئے قوسین میں اپنی طرف سے عبارتیں بڑھاتے گئے ہیں۔ شروع میں ہر مضمون کے آیات کی فہرست بھی دیدی ہے تاکہ کسی خاص

عنوان پر قرآن حکیم سے مواد تلاش کرنا ہو تو آسانی سے فراہم کیا جا سکے۔ غرض مسلمان جو ایک عرصہ سے زندگی کے اس دستور العمل سے ناآشنا ہو گئے تھے، ڈپٹی صاحب نے انھیں اس سے روشناس کرا کر ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈپٹی صاحب نے مسلمانوں کی عام حالت خراب دیکھ کر ترجمہ قرآن ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ان کے معمولات زندگی اور عبادات مذہبی کی اصلاح و درستگی کے لئے انھوں نے ایک مبسوط کتاب لکھی جو "الحقوق والفرائض" کے نام سے تین جلدوں میں ہے جس کی مجموعی ضخامت ایک ہزار صفحوں سے کچھ اوپر ہے۔ اس کتاب میں تفصیل یہ بتایا گیا ہے کہ 'حقوق اللہ' اور 'حقوق العباد' کیا کیا ہیں؟ کتاب کے پہلے حصہ میں تمام عبادات مع جزئیات کے آجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حج کے بیان میں مسجد حرم کے منارے اور کنگروں کی تعداد اور مسجد کا طول و عرض بھی دیا ہوا ہے۔ دوسرے حصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے تعلقات والدین، استاد، ہمسایہ اور حکومت وغیرہ کے ساتھ کیسے ہونے چاہئیں۔ جہاں حکومت کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات سے بحث کیگئی ہے، آج ان کا مطالعہ کرنا دلچسپی اور حیرت سے خالی نہیں۔ اطاعت حکام کے لئے جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں، انہیں سنکر ابتدائی جماعت کا ایک بچہ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لیکن ڈپٹی صاحب کی عربی زبان و ادب کی بے نظیر قابلیت کا صحیح اور کافی استعمال یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ایک قرآن کے ترجمہ پر اکتفا کیا یا احادیث و فقہ کے مطالب کو پھیلا کر اردو میں لکھ دیا۔ ترجمے ان سے پہلے بھی ہوئے اور بعد میں ہوتے۔ حدیث و فقہ کے مسایل کی تعلیم و تلقین کے لئے عربی مدارس کے اساتذہ و طلبہ کافی تھے۔ عربی کے اس فاضل سے جو کم سے کم توقع تھی وہ یہ کہ آزاد کی طرح عربی زبان و ادب کی ایک تاریخ ہی

"سخنداں عرب" کے نام سے تیار کردے گا اور یہ ان کی بے مثال عربی دانی کا صحیح و بہترین استعمال ہوتا۔ ایک ایسی تصنیف کی کمی اردو زبان میں عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی اور مستقبل قریب میں بھی اس کے پورا ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

تصنیفات حالی

اردو میں جس مخصوص شعبۂ علم کی ترقی مولانا حالی کی ذات سے ہوئی ہے، وہ "فن سوانح نگاری" ہے۔ حالاتِ زندگی اس سے پہلے بھی اردو میں لکھے جاتے تھے لیکن مولانا نے اس فن میں ترتیبِ واقعات کا جو طریقہ اور ان کے انداز بیان کا جو نمونہ پیش کیا ہے، وہ نہ صرف ان کی علمی زندگی کا سب سے درخشاں کارنامہ ہے بلکہ اردو میں ایک بیش بہا اضافہ بھی ہے۔ قدما کے نزدیک سوانح نگاری کا دستور اب تک یہ رہا ہے کہ وہ جو حالات زندگی لکھتے تھے، وہ تصویر کا ایک رخ ہوتا تھا یعنی اس کے تمام تر محاسن اور خوبیاں ہی بیان کرتے تھے۔ اسکی زندگی کے کارناموں اور اس کے حالات پر کوئی تنقیدی نظر نہ ڈالتے تھے۔ برعکس اس کے یورپ کی سوانح نگاری کا یہ طریقہ ہے کہ ہیرو کے اوصاف حمیدہ اور اس کے کارنامے گناتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ کہیں کہیں اسکی لغزشوں اور کمزوریوں کی طرف بھی دبی زبان سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ اگر ان کی نیت پر بے جا شبہ کرنے کا الزام نہ دیا جائے تو یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس سے ایک طرف ان کا مقصود اپنی نمائشی بے تعصبی و حق گوئی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری جانب یہ اپنے ہیرو کی عظمت اور بزرگی جتانے کا ایک دوسرا طریقہ ہے۔ بارگاہِ اخلاق سے پہلا گروہ اگر پاسداری اور بیجا حمیت کا مرتکب کہلائے گا تو دوسرا طبقہ "ریا"، فریب اور خدع کا مجرم قرار پائے گا۔ مولانا حالی پر جو "مناقب گوئی اور بے جا مداحی" کا الزام لگایا جاتا ہے، اس کے لئے وہ معذور تھے

یہ دو نو طریقے اُن کے پیش نظر تھے جنمیں سے انھوں نے اول الذکر کا انتخاب کیا۔ یہ گویا دو برائیوں کے درمیان انتخاب تھا اور حالی نے اگر اُسے پسند کیا جو کم بری تھی تو کیا بے جا کیا۔

مولانا حالی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ "حیات جاوید" سمجھا جاتا ہے بے جا حمیت اور پاسداری کا جو الزام اُن پر عاید ہوتا ہے، وہ اسی تصنیف کی بنا پر لیکن کوئی شخص بھی جو سرسید کی جگہ پر ہوتا اور حالی جیسا رفیق اسے ملتا تو وہی واقعہ پیش آتا جو "حیات جاوید" کی شکل میں نمودار ہوا تقریبًا ایسی ہی ایک مثال ہم کو انگریزی لٹریچر میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے جو انگلستان کا بہت ہی لایق اور عالی دماغ شخص گزرا ہے، جب انتقال کیا تو اس کے ایک دوست جیمز باسول نے اسکی لایف ۴ جلدوں میں لکھی جسمیں اس کی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی نہایت تحسین آمیز لہجہ میں۔ مولینا حالی نے بھی سرسید کے ساتھ وہی حق رفاقت ادا کیا، جو باسول نے جانسن کے ساتھ کیا تھا۔ قطع نظر اس الزام کے کہ اس تصنیف میں بیجا مدح سرائی اور پاسداری سے کام لیا گیا ہے، دو خصوصیات بہت ہی نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ سرسید کی زندگی کے مشہور و غیر مشہور، ضروری و غیر ضروری، دلچسپ و غیر دلچسپ ہر قسم کے واقعات کا مصنف نے استقصا کیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ پوری کتاب شروع سے اخیر تک ایک اعتذار (اپالوجی) کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے۔ سرسید مرحوم اپنے وقت کے ایک غیر معمولی شخص تھے۔ ایسے زمانہ میں جبکہ ہر شخص زبان حال سے نفسی نفسی کر رہا تھا، اس شخص نے قوم کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں پر زوالِ حکومت کا خمار طاری تھا اور اس حالت میں وہ تعلیم و معاشرت، مذہب و سیاست سب کچھ بھلا بیٹھے تھے۔ سرسید نے ان

کو اس خواب گراں سے جگانا چاہا لیکن اس کوشش میں سب سے بڑا ظلم جو انھوں نے کیا وہ یہ کہ مذہب کو ہاتھ لگایا۔ مذہب مسلمانوں کو جان و مال ہر چیز سے زیادہ ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ انھوں نے اس پر جب کبھی آنچ آتے دیکھی تو چراغ پا ہو گئے۔ عربی داں مولویوں نے جب مداخلت کرتے دیکھا تو ان پر کفر کے فتوے لگانے شروع کئے۔
دوسری طرف اسی زمانہ میں برادران وطن حکومت سے اپنے سیاسی و ملکی حقوق حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور اس کے مطالبہ کے لئے تمام ہندوستان کی ایک قومی جماعت کانگریس کے نام سے قایم کر لی تھی۔ اور مسلمانوں کو بھی اس میں شرکت کرنیکی دعوت دی۔ سرسید نے یہ دیکھکر کہ مسلمانوں کی جماعت تعلیم میں اپنے برادران وطن سے بہت پیچھے ہے اور تا وقتیکہ وہ اس کمی کو پورا نہ کرلے، وہ انکا ساتھ جیسا کہ چاہیئے، نہیں دیسکتی۔ اس بنا پر انھوں نے کانگریس کی شرکت سے انکو علحدہ رکھنا چاہا۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مسایل تھے جنمیں سرسید نے عام روش سے جدا اپنی راہ اختیار کی تھی۔ جن کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہبی فرقہ ان پر 'نیچریت' کا الزام لگاتا ہے اور ان کی تکفیر کے درپے ہے۔ پرانے خیال کا طبقہ انگریزی اور جدید علوم کے رواج دینے پر ناراض۔ برادران وطن ان کی مسلم نواز پالیسی سے نالاں اور ان کو سرکار پرستی اور ہندو مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کے اتہامات لگاتا ہے۔ غرض جو شخص اپنے اور بیگانوں دونو میں اس طرح معتوب و مطعون سمجھا جایئے، اس کے سوانح نگار کا لب و لہجہ اعتذار آمیز نہ ہو تو کیا ہو سکتا ہے۔ اور رفع الزامات اور برارت کی یہی کوشش تھی جسکی بنا پر مولینا حالی نے سرسید کے متعلق چھوٹے بڑے ہر واقعہ کو جگہ دی اور ان کے ہر قول و فعل کو مستحسن اور قابل داد سمجھا۔
'لائف' لکھنے میں خواہ قدیم طریقہ اختیار کیا جائے یا جدید۔ لیکن

اتنا ضرور ہے کہ مصنف ہیرو کے انتخاب کرنے اور اس کے سوانح زندگی لکھنے میں کوئی نہ کوئی متعین مقصد پیش نظر رکھتا ہے۔ مثلاً تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس مقصود ہے تو کسی بڑے پیغمبر یا ہادی کی سوانحمری لکھے گا۔ علمی تحقیق و تفتیش کا شوق پیدا کرنا منظور ہے تو کسی ایسے شخص کے حالات زندگی بیان کرے گا جس نے اپنی تمام عمر جستجوئے علم اور تحقیقِ مسایل میں صرف کردی ہے۔ یا سوانح نگاری کی دوسری صورت یہ ہے کہ مصنف اپنے ہیرو کے عام حالات زندگی بیان کرنے کے بعد اس کا سب سے نمایاں وصف اجاگر کرکے دکھایے۔ مثلاً نپولین کی لایف لکھنی ہے تو اس کے دیگر واقعات زندگی کو معمولی طور پر بیان کرنے کے بعد مصنف کا فرض ہے کہ اس کے جنگی کارنامے اور دلیری وبہادری کے واقعات کو تفصیل کے ساتھ دکھایے۔ یا مثلاً نیوٹن کی سوانحمری میں ریاضی کے متعلق تحقیقات مسایل اور اس کے دوسرے علمی اور سائیٹفک نظریات کا ذکر تصنیف کا غالب جزو ہونا چاہیئے غرض یہ دو نو اصول ہیں جن میں سے ایک نہ ایک کا پابند ہونا سوانح نگار کے لیے ضروری ہے چنانچہ انھیں مبادیات کی روشنی میں مولینا حالی کی طرز سوانح نگاری اور ان کی تصنیف کردہ سوانحمریوں کو دیکھو۔ "حیات جاوید" کی تصنیف میں تو معلوم ہوچکا کہ ان مبادیات سے قطع نظر ذاتی و شخصی تعلقات کا وہ جذبہ کام کررہا تھا جس نے باسول کو جانسن کی لایف لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ باقی رہیں دو تصانیف یعنی "یادگار غالب" اور "حیات سعدی"۔ ان میں مصنف کا کوئی خاص مقصد صراحت طور پر نہیں ظاہر ہوتا ہے بلکہ مولینا کا ذوق ادبی ہندوستان و ایران کے ان دو بڑے شعرا کے حالات زندگی لکھنے کا متقاضی ہوا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالب کی زندگی ہندوستان کے نوجوانوں کے لیے کوئی سبق رکھتی ہے یا مرزا کے خانگی حالات اور احباب کے تعلقات کا ذکر حیات انسانی مین کسی نئے باب

کا اضافہ کرتے ہیں، بلکہ جس چیز نے غالب کو غالب کیا، وہ ان کی بے مثل فلسفیانہ شاعری ہے۔ ایسی صورت میں "یادگارِ غالب" کے مصنف کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ مرزا کی شاعری کے مختلف دَور، ان کے معاصرین میں ان کا درجہ، شاعری کے مختلف اصناف میں اُن کے کمالات پیش کئے جاتے۔ لیکن اس سے قطع نظر کر کے مرزا کے حالاتِ زندگی، اخلاق و عادات، لطائف و امثال پر تصنیف کا بیشتر حصہ وقف کیا گیا ہے۔ البتہ اخیر میں کسی قدر اردو و فارسی نظم و نثر کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری چند صفحوں میں مرزا کی فارسی نثر کا مقابلہ ظہوری، علی حزیں اور ابو الفضل کی نثر سے کیا گیا ہے۔ اس کے لئے مصنف کی طرف سے یہ معذرت تاکہ "یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گزار تھا اسی قدر پبلک کے لئے خاصکر اس زمانہ میں غیر مفید بھی تھا" آج کہاں تک قابل قبول ہو سکتی ہے، اس کا فیصلہ خود ناظرین پر چھوڑا جاتا ہے۔

سوانحعمریوں کے علاوہ اردو نثر میں مولینا حالی کی ایک قابلانہ تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" ہے جس میں فن شاعری اور اسکی مختلف اصناف پر ایک حد تک فلسفیانہ اور ناقدانہ حیثیت سے بحث کیگئی ہے۔ بالخصوص اردو شاعری کے حسن و قبح اور اس کے اصلاح پر بہت کچھ تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ غیر ضروری مباحث یا بے جا طوالت سے بھی بہت کام لیا گیا ہے جس سے تصنیف کا رتبہ بہت کچھ گھٹ گیا ہے۔

ہر فن کا ایک خاص موضوع بحث ہوتا ہے جس کے دائرہ سے باہر نکلنا خود مصنف اور تصنیف دونو کی ایک بڑی خامی سمجھی جاتی ہے۔ "علم تشریح" (اناٹومی) کا ایک مصنف اگر ماہیت قلب اور اسکی نقل و حرکت سے بحث کرتے کرتے شاعری پر اتر آئے اور دل کے لئے "مدفن آرزو"، اور "آماجگہ مژگاں" کی شاعرانہ

اصطلاحات استعمال کرنے لگے یا "داغہائے دل" کی تلاش میں برسوں سر مارے تو یہ اس کی کسقدر ناموزوں اور بے سود کوشش ہوگی۔ اسی طرح ایک شاعر گلاب کی تعریف کے سلسلہ میں اس کے متعلق علم نباتات (بیالوجی) کی تحقیقات شروع کرے تو اس کا یہ فعل کسقدر مضحک ہوگا گو اپنی اپنی جگہ پر علم تشریح و علم نباتات اسی قدر ضروری اور مفید ہیں جسقدر شاعری و انشا پردازی غرض مضامین کی بعض ایسی ہی نامناسبت اور بے تعلقی ہے جو "مقدمہ شعر و شاعری" میں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ شعر و شاعری پر بحث کرتے کرتے شعرا کے اخلاق کی اصلاح اور انھیں فن عروض کی تعلیم دینا ایسا ہی غیر مناسب اور ناموزوں معلوم ہوتا ہے جیسے علم تشریح میں قلب کی مرکزیت اور اس کے افعال سے بحث کرتے کرتے غالب کا یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا جائے کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرہ خوں بھی نکلا

یہ مانا کہ بعض اردو شعرا مبتذل مضامین باندھتے ہیں یا سنگلاخ زمینوں پر غزلیں لکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن فلسفۂ شعر و شاعری سے بحث کرنے والے کو تہذیب اخلاق اور درس عروض سے کیا غرض۔ اس کے علاوہ بعض مثالیں جو مطالب کو واضح کرنے کے لئے پیش کی گئی ہیں انھیں اسقدر بیجا طوالت سے کام لیا گیا ہے اور بعض ان میں ایسی عامیانہ ہیں جو شاعری کے ایسے فلسفیانہ اور لطیف مباحث کے شایان شان ہرگز نہیں۔

تصانیف شبلی ادب اردو کے ذخیرہ میں اب تک ہر سہ مصنفین نے جو اضافے کئے وہ تاریخ، دینیات، سوانح اور تنقید ادب پر مشتمل ہیں۔ علامہ شبلی نے ان اصناف علوم پر تو بہت کچھ بیش بہا اضافے کئے ہی لیکن ان کے علاوہ بہت سے جدید علوم و فنون کو بھی اردو سے روشناس کیا۔ ان کی تصنیفات کسی اتفاقی سبب

یا صلۂ انعام کی رہین منت نہیں بلکہ انھوں نے وقت کی ضروریات اور اردو لٹریچر کی اصل کمی کو محسوس کر کے یہ کام شروع کیا تھا۔ یہ بھی نہ تھا کہ ہنگامی طور پر کوئی خیال دماغ میں آیا اور اس پر کچھ لکھ ڈالا یا دوسروں کو لکھتے پڑھتے دیکھا اور ان کی ریس میں قلم ہاتھ میں اٹھالیا۔ بلکہ ان کے پیش نظر ایک متعین مقصد اور ان کے طریقۂ عمل کے لیئے ایک مقررہ پروگرام تھا۔ انھوں نے ایک طرف زمانہ 'حال' کی ضروریات کے پورا کرنے کے لیئے 'ماضی' سے سبق لیا اور دوسری طرف 'مستقبل' پر بھی نظر جمائے رکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ جسطرح اسلامی علوم جو سلطنت عباسیہ کے زمانہ تک مذہب اور اس کے متعلقات پر مشتمل تھے، یونانی علوم وفنون کے اثر سے یکبارگی بدل گئے، بعینہٖ آج بھی مغربی علوم اور سائنس کے رواج نے ہمارے قدیم فلسفہ، کلام، تاریخ اور ادب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے تصنیف وتالیف کا ایک مستقل لائحۂ عمل تیار کیا، جن کے بعض اجزا ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"(۱) فلسفۂ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ ملکی زبان مین لایا جائے

(۲) یہ بتایا جائے کہ فلسفہ حال کے کون کون سے مسایل مذہب کے خلاف ہیں پھر ان مسایل کو یا رد کیا جائے یا مذہب سے تطبیق دی جائے۔

(۳) جس قسم کے مضامین پر آجکل یورپ میں تصنیفات ہورہی ہیں اور جن پر اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں انکیں موازنہ کر کے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرز تصنیف کیا ہے۔ مثلاً تاریخ، اسمار الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں۔ انہی مضامین منے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، موازنہ کر کے بتانا چاہیئے کہ دونو کے مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کسکو کس حثیت سے ترجیح ہے۔

(۴) خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر ریویو لکھا جائے یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیونکر بڑھے، کس کس زمانہ میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوئیں۔ اور کن اسباب سے ہوئیں؟ ان کا کسقدر حصہ صحیح ہے؟ کسقدر تنقید اور اصلاح کا محتاج ہے؟۔

(۵) فارسی اور عربی شاعری اور انشا پردازی کی تاریخ لکھی جائے۔

(۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جا رہے ہیں، اردو زبان میں ترجمہ کے ذریعہ سے لائے جائیں۔

(۷) مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر تاریخانہ مضامین لکھے جائیں۔ مثلاً انتظام عدالت، انتظام محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم و نسق، معاشرت، غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مورخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس عہد میں کیا اضافہ ہوا؟"

اس پروگرام کو سامنے رکھیے اور علامہ شبلی کی تمام تصانیف کی بہ لحاظ فن تقسیم کیجئے اور پھر ہر ایک کا جائزہ لیجئے کہ انھوں نے ان دور اندیشانہ اور بلند پایہ تجاویز کو کہاں تک عمل کا جامہ پہنایا، اور جو کچھ ان سے رہ گیا، اسکی تکمیل میں اُن کے اخلاف کسقدر سرگرمی و انہماک کے ساتھ کوشاں ہیں۔ غرض علامہ شبلی کی تصانیف کی اگر بڑی بڑی تقسیم کی جائے تو وہ تاریخ اشخاص، یا تاریخ علوم یا ان دونوں کے علاوہ تنقید ادب پر مشتمل ہوں گی۔

کارلایل کا ایک بلیغ فقرہ مشہور ہے کہ "تاریخ عالم صرف اس کے بڑے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہے" غالباً اسی قسم کا خیال تھا جسکی بنا پر علامہ شبلی نے اسلام کی ایک مکمل اور باضابطہ تاریخ لکھنے کی بجائے "ناموران اسلام" کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی الفاروق ہے

جو خلیفہ ثانی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سوانحعمری اور ان کے علمی و عملی کارناموں کی محققانہ تاریخ ہے۔ بلکہ سچ پوچھیئے تو یہ تاریخ اسلام کے روشن ترین صفحات ہیں۔ الفاروق مولینا کے مورخانہ اجتھادات اور علمی تحقیقات کا بہترین نمونہ ہے جس کے لئے انھوں نے مصر، شام اور ترکی کی خاک چھانی۔ المامون اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جو ہارون الرشید کے بیٹے مامون کی لائف پر ہے بلکہ ایک طرح سے تاریخ عباسی کا ایک چھوٹا سا مرقع ہے۔ یہ دونو تصانیف اسقدر معروف ہیں کہ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

علامہ شبلی نے نہ صرف صاحبان تاج و تخت کی سوانحعمری لکھی بلکہ اہل علم و فن کے حالات زندگی بھی درج کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر تصنیف امام اعظم رح کی سوانحعمری ہے جو "سیرۃ النعمان" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں امام صاحب کے تفقہ فی الدین اور اجتہاد مسایل سے بحث کرنے کے علاوہ علم فقہ کی تاریخ بھی لکھی ہے، یعنی یہ کہ یہ علم کب سے رایج ہوا؟ کب اسکی تدوین ہوئی؟ فقہ حنفی کے اسقدر قبول و شیوع ہونیکی کیا وجہ ہے؟ ان سب سوالات کا نہایت محققانہ جواب دیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک بڑا کام اور بھی کیا ہے۔ اسلامی فقہ پر یورپ کی طرف سے ایک بڑا الزام یہ چلا آتا تھا کہ یہ قوانین رومہ (رومن لا) سے ماخوذ ہے، مولینا شبلی نے اس الزام کی تردید کی اور بتایا کہ امام صاحب کے وقت تک یورپ سے قانون یا فقہ پر کوئی کتاب ترجمہ ہو کر نہیں آئی تھی۔ اور فقہ حنفی جو کچھ بھی ہے وہ امام صاحب کا خود اپنا اجتہاد ہے۔

علامہ شبلی کی ایک دوسری تصنیف "سوانح مولانا روم" ہے۔ مولینا روم کو اب تک دنیا ایک صاحب دل، اہل باطن کی حیثیت سے جانتی تھی اور ان کی مثنویوں کو اسرار نہانی کا خزینہ اور کشف صدور کا ذریعہ سمجھتی تھی لیکن انھیں

علامہ شبلی نے ایک دوسری حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کی مثنویوں سے جس طرح صوفیائے کرام مسایل تصوف اخذ کرتے ہیں، علامہ نے ان سے عقاید و کلام کے مضامین کا استنباط کیا ہے، اور نہ صرف یہی بلکہ شاعری کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بہت بلند رکھا ہے۔ اسی ضمن میں طریقت، شریعت، اور معرفت کی منطقیانہ تعریفیں کی ہیں اور اُن پر جس حکیمانہ انداز سے بحث کی ہے، وہ اردو کی بساط دیکھتے ہوئے بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔ علامہ شبلی نے تصوف اور اس سے متعلق بعض مسایل کی طرف اس کتاب میں مختصر جو کچھ لکھا ہے، انھیں "الغزالی" میں میدان کشادہ پاکر تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ امام غزالیؒ کے حالات زندگی اور بھی کوئی شخص چاہتا تو آسانی کے ساتھ لکھ سکتا تھا لیکن دونو میں جو فرق ہوتا، اس کا اندازہ کسی قدر "الغزالی" پڑھکر ہو سکتا ہے جسمیں مولینا شبلی نے اس بڑے امام کے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کو اس سادہ اور عام فہم طریقہ پر بیان کیا ہے جسے پڑھکر فلسفہ پر ایک عام علم کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے تصوف کی وجہ تسمیہ، اسکی مختلف توجیہات نہایت سلجھے ہوئے پیرایے میں بیان کئے ہیں۔ "سیرۃ النبی" نہ صرف تصانیف شبلی کی اس نوع یعنی "تاریخ رجال" میں آخری تصنیف ہے بلکہ خود مولینا کی زندگی کا سب سے آخری علمی کارنامہ ہے۔ پیغمبر اسلام کی سیرۃ لکھنی کوئی نئی یا غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن اکثر معمولی اور پرانی باتیں اسقدر محتاج توجہ ہوتی ہیں جتنی نئی اور غیر معمولی نہیں ہوتیں سیرت یا حیات نبی پر تقریباً ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر زبان میں جب اسلام سے کچھ بھی تعلق رہا ہوگا، کچھ نہ کچھ ضرور لکھا گیا ہے۔ خود عربی میں ہزاروں لاکھوں تصانیف مختلف حیثیتوں سے آپ کی زندگی اور اخلاق پر موجود ہیں سترھویں و اٹھارھویں صدی میں یورپ نے جب اسلام کی طرف اعتنا کیا تو صدہا کتابیں

آپ کی لائف اور کارناموں پر مختلف مصنفین کے قلم سے جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں لکھی گئیں۔ ہندوستان میں بھی اس پیارے نبی کی حیات طیبہ پر کچھ نہ کچھ لٹریچر موجود ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود بھی ایک جدید تصنیف کی ضرورت اردو میں محسوس ہو رہی تھی جو موجودہ سیرتوں یا اور کسی کتاب کے ترجمہ سے ہرگز پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی صورت میں علامہ شبلی کا ایک ایسی تصنیف کا جو روایات کی پیچیدگی اور مغربی زہر آلود خیالات کی آلائشوں سے پاک ہو اپنے ہاتھ سے داغ بیل ڈالنا اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ اردو کی ایک ناقابل فراموش خدمت ہے یہ صحیح ہے کہ کہ علامہ مرحوم اس کام کو اپنے عین حیات پورا نہ کر سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کے حق میں اسکی عدم تکمیل ہی مفید تھی اس سلسلے سے اپنے بعد ایک جماعت تو ایسی چھوڑ گئے ہیں جو نہ صرف اس کام کی تکمیل میں سرگرم ہے بلکہ اردو کی دوسری خدمات بھی انجام دے رہی ہے۔

اردو تصانیف میں علامہ شبلی نے جس نئے باب کا اضافہ کیا ہے، وہ علوم و فنون کی تاریخ ہے اب تک نہ صرف اردو بلکہ فارسی و عربی تک میں علوم و فنون کی تاریخ لکھنے کا کوئی دستور نہ تھا۔ علامہ شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو ادب بلکہ اسلامی لٹریچر میں یہ بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ممکن ہے ضمنی طور پر انھوں نے بعض علوم مثلاً فقہ وغیرہ کی تدریجی ترقی پر لکھنے کی کوشش کی ہو لیکن "علم الکلام" ان کی وہ تصنیف ہے جسمیں انھوں نے باقاعدہ طور پر علم کلام کی ابتدا، اس کے عالم وجود میں آنے کے اسباب، اسکی عہد بعہد کی ترقیوں اور اس پر خارجی حالات کے اثرات سے مفصل بحث کی ہے اور اسی سلسلہ میں اکابر متکلمین کے حالات بھی مختصر طور پر لکھے ہیں اور ان کے دقیق فلسفیانہ خیالات کی بھی تشریح کرتے گئے ہیں اصل میں یہ کتاب "الکلام" کا پیش خیمہ ہے جو اس فن پر ایک مستقل تصنیف ہے۔

اپنی عام روش سے علٰحدہ اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت اس وجہ سے پڑی
کہ اس زمانہ میں مغربی علوم و تہذیب کا چرچا گھر گھر پھیلا ہوا تھا جن کی وجہ سے
لوگوں کے مذہبی عقاید کی بنیادیں متزلزل ہونے لگی تھیں۔ سائنس کا اسقدر
زور تھا کہ مذہب کوئی دن کا مہمان نظر آنے لگا، اس بنا پر بعض لوگوں نے ایک
جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کی لیکن مولینا نے مسلمانوں کے اسی قدیم کلام کو
موجودہ صورت حال کے مقابلہ کے لئے کافی سمجھا اور اس غرض سے انھوں نے
اس فن پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ الکلام لکھا جسمیں مذہب کی ضرورت،
اسلام کے فضایل، وجود باری کے دلایل، معجزات کا ثبوت، نبوت کی حقیقت
اور یورپ کے ایک بہت بڑے الزام یعنی "اسلام مانع ترقی ہے" کا جواب اور ان تمام
مسایل پر نہایت خوبی اور وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔
مولانا کی تصانیف میں تیسری نوع "تنقیدات ادب" کی ہے جسمیں سب سے
معرکۃ الآرا تصنیف "شعر العجم" ہے۔ کسی قوم کے لٹریچر کی تاریخ پڑھو، تنقید ادبی کا
نمبر سب سے بعد میں آئیگا اور اسکی وجہ ہے۔ کیونکہ تنقید موقوف ہے ذخیرۂ ادبی کی
فراہمی پر۔ تاوقتیکہ ادب کا ایک کافی سرمایہ موجود نہ ہو، تنقید نہیں ہو سکتی۔
اور اس سے بڑھکر "تنقیدات عالیہ" (ہائر کریٹی سزم) نہ صرف ذخیرہ ادبی کے
وجود بلکہ قوم کی صلاحیت و قابلیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اردو اگرچہ اپنی زندگی
کے اس قلیل عرصہ میں اسقدر ذخیرہ فراہم نہ کر سکی لیکن اس کے پڑھنے والونمیں
کم از کم وہ صلاحیت و قابلیت ضرور موجود تھی۔ اس بنا پر فارسی شاعری پر
تنقیدات عالیہ اردو کے لئے نہ صرف ایک دقت کی چیز بلکہ اسکی نشو و نما میں بہت
حد تک ممد ہیں۔ اس طرز کی تصنیف نہ صرف کسی غیر زبان بلکہ فارسی تک میں
موجود نہیں ہے۔ "شعر العجم" کا نام لیتے ہی اور اس کے ساتھ اس ادعا کو سنکر

بعض لوگوں کا خیال پروفیسر براؤن کی "تاریخ ادبیات ایران" کی طرف مایل ہوتا ہے لیکن یہ خیال صرف دونو سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ براؤن نے ایران کی دماغی و ذہنی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے نہ کہ ایران کی شاعری پر۔ مستشرقانہ قابلیت اور وسیع النظری اور چیز ہے اور شعر و سخن کا مذاق اور ذوق ادب کا ہونا ایک دوسری چیز۔ علامہ شبلی نے جو کچھ لکھا ہے وہ آشنائے فن ہوکر لکھا ہے جس سے براؤن قطعاً محروم تھے۔ اس نوع کی دوسری تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" ہے جسکے شایع ہونے پر بڑی لے دے ہوئی کہ ایک غیر شخص نے اس 'ارض ممنوعہ' میں کیوں قدم رکھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں ایک صاحب نے بڑے زور شور سے "المیزان" لکھی جسمیں انصاف کے ساتھ انیس اور دبیر کے دونو پلے میزان میں برابر رکھنے کی کوشش کیگئی ہے جو موازنہ میں انیس کی طرف جھک گیا تھا۔ ان مصنفانہ مناظروں سے قطع نظر کرکے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو شعر العجم اور موازنہ دونوار دو لٹریچر میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتیں۔

سب سے اخیر میں مولینا کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو "مقالات شبلی" اور "رسایل شبلی" کے نام سے الگ الگ موسوم ہے۔ ان میں بعض مضامین تو ایسے ہیں جو اردو میں تاریخی حثیت سے اپنا مثل نہیں رکھتے۔ مثلاً "جزیہ" "کتبخانہ اسکندریہ" اور "فلسفہ یونان و اسلام"۔ اول الذکر نہ صرف اسلام میں بلکہ تاریخ ہند میں بھی ایک مابہ النزاع مسئلہ رہا ہے غیر مسلمین پر اس ٹکس کا عاید کرنا نہ صرف طلبہ کے نزدیک بلکہ اساتذہ کے زمرہ میں بھی اسلام کا ایک بڑا ظلم سمجھا جاتا تھا' لیکن مولینا شبلی نے جس محققانہ طور پر اس بے بنیاد ظلم کی بیخکنی کی ہے' اسے دیکھکر مصنف کی مورخانہ قابلیت کا غیر ستایشی اعتراف کئے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح کتبخانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام بھی مسلمانوں کی گردن پر ایک زمانہ سے

چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ بیگانے تو بیگانے یگانوں کو بھی اس ظلم کا یقین ہو چلا تھا لیکن علامہ شبلی نے اصل حقیقت کو جس طرح بے نقاب کیا ہے، وہ ان کے وسیع ذرائع تاریخی پر دسترس رکھنے کا بین ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں ایک چیز رہی جاتی ہے اور وہ مولینا کے مکتوبات ہیں جو ان کی غیر ارادی تحریر کا نمونہ ہیں اور وہ بھی کسیطرح ادبی حیثیت سے معاصرین کے مجموعۂ مکاتیب سے کم نہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ برعکس اور لوگوں کے مکتوبات کے علمی و تعلیمی معلومات و مشاہدات کا وہ بیش بہا مجموعہ ہیں۔

خاتمہ سوال کے دونو پہلو یعنی ادبی اور علمی کا جہاں تک تعلق تھا، ان پر کافی بحث ہو چکی۔ اور ہر ایک کے واقعات و شواہد کا دستیاب ہونا جہاں تک ممکن تھا، وہ سب پیش کئے گئے۔ اب ان پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ بے شک آزاد نے اردو زبان و ادب کا سنگ بنیاد رکھا اور نذیر احمد و حالی نے اس پر بہت کچھ اضافے کئے لیکن اس تعمیر کی تکمیل جس نے کی، وہ شبلی کی ذات تھی۔ یہ صحیح ہے کہ سلطنت مغلیہ کی بنیاد بابر نے ڈالی اور ہمایوں نے اسے بہت کچھ سنبھالا لیکن جس نے سلطنت مغلیہ کو اس قابل بنایا کہ وہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہو سکے، وہ شہنشاہ اکبر تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آزاد نے اردو کا علمی زبان کی حیثیت سے تخم رکھا اور نذیر احمد اور حالی نے اس میں سلاست و روانی کے ذریعہ اس کی نشوونما کی، لیکن جس نے اردو کو دنیا کی اور زبانوں کے ساتھ آنکھیں ملانے کے قابل بنایا وہ شبلی تھے۔ اسی طرح اردو ادب کو جس نے اسقدر مالا مال کیا کہ وہ اپنے ہمعصر لٹریچروں کے ہم پلہ ہو سکے، وہ شبلی کی ذات تھی، بے شک آزاد نے اشخاص کے حالات زندگی لکھے اور حالی نے اسے ترتیب دیکر ایک فن کی صورت میں کر دیا لیکن شبلی نے اس فن کو جس درجۂ کمال پر پہنچایا، اس کا ثبوت "الفاروق"، "سیرۃ النبی" اور "الغزالی" دیکھتی ہیں۔ آزاد نے اردو

اور فارسی شاعری کی تاریخ اور شعرا کے حالات لکھے، حالی نے "شعر و شاعری" پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے لکھا، لیکن شبلی نے چار جلدوں میں "شعر العجم" اس مورخانہ اور فلسفیانہ نقطہ خیال سے لکھی جسکے آگے آزاد کی "سخندان فارس" اور "آبحیات" اور حالی کا "مقدمہ" دبکر رہ گیا۔ آزاد و حالی نے اپنے بعض مخصوص شعرا کو لیکر "دیوان ذوق" اور "یادگار غالب" ترتیب دیا لیکن ذوق و غالب اپنے اپنے مرتبہ سے ایک انچہ آگے نہ بڑھے۔ شبلی نے جب "موازنہ" لکھا تو انیس کی تمام عالم میں ایک دھوم مچ گئی۔ نذیر احمد نے اگر کسی سنجیدہ مضمون کو ہاتھ لگایا تو مذہب کو لیا اور وہ بھی خدمت دین کے خیال سے۔ لیکن شبلی نے مذہب کو ہاتھ لگایا تو اسوقت جبکہ وہ مغربی علوم اور سائنس کے نرغہ میں تھا۔ انھوں نے "علم الکلام" اور "الکلام" اسی غرض سے لکھی کہ مذہب کو اس کے ان دشمنوں سے بچائیں۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان تصانیف نے اس سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچایا جتنا نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن اور "الحقوق والفرائض" سے ہو سکتا تھا۔ شبلی نے ایک اسلام پر اسقدر لٹریچر فراہم کر دیا، جتنا ان کے دیگر معاصرین نے کسی چھوٹے سے چھوٹے مضمون پر بھی نہیں کیا۔ اور اس بنا پر اردو اپنی فارسی اور عربی بہنوں کے مقابلہ میں جسقدر ناز کرے کم ہے اسلام عرب سے اُٹھا، فارس اس کا عرصہ تک مسکن تھا لیکن اس کے متعلق اسقدر گرانبہا سرمایہ مرتب صورت میں عربی و فارسی میں غالباً نہ ہوگا، جتنا اس ایک اردو میں ہے اور یہ سب شبلی کا طفیل ہے۔ غرض۔

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن تو شبلی سا وحید عصر یکتائے زمن دیکھو

سعید انصاری، علی گڈھ ۳۱ر جنوری ۲۵ء

ضمیمہ

فہرست کتب جو زیر مطالعہ تھین

(۱) کویلر کاؤچ (Quiller Couch)

۱۔ فن تحریر (Art of writing)

(۲) فریڈرک ہیریسن (Frederick Harison)

۲۔ انتخاب کتب (Choice of books)

(۳) مہاتما گاندھی:۔

۳۔ "ینگ انڈیا" (کتابی صورت مین جو چھپکر شائع ہوا ہے)

(۴) ایم مہدی حسن:۔

۴۔ افادات مہدی

(۵) پروفیسر محمد حسین آزاد:۔

۵۔ آب حیات

۶۔ نیرنگ خیال

۷۔ دربار اکبری

۸۔ سخندان فارس

۹۔ دیوان ذوق

(۶) خواجہ الطاف حسین حالی:۔

۱۰۔ حیات سعدی

۱۱۔ حیات جاوید

۱۲۔ یادگار غالب

۱۳۔ مقدمہ شعر و شاعری

(۷) ڈپٹی نذیر احمد:۔ ۱۴۔ توبۃ النصوح۔

۱۵۔ مراۃ العروس

۱۶۔ بنات النعش

۱۷۔ رویائے صادقہ

۱۸۔ الحقوق والفرائض

۱۹۔ مصحف القران

۲۰۔ درباری لکچر

۲۱۔ مجموعہ خطوط نذیر احمد

(۸) علامہ شبلی نعمانی:۔

۲۲۔ سفرنامہ مصر و شام و روم

۲۳۔ الفاروق

۲۴۔ المامون

۲۵۔ سیرۃ النعمان

۲۶۔ سوانح مولینا روم

۲۷۔ شعر العجم (ہر چہار حصص)

۲۸۔ الغزالی

۲۹۔ الکلام

۳۰۔ علم الکلام

۳۱۔ مضامین عالمگیر

۳۲۔ موازنہ انیس و دبیر

۳۳۔ سیرۃ النبی

۳۴۔ مکاتیب (ہر دو حصص)

۳۵۔ رسائل شبلی

۳۶۔ مقالات شبلی

سعید انصاری اعلی گڑھ ۳۱ جنوری ۲۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

کا

انعامی مقابلۂ ادبی

متعصب یورپ اور اوس کی پرستار جماعت، اسلامی حکومتون اور حکمرانون کے خلاف جتنا بھی زہر اُگلے، تاریخ دان اہل نظر اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہین، کہ مسلمان جہان کہین بھی گئے، انھون نے ویرانیون کو آبادیون مین، جنگلون کو بازارون مین، سرابون کو چشمون مین، جہل کو علم مین، تاریکی کو روشنی مین، ظلمت کو نور مین، ارذل کو ارفع مین بدلدیا، ہر جگہ تہذیب و تمدن، علوم و فنون، صنعت و حرفت کے چشمے ابل پڑے، اور اگرچہ آج منبع کی خشکی نے ان تمام

موجِ دریاؤن کو سکھا دیا ہے، پھر بھی اون کے آثار و علامات آج تک اون کے وجود کا ثبوت خاموش زبانون سے دے رہے ہین، یہ ایک ایسی صداقت ہے جس کو مخالفین اپنی تمام مساعی باطلہ کے باوجود بھی نہ جھٹلا سکے، اور آج ہر مورخ یہ ماننے اور تعلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اسلام اور بانیٔ اسلام دنیا کے لیئے رحمت تھے،

ہندوستان مین بھی مسلمان فاتحانہ داخل ہوئے، لیکن ان کی فتح و کامرانی شہنشاہیت کے لیے نہ تھی، حصول زر کے لیے نہ تھی، دولت و مال کی طمع مین نہ تھی، لعل و جواہر کی لالچ مین نہ تھی، غلامون اور لونڈیون کے خیال سے نہ تھی، عظمت و شوکت، جاہ و جلال، کے لئے نہ تھی، بلکہ ان کا واحد مقصد اور ان کی تنہا غرض صرف یہ تھی، کہ دنیا کو بربریت سے تمدن کیطرف، وحشت سے تہذیب کی طرف، اور علمی و مذہبی کفر و الحاد سے اسلام و راستی کی طرف لے آئین، چنانچہ اونھون نے اسی ملک پر صدیون حکومت کر کے بتا دیا، کہ وہ یہان کس غرض و غایت کو لے کر آئے تھے، تمام ملک مین علمی بیداری ہو گئی، تمدن و تہذیب کا آفتاب طلوع ہوا، اور تمام ملک یک بیک تاریکی سے نکل کر شاہ راہ ترقی پر گامزن ہو گیا، اور ہندوستان ان کے قدمون کی برکت سے ایک بار پھر رشک عالم بن گیا، ہندو تاریخ نہین جانتے تھے، صدیون کی کوششون کے بعد بھی آج تک کوئی ایسی کتاب قبل عہد اسلام کی نہین مل سکی جس کو ہم تاریخ کہہ سکین، یہ چیز مسلمان اپنے ساتھ لائے، اور انھون نے ہندوؤن مین یہ مذاق پیدا کیا جس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ خود اس شخص کے عہد مین، جس کو دنیا سب سے بڑا "متعصب" "ظالم، ہندو کش، اور ستمگر" کہتی ہے، بڑے بڑے ہندو مورخ پیدا ہوئے،[1] اسی طرح دوسرے بہت سے علوم ہین، جو صرف مسلمانون کی بدولت ہندوستان مین رائج ہوئے، مسلمانون نے

[1] J. N. Sarkar's Aurangzeb Vol I

اس ملک کو اپنا گھر اور وطن بنالیا، اور ہر ممکن کوشش سے تمام اقوام ملک کو ایک ہی سلسلہ مین منسلک کرنے کی کوشش کی، اس کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت تھی، وہ ایک ایسی عام زبان تھی، جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاسکتی ہو، اور دراصل اس زبان کی بنیاد، اس عمارتِ اتحاد کا سب سے پہلا اور مضبوط ترین پتھر تھا، مسلمانوں کی آزادی اور وسعت خیال کا اِس بات سے پتہ چلتا ہی، کہ اونھون نے کبھی اس بات پہ تمام لوگوں کو مجبور نہین کیا، کہ وہ اپنے حاکموں کی زبان ہی میں گفتگو کرین،

اس کی طرف سب سے پہلا قدم جس شخص نے بڑھایا، وہ خود اسی ملک کا ایک مشہور راجہ اور اکبر کا وزیر مال ٹوڈرمل تھا، اسی نے سب سے پہلے فارسی کو دفتری زبان مقرر کیا، لیکن مسلمانوں کی بے تعصبی دیکھو کہ کہ سے صدیوں پہلے تغلقوں ہی کے زمانہ میں مسلمانوں نے ہندی تقریبًا اپنی زبان بنالی تھی اور امیر خسرو وغیرہ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعر صرف بھاشا میں کہتے تھے،

اُردو زبان دراصل ملک کو لسانی طور سے متحد کرنے کی سب سے بڑی کوشش تھی، شاہ جہاں نے یہ خواب دیکھا، اور اگر اوس کے بعد دو چار شاہ جہاں اور پیدا ہوجاتے تو اس کی تعبیر آج صاف نظر آتی، لیکن بدقسمتی سے اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہی سے سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوگیا، اور یہ تجویز زیادہ بار آور نہ ہوسکی، اگرچہ اس کی جڑ مضبوط تھی، اور اس کا بیج اس اعلیٰ قابلیت سے بویا گیا تھا کہ اوس کی گھنی شاخوں نے بہت جلد تمام ہندوستان کو چھا لیا تھا، اور بنگال، بہار، پنجاب، گجرات، دکن، صوبہ متوسط، مدراس، دہلی، اودھ، اکبرآباد، (صوبہ آگرہ) مین ہزاروں، بلکہ لاکھوں اشخاص اسکے بولنے والے پیدا ہوگئے تھے، لیکن

---

[1] گلشن ہند مقدمہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے۔

جو بلبل ان شاخوں پر چہکے انکو دنیا صرف "شاعر" کے نام سے یاد کرتی ہے، نثر کا عرصہ تک پتہ نہیں چلتا، اور صرف شعر ہین اور وہ بھی جو غزل، مثنوی، ہجویات پر مشتمل ہون، کسی خالص علمی مضمون کی تلاش بیکار ہے، کچھ تو خود لوگوں نے وقت کے تقاضا سے اس طرف توجہہ نہ کی، اور کچھ مربیوں کے فقدان نے اس کو پھلنے پھولنے نہیں دیا، طوائف الملوکی کا زمانہ تھا، ہر شخص کو اپنی جان، اپنی عزت اور اپنے بال بچوں کی فکر پڑی تھی، پھر ایسی حالت میں علوم کی مجلسیں سجتیں تو کیونکر اور فنون کی انجمنیں منعقد ہوتیں تو کسطرح لیکن پھر بھی جو لوگ اس میں علمی زبان کی صلاحیت دیکھتے تھے، اونھون نے تمام موانع اور دشواریوں کے باوجود اس کی طرف توجہ کی، اور اسی وقت سے کچھ نہ کچھ ہوتا رہا۔

مولوی عبدالحق بی، اے، نے گلشن ہند کے مقدمہ میں اور اردو کے حال کے پرچوں میں، مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ نے اپنے مشہور لغت کے دیباچہ میں، مولانا آزاد نے آبحیات کی ابتداء میں، اور حال ہی مین مولوی احسن صاحب مارہروی نے علی گڈھ میگزین اور ستارہ مین اُردو نثر کی ارتقائی کیفیت بتانے کی کوشش کی ہے، اور اگرچہ ان سب سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو نثر کا وجود اٹھارویں صدی کے وسط ہی سے پایا جاتا ہے، لیکن پھر بھی عام رجحان طبیعت کے مطابق، اس مین صرف دو ہی قسم کا مواد موجود ہے، یعنی یا تو مذہبی تصانیف اور افسانے ہیں، یا پھر اون کے ترجمے ہیں، اگرچہ انگریزوں کی آمد کے بعد ملک میں علمی ذوق پیدا ہونا شروع ہوا، اور ان کو اُردو سیکھنے کی ضرورت نے اس طرف متوجہ کرکے اردو مصنفین، مترجمین، مولفین کی اچھی خاصی جماعت پیدا کردی، لیکن پھر بھی جو ہوا، وہ اردو کے لیے کوئی قابل فخر چیز نہ تھی، اور خود مولانا محمد حسین آزاد کے زمانہ تک اس زبان کو اس قابل نہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں

علمی تصنیف کیجائے، چنانچہ اس کی انھوں نے جابجا شکایتیں کی ہیں، نیرنگ خیال میں لکھتے ہیں۔

"غرض کہ زبانِ اردو کے پاس جو کچھ اصل سرمایہ ہے، وہ شعراے ہند کی کمائی ہے جنھوں نے فارسی کی بدولت اپنی دکان سجائی ہے، یہ مفلس زبان علمی الفاظ میں تو اسلیے تہیدست رہی کہ یہ ملک کی علمی زبان نہ تھی، افسوس یہ ہے، کہ عام مطالب کے ادا کرنے میں بھی مفلس ہے، چنانچہ اگر تاریخ یا کسی قسم کی سرگذشت اس زبان مین لکھی جائے تو جو اصلی حالت یا اپنے دل کا ارمان ہو، وہ نہیں نکل سکتا، اسی واسطے اس کا اثر بھی جیسا کہ جی چاہتا ہے، پڑھنے والے کے دل تک نہیں پہونچتا"۔

آب حیات میں تحریر فرماتے ہیں۔

"انجام اس کا یہ ہوا کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا، اور نوبت یہ ہوئی کہ اگر کوشش کرین تو فارسی کی طرح پنجر قصہ اور مینا بازار یا فسانہ عجائب لکھ سکتے ہین لیکن معاملہ یا تاریخی انقلاب اس طرح نہیں بیان کرسکتے، جس سے معلوم ہوتا جائے کہ واقعہ مذکور کیونکر ہوا، اور کیوں کر اختتام کو پہنچا، اور اس طرح پڑھنے والے کو ثابت ہوجائے کہ رد و کد اس وقت کی، اور صورتِ حال معاملہ کی ایسی ہورہی تھی، کہ جو کچھ ہوا، اسی طرح ہوسکتا تھا دوسری صورت ممکن نہ تھی، اور یہ تو ناممکن ہے کہ ایک فلسفہ یا حکمت اخلاق کا خیال لکھین، جن کی صفائی کلام لوگوں کو اپنی طرف لگائے، اور اس کے دلائل جو حسن بیان کے پردہ مین برابر جلوہ دیتے جاتے ہین، وہ دلوں سے تصدیق کے اقرار لیتے جائین اور جبراً اسے روکنا یا جس کام پر جھوکنا منظور ہو، اس مین پوری پوری اطاعت سننے والوں سے لے سکین"

لیکن پھر بھی جس عمارت کی بنیاد پڑ چکی تھی، اور جس کی خوشنما مکمل صورت ہر شخص کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اس کے چاہنے والوں اور سیکھنے والون نے

اس کو علمی زبان بنانے میں پوری پوری کوشش صرف کر دی، اپنی زندگیاں
اس کے لئے وقف کر دین، اور آج انھی چند مقدس ہستیوں کے علمی و قلمی مساعی
کا نتیجہ ہے، کہ ہم اُردو کو ایک علمی اور ہر مضمون کو ادا کرنے والی زبان کی حیثیت سے
پیش کر رہے ہیں، انگریزوں کے ذوق و شوق نے اس میں نئی جان پیدا کر دی،
اور اس کے ساتھ ہی گذشتہ صدی کے ابتدائی سالوں مین جو علمی و ذہنی انقلاب
ہندوستان مین رونما ہونا شروع ہوا تھا، اس نے ملک کے ہر گوشہ کے اہل دماغ
کو اس کی طرف متوجہ کر دیا، اس میں اولیت کا فخر اگر حاصل ہے تو سر سید احمد کو
جنھوں نے پرانی طرز تحریر اور طریقہ انشاء کو صاف کر کے اس مین سلاست، روانی
پیدا کی، اور علمی حیثیت سے جدید معلومات سے پر کر کے اس خزانہ کو مالا مال کر دیا،
اون کے رفقاء مین مولانا آزاد، مولوی الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد صاحب،
مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک، مولانا شبلی رح وغیرہ قابل ذکر ہین، لیکن اس
جماعت میں سب سے زیادہ جن لوگوں نے اس کام میں حصہ لیا اور اس عمارت کو
کو مکمل کر کے اس کے نقش و نگار کو دیدہ زیب بنایا، اُن مین حالی، شبلی، نذیر احمد
اور آزاد اولیت کا فخر رکھتے ہین اور آج ہم اس مضمون مین یہی دکھانے کی
کوشش کرینگے کہ عناصر خمسہ کے ان چار اجزا ارسنے ادب و انشاء میں کیا کیا گل کھلائے
، کیا کیا رنگینیاں پیدا کین، کس طرح اُردو کو ترقی دی کس طرح اسکو علمی اور ادبی
زبان بنایا، اور کس طرح اونکی تحریریں، اونکی تصانیف، اونکی کتابیں، اون کے
ترجمے آج ملک و قوم کے لیے شمع ہدایت بنے ہوئے ہین، اور کس طرح آج تمام
اُردو دنیا اونہی کی بتائی ہوئی راہ پر چل رہی ہے۔

ان اربعہ عناصر اور محسنین اردو کو دنیا مصنفین کے نام سے جانتی ہے،
اور اردو زبان جب تک روئے زمین پر باقی رہیگی، ہمیشہ ان کی ممنون احسان رہیگی،

ان کی تصانیف نے اُردو مین ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا ہی، اور آج اس کو اس قابل بنادیا ہی
کہ وہ اپنی دوسری علمی بہنوں کے ساتھ برابری میں کھڑی ہوسکتی ہے، اگرچہ اس کو علوم
وفنون کے تمام زیور میسّر نہیں آئے ہیں، پھر بھی اس کے پاس جو کچھ سرمایہ و دولت ان
خدایان اُردو کا دیا ہوا ہے، وہ اس کی امارت و دولت کے اظہار کیلیے کافی ہے،
لیکن جس طرح دنیا کی ہر چیز ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہے، حتیٰ کہ خود انسان کے
جوارح واعضاء ایک دوسرے کے مطابق نہین اور جس طرح باغ کا ہر پھول اپنے رنگ
وبُو اور اپنے حسُن میں دوسرے پھولون سے ممتاز ہوتا ہی، بالکل اسی طرح ان انشاپردازون
کی تحریرون، اونکے مباحث، اونکے طریقۂ بیان، اونکے طرز تحریر، انکی ترتیب خیال،
اونکے الفاظ اور اون کی ترکیبوں کی چستی، اونکے مضامین کے موضوع متنوع ہیں،

ع ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است

اور انھی چیزوں نے ایک کو دوسرے سے قابل امتیاز و موازنہ بنادیا ہے، اور
آج ہم اس بحث مین یہ دکھانے کی کوشش کرینگے کہ ان میں اولیت، جامعیت اور کمال کا
فخر کسکو حاصل ہے، انشا پردازی کی حیثیت سے کون سب سے زیادہ بلند ہے، تنوع
مضامین کی حیثیت سے کون اعلےٰ ہے، اور کس کی کتابون نے سب سے زیادہ نتائج کو
فائدہ پہونچایا ہے،

ہندوستان کی عام زبان اردو کو ترقی و وسعت دینے مین ان حضرات نے جو کچھ کیا،
اوسکا اندازہ اوسی وقت ہوسکتا ہے، جبکہ ہم اپنے سامنے اُردو کے اوس سرمایہ کو
جو ان سے پہلے موجود تھا، پیش نظر رکھین، اور اُردو نثر کی عمارت جس حد تک بن چکی
تھی، اوس کا خاکہ ہمارے سامنے ہو، اس وقت ہم یہ بتانے کے قابل ہونگے،
کہ ان بزرگون نے کیا کیا اضافے کیے، کیا کیا الفاظ و معانی کے باغ لگائے، اس عمارت کو
کس حد تک پہونچایا، اور اس مین کس قسم کے نقش و نگار بنائے، اور اب جو کام

جاری ہے اوس مین اونکے کام کا کس قدر تتبع اوران کے دیکھائے ہوئے رستہ
کی کسقدر پیروی ہورہی ہے، ۱۹ دین صدی کے ربع اول میں اُردو نثر کی حالت
نہایت ہی کم مایہ آدمی کی سی تھی، نہ اس کے پاس علمی تصنیفات تھین اور
نہ عقلی کتابیں، اس کا خزانہ تمام کارآمد چیزوں سے خالی تھا، اگر تھا تو صرف
متعدد افسانوں اور مذہبی کتابوں کا سرمایہ تھا، اور وہ بھی اس طرح، کا جو لفظ بہ لفظ
فارسی کا ترجمہ ہو یا اوس کے رنگ کی عبارت ہو، نہ اس میں سلاست تھی اور نہ روانی،
نہ ترکیب کی بندش تھی نہ طرز تحریر کی خوبی، لیکن پھر بھی اس سے اس بات کا صاف
پتہ چلتا تھا، کہ اگر لوگوں نے اس طرف توجہ کی، تو اس زبان میں ترقی و وسعت کی پوری
صلاحیت موجود ہے، اُردو چونکہ مختلف زبانوں کے مجموعہ کا نام تھا، اسلئے یہ بات
بھی آسان تھی کہ علمی اصطلاحات یا دوسرے الفاظ جو اظہار خیال کے لیئے اس مین
نہ ہوں، دوسری زبانوں سے نہایت ہی سہولیت سے لئے جا سکتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی
ہوا، اوران عناصر خمسہ نے اسی قسم کی کوشش کرکے اس کو ایک علمی زبان بنا دیا،
ان لوگوں کے سامنے اُردو کا جو نمونہ تھا، وہ فسانہ عجائب، آرایش محفل، وہ مجلس
وغیرہ کا تھا، اسکے بعد سر سید احمد نے اپنی تصانیف اور غالب نے اپنے خطوط کے
ذریعہ اس زبان کو بہت کچھ صاف کیا، اور قدامت کا جو زنگ اس زبان پر لگا ہوا تھا،
وہ ان صیقل گروں کے ہاتھوں دور ہونے لگا، اس کے بعد یہ چار یاری جماعت
ترقی کا علم لئے ہوئے بڑھی، اور اس نے اس تیغ آبدار کو اس طرح صاف کیا، اور
چمکا دیا کہ آنکھیں آج تک خیرہ ہیں اور اسی کی چمک ہے جو ہم کو ہمارا آئندہ راستہ
بتا رہی ہے، لیکن اگر ہم ذرا انصاف کی عینک لگا کر دیکھینگے تو ہمکو صاف نظر آئیگا
کہ ان چار صناعوں میں سب سے زیادہ جس شخص نے اُردو پر احسان کیا جس نے
اسکو مختلف خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا، جس نے اُردو کو اپنے ادبیات سے مالامال کیا،

جس نے مردہ جسم مین روح ڈالی، جس نے اُردو کی کایا پلٹ دی، جس نے اس مین روانی، وسعت، جستی، فصاحت، بلاغت، ایجاز پیدا کیا، جس نے اردو کو علمی زبان بنانے میں سب سے زیادہ محنت کی، جس نے وہ راہ بتائی جس پر آج سب چل رہے ہیں، تو ہم کو ماننا پڑیگا کہ یہ فخر و اولیت کا تاج اگر کسی سر پر زیب دیتا ہے تو وہ مولانا شبلی اور صرف مولانا شبلی کا سر اقدس ہے۔ اون کی تصانیف کو دیکھو، اون کے مباحث پر نظر ڈالو، انکے اختلافات و تنوع کو پیش نظر رکھو، اور خود فیصلہ کرو کہ کیا کسی شخص نے بھی اتنے متعدد مضامین، رسالے اور کتابیں لکھین، کیا ان چاروں میں کوئی اتنا وسیع المباحث مصنف تھا؟ کیا ان میں سے کسی نے بھی تاریخ، تذکرہ، سوانح، سیرۃ، عقلیات، ادبیات، سیاسیات، معاشرت، فقہ، حدیث، اصول فقہ، اصول حدیث، عقائد، تصوف پر اس زور و وسعت معلومات کے ساتھ قلم اوٹھایا، کسی نے بھی لوگوں کے سامنے مختلف موضوع پر اس طرح اظہارِ خیال کا معجزانہ طریقہ پیش کیا، اور کیا کوئی دوسرا اس قسم کی مختلف چیزیں لوگوں کے سامنے رکھ سکتا ہے، نہیں یہ خدا کی دین ہے، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا کی اسی ہمہ گیری کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہین،

"ہندوستان کی سیر حاصل زمین نے فقہ و حدیث میں، صغانی، علی متقی اور شیخ عبدالحق، کلام و اسرار شریعت میں بحر العلوم اور شاہ ولی اللہ، ادب و معانی مین عبدالمقتدر، ملک العلی اور ملا محمود، فلسفہ و منطق مین ملا نظام الدین اور ملا محب اللہ، ادب و شاعری مین مسعود سلمان، خسرو، فیضی، تاریخ و خبر مین برنی، ابو الفضل اور آزاد بلگرامی کو پیدا کیا لیکن اس کے آغوش کا آخری فرزند (شبلی) وہ تھا جو عبدالحق بھی تھا اور شاہ ولی اللہ بھی، ملا محمود بھی تھا اور فیضی بھی، محب اللہ بھی تھا اور آزاد بھی اور کم از کم وہ یگانہ انفرادا ان لوگوں میں سے اکثر کے برابر اور مجموعاً ان میں سے اکثر سے بہتر تھا" [1]

---

[1] معارف جلد ا نمبر ۳ صفحہ ۱۲ - ۱۳ -

اب ہم اپنے آئندہ صفحات میں اپنے اسی دعویٰ کے ثبوت پیش کرین گے، ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ کسی تعصب، خوش اعتقادی، اور حسن ظن کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ان اربعہ عناصر کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ہم یہ دکھانے کی کوشش کرینگے کہ چونکہ مولانا شبلی نے مختلف مبلغ کتابین اور مضامین لکھے ہین، اور اُردو زبان کو ہر موضوع کے خیالات کے اظہار کے قابل بنا دیا ہے، اسلئے ملک نے سب سے زیادہ اونہیں کے مضامین و تصانیف سے فائدہ اوٹھایا ہے، اور اونھیں کی تصانیف ہر حیثیت سے مفید ثابت ہوئی ہین، آئیے سب سے پہلے ہم اُون کی تصانیف کی طرف نظر ڈالین۔

(۱) مولانا محمد حسین صاحب آزاد

(الف) عقلیات۔ .....

(ب) تاریخ { سوانح۔ .....
سیرۃ۔ .....
تاریخ — دربار اکبری

(ج) تعلیمات۔ ....

(د) سیاسیات۔ .....

(ہ) ادبیات۔ سخندان فارس، نگارستانِ فارس، آب حیات، نیرنگِ خیال، جانورستان، نصیحت کے کرن پھل۔

(و) سفرنامہ۔ سیر ایران۔

(ز) مکاتیب۔ مکتوبات آزاد۔

(ح) تراجم۔ ....

(۲) مولوی الطاف حسین صاحب حالی

(الف) عقلیات ....

(ب) تاریخ { سوانح۔ حیات جاوید، یادگار غالب، حیات سعدی
سیرۃ۔ ....
تاریخ۔ ....

(ج)۔ تعلیمات ....

(د) سیاسیات ....

(ہ) ادبیات۔ مقدمہ دیوان حالی، مقدمہ مسدس حالی،

(و) سفرنامہ ....

(ز)۔ مکاتیب ....

(ح)۔ تراجم ....

(۳) مولوی نذیر احمد صاحب۔

(الف) عقلیات۔ الحقوق والفرائض، الاجتہاد، مبادی الحکمۃ،

(ب) تاریخ { سوانح۔ اُمہات الامۃ
سیرۃ ....
تاریخ ....

(ج)۔ تعلیمات۔ مجموعۂ لکچرز۔

(د) سیاسیات۔ ....

(ہ) ادبیات { قصص مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ایامیٰ، ابن الوقت،
منتخب الحکایات، چند پند، فسانۂ مبتلا، مصائب غدر،

(و)۔ سفرنامہ ....

(ز) مکاتیب۔ مواعظ حسنہ۔

(ح) مترجمات............ ترجمہ قرآن مجید، اور تعزیرات ہند،

(۴) علامہ شبلی نعمانی رح

(الف) عقلیات۔ علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم

(ب) تاریخ
- سوانح ۔ المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق
- سیرۃ ۔ سیرۃ النبی صلعم
- تاریخ عام ۔ مضامین عالمگیری، جہانگیر، زیب النسا، کتب خانہ اسکندریہ، الجزیہ وغیرہ۔

(ج) تعلیمات۔ مسلمانون کی گذشتہ تعلیم، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی، تقاریر ندوہ، تعلیمی کانفرنس وغیرہ۔

(د) سیاسیات۔ مسلمانون کی پولٹیکل کروٹ وغیرہ

(ہ) ادبیات۔ شعر العجم پانچ جلد، موازنہ انیس ودبیر وغیرہ

(و) سفرنامہ۔ سفرنامہ مصر وروم وشام

(ز) مکاتیب۔ مکاتیب شبلی رح دو حصے

(ح) مترجمات۔ تاریخ اسلام

یہ فہرست خود آپکو بتائیگی کہ ہم نے مولانا کے وسعت مباحث، تنوع مضامین اور اختلاف موضوع کے متعلق جو دعویٰ کیا تھا، وہ سچ ہے یا نہیں، مولانا محمد حسین آزاد اردو نثر کے بہت بڑے محسن ہیں، اونھوں نے اردو نثر کے ساتھ بہت کچھ احسانات کئے ہین، اونھوں نے اردو مین ایک طریقۂ جدید کا اضافہ کیا ہے، رنگین عبارت اور خیالی تحریر کی اونھی نے بنیاد ڈالی ہے لیکن اگر کوئی شخص انکی پیروی میں تاریخ وفلسفہ لکھنا چاہے، تو کیا ہو وہ کہاں تک اس میں کامیاب ہو سکتا ہے، کہاں تک اون کے طرز تحریر اور اُن کی روح انشا کو باقی رکھ سکتا ہے، اس کا جواب پرستاران آزاد

کے یہاں شاید خاموشی کے سوا کچھ نہ ہو، ہم مولانا آزاد کو اُردو کے مصنفین مین بہت بلند درجہ پر سمجھتے ہین، اونھوں نے اُردو زبان کو علمی زبان بنانے کی کوشش کی، اس سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ اُردو میں نئے اسلوب بیان کو انھیں نے رائج کیا، لیکن پھر بھی اس حقیقت کو کوئی کیونکر نظر انداز کر سکتا ہے، کہ اونھوں نے اپنے اظہار خیالات کا جو طریقہ ایجاد کیا، وہ عام پسند ضرور تھا، لیکن اسکی تقلید ناممکن تھی، بعض لوگوں نے اس کی کوشش کی، لیکن وہ ناکامیاب ہوئے، اور انکا اختیار کردہ اسلوب اُنھین کیساتھ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا، اگرچہ اونکے پوتے جناب طاہر نے اس کی نقل اوڑانے کی کوشش کی ہے، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزاد کا منھ چڑھا رہے ہین۔ یہاں ایک لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح مرحوم آزاد نے ایک نیا رنگ اختیار کرکے تمام دنیائے اُردو کو اپنا مرید بنالیا تھا، اور ہر شخص اوس کی تقلید کی ناکامیاب کوشش کرکے اپنے کو برباد کرتا تھا، اوسی طرح زندہ آزاد (مولوی ابوالکلام صاحب) نے بھی الہلال مین ایک جدید طرز انشاء کو رائج کرکے نوجوانون میں اوسی طرز تحریر کی تقلید کا شوق پیدا کردیا ہے اور اس کورانہ تقلید نے اُردو کو اس قدر خراب کردیا ہے کہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے [۱]

مولوی حالی نے اپنے لئے سب سے آسان طریقہ یعنی سوانح نگاری اختیار کیا، اور اگرچہ اونھوں نے تین کتابیں لکھ کر ملک پر ایک بڑا احسان کیا ہے، اور لوگوں کو بتایا ہے، کہ سوانح لکھنے کا کیا طریقہ ہے، لیکن پھر بھی جب اُنکی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں، اور اُنکا مقابلہ مولانا شبلی کی تصانیف سے کرتے ہین، اُس وقت ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی اس حیثیت سے بھی کسقدر کم ہین، اصول تصنیف اور قوانین انشاپردازی مین وہ ان تین کتابوں میں ایک شخص نہیں معلوم ہوتے،

[۱] Sheikh Abdul Qadir's Modern Urdu Literature

اگر ایک طرف وہ حیات جاوید اس اعتقاد و گرویدگی کے ساتھ لکھتے ہین، جو خود اونکے بیان کردہ حالات کے مطابق اس شخص کی زندگی ہے، جس نے حالی کو اپنا بنالیا تھا،

آں دل کہ رم نمودہ از خوبرو جوانان

دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

یادگار غالب مین اونھون نے اس عزت و احترام کو پیش نظر رکھا ہے، جو ہر شاگرد کو اپنے اُستاد سے ہونا چاہیئے تھا، اور جوش مین اونھوں نے اپنے کو معلوم کہاں سے کہاں پھونچا دیا، اس کے بعد غریب سعدی کی باری آتی ہے، لیکن اُنکو وہ ایسے الفاظ مین یاد کرتے ہین، گویا کوئی معمولی آدمی ہے، اس کے علاوہ ہر قسم کے صحیح و غلط خیالات کو اس میں بھر دیا ہے۔ یادگار غالب اور حیات سعدی تقریباً اشخاص و حالات کے اختلاف کے علاوہ ایک ہی قسم کی تصنیفیں ہین۔ اس کے بعد مولانا کا مشہور مقدمہ پیش نظر آتا ہے، لیکن جب ہم اوس کو شعر العجم حصہ چہارم و پنجم اور موازنہ انیس و دبیر کے ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں، اسوقت بھی ہم کو مولانا شبلی کی بلندی، ہمہ گیری، فلسفیت و اعلیٰ تنقید کا قائل ہوجانا پڑتا ہے، ان کی تصانیف یہیں پر آکر ختم ہوجاتی ہین اور دوسرے مہتم بالشان مباحث اور موضوعون پر اون کا قلم ہماری رہبری کرنے سے عاجز نظر آتا ہی۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب افسانہ نویس کی حیثیت سے ملک مین روشناس ہوئے، ذہین آدمی تھے، عربی ادب میں کمال رکھتے تھے، لیکن باایں‌ہمہ اون مین کوئی گہرائی نہ تھی، وہ تنقید و فلسفیانہ اصول بیان سے واقف نہ تھے، وہ عام زبان کے اُستاد تھے، اور اسی میں اظہار خیال کی کوشش کی ہے لیکن جا بجا ٹھوکر کھاتے ہین اور اُنھوں نے افسانوں کے علاوہ جس چیز کو لیا ہے، اوس کو بنا نہین سکے ہین، اون کی

سب سے بڑی علمی و مذہبی خدمت قرآن مجید کا ترجمہ ہے، لیکن اوس مین جو طریقۂ بیان اونھوں نے اختیار کیا ہے، اوس کے متعلق اہلِ نظر اصحاب کی رائوں کی طرف ہم کو متوجہ ہونا چاہیئے، اس کے بعد ہی اون مین وہ اسپرٹ پیدا ہو گئی، جس نے اونکی بعض تصانیف کو اس قدر ناقابلِ برداشت بنا دیا کہ علماء کو اس کی تمام جلدوں کو برباد کر دینے کا فتویٰ دینا پڑا، ص۱

اب مولانا شبلی کو لیجئے، وہ جس میدان میں بھی قدم رکھتے ہین، معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ سے واقف ہین، اس کی ایک ایک خصوصیات سے آگاہ ہین، اوس کے اوصاف اور برائیوں کو جانتے ہین، اور اس کے بعد وہ اس پر مجتہدانہ طریقہ سے اظہار خیال کرتے ہیں، لکھتے وقت انکا قلم حدِ اعتدال سے نہیں بڑھتا وہ ہر شخص کی اوس کے قدر و منزلت اور مرتبہ کے مطابق عزت کرتے ہین، بزرگون کا نام احترام سے لیتے ہین، وہ پہلے شخص ہین، جنھوں نے تحقیق و تدقیق اور ریسرچ کو اُردو میں متعارف کرایا، اس کے ساتھ ہی اونھوں نے تاریخ عام، سوانح، سیرۃ، ادبیات، سیاسیات، عقلیات، تصوف، تعلیمات، فقہ اصولِ فقہ، حدیث، اصول حدیث، منطق وغیرہ پر اس کثرت سے مضامین لکھے اور کتابیں تصنیف کیں اور ان میں انشا پردازی کا وہ صحیح اور بلند ترین نمونہ پیش کیا، جسکی روشنی میں ہر شخص جس راستہ پر بھی چاہے بلا خوف و خطر سفر کر سکتا ہے، اور ملک نے حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ انھیں کی تصانیف سے فائدہ اوٹھایا ہے، اور اوٹھا رہا ہے، اب ہم اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں ذرا تفصیل سے بحث کرین گے،

علمائے ادب نے کسی نظم یا تحریر کے کمال و خوبی کے لیے متعدد اصول و قوانین بنائے ہین، اور اون مین بتایا ہے کہ کونسی تحریرین اور نظمین اعلیٰ، قابل تعریف،

ص۱ فلسفۂ اجتماع۔

ابتذال سے بری اور زیور خوبی سے آراستہ ہوتی ہین، اس حیثیت سے اونھون نے
ان قوانین کو دو شعبون مین تقسیم کیا ہے، فصاحت اور بلاغت، اب ہم انھین دو صولونکی
کسوٹی پر ان اربعہ عناصر کی تحریرون کو رکھ کر دیکھینگے، اور کھرے اور کھوٹے کی تمیز کرینگے۔

فصاحت | تحریر، تصنیف یا مضمون، بامعنی الفاظ کے مجموعہ کا نام ہے اسلئے ہر تحریر کی
خوبی، اور اوس کا حسن اسی میں ہے کہ اوس مین جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ کسی
صورت سے بھی ثقیل، نامانوس، غریب، اور قواعد صرفی کے خلاف نہ ہون، الفاظ
کی شیرینی، اون کی مانوسیت اور اون کی موسیقیت دراصل تحریر کے کمال کی دلیل ہے
اس لیے ہم کو دیکھنا چاہیے کہ فصاحت کی حیثیت سے کون ان چاروں میں سب سے بلند ہے
مولانا محمد حسین آزاد اگرچہ اس حیثیت سے بہت ممتاز ہین، اور اونکے متعلق کچھ کہنا چھوٹا
منھ بڑی بات ہے لیکن پھر بھی صداقت و انصاف ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم اس حقیقت کو
نہایت ادب کیساتھ عرض کر دین کہ اونھون نے بھی بعض جگہ غریب اور نامانوس
الفاظ استعمال کئے ہین، مثلاً سخندان فارس میں آپ کو یہ الفاظ ملینگے، کڈھب،
ڈکشنریان، گرمیر، لکچر، وغیرہ نیرنگ خیال میں، "گاڈز الکڑیسیٹی، فوٹوگراف،
سوسائٹی، گورنمنٹ، سیویلیزیشن وغیرہ، آب حیات میں، بلونٹ، ڈنر، انگلینڈ،
سرٹیفکیٹ، عرب العربا، شورا بورد وغیرہ۔

مولانا الطاف حسین حالی حضرت حالی اس حیثیت سے بہت بھٹکے ہین، اور
اونھون نے انگریزی الفاظ کے استعمال کے شوق مین اکثر جگھون پر اپنی عبارتوں کی
روانی، انکی خوبی، اور انکی سلاست مین سخت رکاوٹ پیدا کر دی ہے، اونھوں نے
جس قسم کے الفاظ استعمال کئے ہین، وہ یہ ہیں،
ورکس، لائف، ریمارکس، بیوگرفی، فزیکل، سرکل، ایمیجنیشن، سولیزیشن،
لٹریری، پوائنٹ چٹھیات، ڈپارٹمنٹ، اورینٹل، آرٹس، الیفلینٹ، گریجویٹس،

لیڈنگ آرٹیکل، وغیرہ اسی طرح مولانا نے عربی وفارسی کے غریب الفاظ بھی استعمال کئے ہین، لیکن چونکہ وہ بہت کم ہین، اسلئے ہم اون کو نظر انداز کر دیتے ہین،

ڈپٹی نذیر احمد صاحب اس حیثیت سے بہت زیادہ انگشت نما ہین، اور وہ اپنے زور بیان مین اس بات کا بالکل خیال نہین کرتے کہ وہ اظہار مطلب کے لیے جو الفاظ استعمال کر رہے ہین، وہ کہاں تک فصیح ہین، یا جو جملے بولتے ہین، وہ کس حد تک بلاغت کے درجے میں داخل ہوتے ہین، اونکی کوئی تصنیف کوئی تقریر یا خطوط کا مجموعہ اوٹھا کر دیکھئے، آپکو بھی یہ چیز صاف نظر آئیگی، اگر ان میں یہ چیز نہ ہوتی اور وہ خیالات کے رو کے ساتھ اس طرح نہ بہہ جاتے کہ دامن ادب اونکے ہاتھ سے چھوٹ جائے، تو وہ اس وقت اپنے موجودہ مرتبہ سے بھی بہت زیادہ بلند رہتے،[۱]

اب اسی حیثیت سے مولانا شبلی کو لیجئے اون کے یہاں آپ کو مشکل سے اس قسم کے الفاظ ملینگے، اور اگر وہ کبھی کوئی انگریزی لفظ بہت مشہور ہونے کی وجہ سے استعمال بھی کر دیتے ہین، تو قوسین مین اس کا مرادف اور اسی قدر بلیغ لفظ بھی لکھ دیتے ہین، فارسی اور عربی کا تو کوئی غیر مانوس، غریب، اور قلیل الاستعمال لفظ اون کی تمام تحریرین مین نہیں ملیگا، اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیئے، کہ ان اربعہ عناصر مین مولانا شبلی ہی صرف وہ بزرگ ہین، جنھوں نے سب سے زیادہ کتابیں اور مضامین لکھے اور وہ بھی بالکل متضاد مباحث پر اور اس حیثیت سے انکا صرف یہی ایک کمال اونکو بہت بلند کر دیتا ہے۔

ہم نے اوپر فصاحت کا صرف ایک اصول بتایا ہے، اس کے علاوہ اوس کا

---

[۱] اس کا بھی افسوس ہے، کہ ان کے کچھ اب زیادہ سے زیادہ ترجمۂ قرآن کے اشتہار ہوتے ہیں، پھیکے بے لطف، جنھیں نسبتہً کوئی جدت نہیں، دلچسپی نہیں، خیال کے ساتھ الفاظ کا ذخیرہ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ختم ہو چلا، (افادات مہدی ص ۴۶)

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ بعض الفاظ خود تو فصیح ہوتے ہیں، لیکن اونکو ایسے لفظوں کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے، یا عبارت میں ایسی جگہ پر لا دیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ غیر فصیح ہو جاتے ہیں، مثلاً مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں عہ

"اُن کے، دلوں کی آزادیاں، وقتوں کی مجبوریاں، مزاجوں کی شوخیاں، طبیعتوں کی تیزیاں، کہیں گرمیاں، کہیں نرمیاں، کچھ خوش مزاجیاں کچھ بے دماغیاں" لہ

"جبکہ فخر شعراے ایران شیخ علی حزین وارد ہندوستان ہوئے" سلہ

یا "جو فہمیدہ لوگ ہیں وہ اداے مطلب اور طرز کلام میں صفائی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں" سلہ

مولوی حالی صاحب بھی اس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کر گئے ہیں، مثلاً حیات جاوید میں تحریر فرماتے ہیں۔

"سرسید کے بیان سے مفہوم ہوتا تھا کہ اونکے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت میں کوئی ایسی خصوصیت .... نہیں پائی جاتی تھی" سلہ

یا "سلطنت کا کام صرف انکی حیات وممات کا رجسٹر رکھنا اور زندوں کو زندوں کے گھاٹ اور مردوں کو مردوں کے گھاٹ اوتار دینا اور بس"

یا "ادھر کرنجٹی سلطنت کی مقناطیسی کشش سے اپنی طرف کھینچتی ہے" ھہ

مولانا یادگار غالب کو ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں،

میرزا اسد اللہ خان، غالب المعروف بہ میرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ انشب ختم

عہ مولانا محمد حسین آزاد کی تصانیف میں بعض جگہ پنجابی اردو کی مثالیں بھی ملتی ہیں، مثلاً انھوں نے عامۂ خلائق خصوصاً اہل دہلی کی رفاقت اور رواج کار کا بیڑا اوٹھایا ہوا تھا" (آب حیات صـ ۲۶۹)

لہ آبحیات صفحہ ... سلہ آبحیات صفحہ ... سلہ آبحیات صفحہ ۳۶۵ سلہ حیات جاوید صفحہ ۳ ھہ حیات جاوید صفحہ ۲

ماہ رجب ۱۲۱۲ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے''[1]

اس عبارت کو پڑھکر ہم کو غالب مرحوم کے وہ اُردو اشعار یاد آتے ہین، جو صرف حروف ربط کو ہٹادینے سے فارسی اشعار ہوجاتے ہین،

یا "اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو اونکے قید خانے میں گذرے"

یا "برخلاف اس کے جن کی طبیعت مین ارجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے"

حیاتِ سعدی مین بھی اس قسم کی بہت سی غیر فصیح عبارتین موجود ہین،

مولوی نذیر احمد صاحب کے متعلق ہم اپنا خیال ظاہر کرچکے ہیں، لیکن اسلئے کہ ہمارا بیان بلا دلیل سمجھ کر رد نہ کردیا جائے، ہم اونکی تصانیف مین سے بھی اس قسم کی مثالین پیش کرتے ہین،

"مین انگریزی کا کلانوت نہیں ہون، عطائی ہون، ازبسکہ ہنوز نوعمری ہے اور کیرکٹر راسخ نہیں ہین، .... اگر تم نے اس کو بگڑنے دیا جن کے ذرائع اور سامان مدرسے میں بکثرت ہین''[2]

یا "اوندھے منھ سجدہ مین پڑے ہین''[3]

یا "سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ کی طرح مستحیل ہوتا ہے''[4]

یا "اوس کو خدا کے ساتھ عشق مفرط تھا، بس اوس کی رنجش متفرع تھی محبت پر''

یا "غرض یہ ہین حضرتِ انسان کے نہایت مختصر حالات مشتے نمونہ از خروارے"

ڈپٹی صاحب کی جس کتاب کو بھی دیکھئے، اس قسم کی ہزارون مثالین اون مین ملینگی، اور آج سے برسوں پہلے اون کی اس قسم کی تحریروں کو دیکھکر ہندوستان کے ایک انشا پرداز نے اُنکے متعلق لکھا تھا۔

---

[1] یادگار غالب [2] موعظہ حسنہ ص۲۰ [3] الاجتہاد ص۴۸ [4] الاجتہاد ص۲۱

"اور دہ پیوندکاریاں جوان کی شستہ رفتہ اور برجستہ اردو مین ہوتی ہین جس مین انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے عام خیال ہے کہ ثقل سے خالی نہین .... یہی جہ ہے کہ بعض حصے بلحاظ ترکیب وتحلیل اجزاے السنہ غیر گنگا جمنی ہوتے ہین"[1]

اب مولانا شبلی کو اس حیثیت سے دیکھئے تو بھی وہ سب سے بلند ہین، اور ان کی تحریر مین یہ کمال ہے کہ اگر اس کا ایک لفظ بھی بدل دیا جاوے تو اس جملہ کی تمام فصاحت خاک مین ملجائیگی، ہم اس حیثیت سے مولانا کی تحریروں مین سے متعدد مثالیں پیش کرتے ہین،

"شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے، اسلئے اس کی جامع ومانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کیجا سکتی"

اس ایک جملہ میں یہی خط زدہ چند الفاظ ہین، لیکن کیا آپ ان مین سے کسی کے مقابلہ مین بھی کوئی دوسرا لفظ کہکر اسی فصاحت کو قائم رکھ سکتے ہین،

یا "حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے، تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے، شیر گونجتا ہے، ہاتھی چنگھاڑتا ہے، کوئل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں"

یا "اور دنیا قالب بیجاں، شراب بے کیف، گل بیرنگ، گوہر بے آب ہوکر رہ جائے"

کیا فصاحت کی اس سے بہتر کوئی مثال ہوسکتی ہے، اور کیا باقی مصنفین اس قسم کا نمونہ پیش کرسکتے ہین،

بلاغت ہمارے علمائے معانی وبیان نے اس کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے، اس کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ مبتدا وخبر کو کس جگہ پر آنا چاہیئے، کہاں پر جملہ انشائیہ ہو اور کہاں پر خبریہ، لیکن اونھوں نے اس کے ساتھ عام تحریروں کی جو خصوصیات ہین، اونکو نظر انداز کردیا ہے، اسلئے ہم اور تحریروں کے لیئے اس قسم کے عام اصولوں

[1] افادات مہدی صفحہ ۲۰۹

کے فقدان میں اس قسم کا کوئی مقابلہ بہ مشکل کر سکتے تھے، لیکن خوش قسمتی سے ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے اُردو کے انشا پرداز نے اس کے لئے چند اصول مقرر کر دئے ہیں، اور ہم اونکی روشنی مین اپنی منزلِ مقصود تک پہونچنے مین کامیابی حاصل کرنے کی امید کر سکتے ہین وہ اصول یہ ہین۔

(۱) روانی، برجستگی اور شگفتگی،

(۲) فارسی الفاظ و فارسی ترکیبون کی خوشگوار آمیزش۔

(۳) ایجاز و اختصار۔

(۴) زور و جوش بیان

(۵) متانت و وقار۔

ان کے بعد ہم ایک چیز کا اور اضافہ کرنا چاہتے ہین، اور وہ بلاغت کا اہم نکتہ ہے، یعنی تحریر، جس شخص، واقعہ، اور مقام کے متعلق ہو، اس کے تمام جزئیات کا کامل لحاظ رکھا جائے، اگر ایسا کسی تحریر مین نہ ہو تو وہ تحریر بلاغت سے گر جائیگی۔

آئیے اب ہم ان اصولوں کے ماتحت دیکھیں کہ ہمارا پہلا دعوی کہ مولانا شبلی اس حیثیت سے بھی سب سے بلند ہیں، کہان تک حقیقت پر مبنی ہے، مولانا شبلی کی تصانیف متنوع کی طرف ہم بارہا اشارہ کر چکے ہین، اونھوں نے مختلف مباحث پر اظہار خیال کیا ہے، اور ہماری خوش نصیبی سے اون کی اس ہمہ گیری نے ہم کو اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم اون کی مختلف کتابون سے ایسی تحریرین پیش کر سکین، جو دوسروں کی محدود تصانیف میں قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی ہون، اور جن پر ان اتحادِ ثلاثہ میں سے کسی نہ کسی نے کچھ لکھا ہو، اس مقابلہ کے بعد ایک انصاف پسند شخص جس نتیجہ پر پہونچتا ہے اسکو ہمارے ایک محترم بزرگ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

"مولانا نے ہر قسم کے موضوع پر قلم اوٹھایا ہے، اونھوں نے بزرگانِ اسلام کے حالات

لکھے ہین، اونھون نے خلفاو اور سلاطین کی سوانح عمریان لکھی ہین، اونھوں نے علم کلام کے دقیق مسائل کی تشریح کی ہی، اونھوں نے شعراء کے حالات قلمبند کئے ہین، اونھوں نے شعراء کے کلام پر تنقید اور اون کا باہمی موازنہ کیا ہے، اونھوں نے یونانی منطق کی غلطیان نکالی ہین، اونھوں نے ترجمے کئے ہین، اونھون نے قومی، ملکی، سیاسی، غرض ہر قسم کے مضامین لکھے ہین، اور سب سے اخیر مین اُس مقدس زندگی کو اپنا موضوع قرار دیا ہے، جہان ایک مطلق العنان شاعر بھی مرعوب ہوکر پکار اُٹھتا ہی،

آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قلم را،

لیکن بااین ہمہ اختلافات و تنوع عبارت کی روانی مین کبھی فرق نہیں آنے پایا ہے، روانی اور بزرگوں کی تحریروں میں بھی موجود ہے، لیکن برجستگی ایک ایسا وصف ہے جو روانی عبارت کی آخری حد ہی، اور وہ مولانا کے سوا اور کسی بزرگ کی تحریر میں نہین پایا جاتا" [1]

اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ کیا مذکورہ بالا دعوی صحیح ہے، مولوی حالی، مولوی آزاد اور علامہ شبلی مین اگر کوئی چیز مشترک ہوسکتی ہے، تو وہ شاعری کے متعلق اظہار خیال ہی، تینوں نے شاعری کے اثر کے متعلق لکھا ہی، ہم تینون کو آپ کے سامنے پیش کرتے ہین،

مولانا محمد حسین آزاد۔

"صنعت گاہ عالم مین نظم ایک عجیب صنعت صانع الہی سے ہے اسے دیکھکر عقل حیران ہوتی ہے کہ اول ایک مضمون کو ایک سطر مین لکھتے ہین، اور نثر مین پڑھتے ہین، پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے ہین، تو کچھ اور ہی عالم ہوجاتا ہی، بلکہ اس مین چند کیفیتین پیدا ہوجاتی ہین،

(۱) وہ وصف خاص ہے جسے موزونیت کہتے ہین، (۲) کلام مین زور زیادہ ہوجاتا ہے، اور مضمون میں ایسی تیزی آجاتی ہے، کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے (۳) سیدھی سادی

[1] حیات شبلی مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی،

بات میں ایسا لطف پیدا ہوجاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں، اور مزے لیتے ہیں، اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم وغصہ یا کسی قسم کا ذوق یا شوق کا خیال دل مین جوش مارتا ہے اور وہ قوت بیان سے ٹکر کھاتا ہے، تو زبان سے خود بخود موزون کلام نکلتا ہے! جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے'' لہ

مولانا حالی تحریر فرماتے ہین،

''شعر کی تاثیر کا کوئی شخص انکار نہین کرسکتا، سامعین کو اکثر اوس سے حزن یا نشاط یا جوش یا افسردگی کم یا زیادہ ضرور پیدا ہوتی ہے، اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہی کہ اگر اس سے کچھ کام لیا جائے تو وہ کہاں تک فائدہ پہنچا سکتا ہی، بھاپ سے جو حیرت انگیز کرشمے اب ظاہر ہوئے ہین، اون کا سراغ اول اول خفیف حرکت میں ملتا تھا جو اکثر پکتی ہانڈی پہ چپنی کو بھاپ کے زور سے ہوا کرتی ہے، اسوقت کون جانتا تھا کہ اس ناچیز گیس مین جرار لشکروں اور زخار دریاؤں کی طاقت چھپی ہے'' سے

اب مولانا شبلی کی انشا پردازی ملاحظہ فرمائیے،

''شاعری کو جذبات ہی سے تعلق ہے، اسلئے تاثیر اوسکا عنصر ہے، شاعری ہر قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے، اسلئے رنج، خوشی، جوش، استعجاب، حیرت میں جو اثر ہے، شعر میں بھی وہی اثر ہوتا ہی مصورانہ شاعری اسلئے دل پر اثر کرتی ہی، کہ جو مناظر اثر انگیز ہین، شاعری اونکو پیش نظر کردیتی ہے، بادسحر کے جھونکے، آب روان کی رفتار، پھولوں کی شگفتگی، غنچوں کا تبسم، سبزہ کی لہلہاہٹ، خوشبوؤں کی لپٹ، بادل کی پھوہار، بجلی کی چمک، یہ منظر آنکھ کے سامنے ہو تو دل پہ وجد کی کیفیت طاری ہوجائیگی، شاعری ان مناظر کو بعینہٖ پیش کردیتی ہے، اسلئے اس کی تاثیر سے کیونکر انکار ہوسکتا ہے'' سے

انسانی معاشرت کی کل، فلسفہ اور سائنس سے نہین بلکہ جذبات سے چل رہی ہے......

لہ آبحیات صلا سے مقدمہ حالی صسیہ سے شعرالعجم حصہ چہارم ص۹۶،۹۹

"بچوں کا پیار، ماں کی ممتا، محبت کا جوش، غم کا ہنگامہ، موت کا رنج، ولادت کی خوشی، کیا ان چیزوں کو سائنس سے کوئی تعلق ہے، لیکن یہ چیزیں اگر مٹ جائیں، تو دفعتہً سناٹا چھا جائیگا، اور دنیا قالب بیجان ... شراب بے کیف گل بے رنگ، گوہر بے آب ہو کر رہ جائے"

"اسکے علاوہ مولوی آزاد، مولانا شبلی، اور مولوی حالی نے، تخئیل پر اظہار خیال کیا ہے، لیکن جو روانی، برجستگی اور شگفتگی مولانا کی تحریر میں موجود ہے، اس کا اون کی تحریروں میں صاف فقدان ہے"

مولانا محمد حسین آزاد۔

"شاعر کبھی ایک حجرہ میں تنہا بیٹھتا ہے، کبھی سب سے الگ اکیلا پھرتا ہے، کبھی کسی درخت کے سایہ میں تنہا نظر آتا ہے، اور اسی میں خوش ہوتا ہے، وہ کیسی ہی خستہ حالی میں ہو، مگر مزاج کا بادشاہ اور دل کا حاتم ہوتا ہے، بادشاہ کے پاس فوج و سپاہ، دفتر و دربار اور ملک داری کے سب کارخانے اور سامان موجود اس کے پاس کچھ نہیں، مگر الفاظ و معانی سے وہی سامان بلکہ اوس سے ہزاروں درجے زیادہ تیار کر کے رکھ دیتا ہے بادشاہ سالہا سال مین کن کن خطرناک معرکون سے ملک فتح یا خزانہ جمع کرتا ہے، یہ جب چاہتا ہے گھر بیٹھے دیدیتا ہے، اور خود پروا نہیں" [1]

مولوی حالی لکھتے ہین، [2]

"یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے، اور ماضی و استقبال کو اوسکے لئے زمانہ حال مین کھینچ لاتی ہے، وہ آدم اور جنت کی سرگذشت اور حشر و نشر کا بیان اسطرح کرتا ہے، کہ گویا اوس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہین، اور ہر شخص اوسس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے، جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہیے، اوس

---

[1] آب حیات صفحہ ۷۶، [2] مقدمہ حالی صفحہ ۳۲

ہین یہ طاقت ہوتی ہے، کہ وہ جن، پری، عنقا، اور آب حیوان فرضی اور معدوم چیزون کو ایسے معقول اوصاف کے ساتھ متصف کرسکتا ہے، کہ اون کی تصویر آنکھون کے سامنے پھرجاتی ہر جو نتیجے وہ نکالتا ہر اگو وہ منطق کے قاعدون پر منطبق نہیں ہوتے، لیکن جب دل اپنی معمولی حالت سے کسی قدر بلند ہوجاتا ہے، تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہین،،

اب دیکھیین کہ اسی مفہوم کو مولانا کس برجستگی اور شگفتگی سے ادا کرتے ہیں۔

،،شاعر کے عالم تخیل کا ذرہ ذرہ جاندار اور ہوش وعقل وجذبات سے بریز ہے آفتاب ماہتاب، ستارے، صبح، شام، شفق، باغ، پھول، پتے، سب اس سے ہمسز بانی کرتے ہین، سب اوس کے رازدار ہیں سب سے اس کے تعلقات ہین، وہ شب وصل اور صبح وصل سے خطاب کرتا ہے ....

،، عالم فطرت شاعر کے اثر میں ہے، وہ سب پر حکومت کرتا ہر اور اُنسے کام لیتا ہے، اسکو اپنے ممدوح کے تاج پر موتی ٹانکنے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو کارکنان فطرت کے نام احکام صادر کرتا ہر، افراد کائنات اس سے عجیب عجیب راز کہتے ہین،

اس عالم مین شاعری کی تاریخ زندگی عجیب دلچسپیون سے بھری ہوئی ہے بلبل نے اسی عالم مین اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہر، پروانے اس کے ہاتھ کے کھیلے ہوئے ہین شمع سے رات رات بھر وہ سوز دل کہتا رہا ہر نسیم سحری کو اکثر اوس نے قاصد بناکر محبوب کے یہاں بھیجا ہر، بارہا اوس نے غنچہ کی عین اسوقت پردہ دری کی، جب وہ معشوق کا تبسم چرا رہا تھا واقعات عالم پر جب وہ عبرت کی نظر ڈالتا ہر، تو ایک ایک ذرہ ناصح بنکر اسکو اخلاق اور موعظت کی تعلیم دیتا ہر، اس عالم مین وہ گور غریبان میں جانکلتا ہر، تو بوسیدہ ہڈیاں علانیہ اوس سے خطاب کرتی ہین...... قوت تخیل کے استدلال کا طریقہ علم استدلال سے الگ ہوتا ہر، وہ اون باتون کو جو اور طرح سے ثابت ہوچکی ہے، نئے طریقہ سے ثابت کرتی ہے یہ طریقہ استدلال گو ایک قسم کا منطقی مغالطہ ہوتا ہر، یا خطابیات پر مبنی ہوتا ہر، لیکن قوت تخیل کے عمل سے شاعر

اسکو اس انداز مین بیان کرتا ہے کہ سامع اس کی صحت و غلطی کی طرف متوجہ نہین ہو سکتا،
بلکہ اس کی دلفریبی سے مسحور ہو جاتا ہے، اور بیساختہ آمنا بول اٹھتا ہے" ۵۱
اسکے علاوہ دو مقاموں پر مولانا شبلی اور مولوی حالی کی اور تحریریں مقابلہ کے لائق ہیں، مولوی حالی۔

"جب کسی قبیلہ میں کوئی شخص شاعری میں ممتاز ہوتا تھا، تو اور قبیلوں کے لوگ اس قبیلہ کو مبارکباد دیتے تھے، اور سب ملکر خوشیاں کرتے تھے، قبیلہ کی عورتیں اپنے بیاہ کے زیور پہن پہن کر آتی تھیں، اور فخریہ اشعار گاتی تھیں، کہ ہم مین ایسا شخص پیدا ہوا، جو تمام قبیلہ کی ناک رکھنے والا، انکے نسب اور زبان کی حفاظت کرنے والا، اور ان کے کارہائے نمایان اخلاف و اعقاب تک پہنچانے والا ہے" ۵۲

اب آپ بلبل بلاغت کی زمزمہ سنجی کو دیکھئے۔

"عرب مین جب کوئی شاعر پیدا ہوتا تھا، تو ہر طرف سے مبارکباد کی سفارتیں آتی تھیں، خوشی کے جلسے کئے جاتے تھے، قبیلہ کی عورتیں جمع ہو کر فخریہ گیت گاتی تھیں، قبیلہ کی عزت وشان دفعۃً بلند ہو جاتی تھی، ایک ایک شعر ایک قبیلہ یا ایک شخص کا نام قیامت تک کے لئے زندہ کر دیتا تھا۔" ۵۳

ماہرین بلاغت خود اس بات کا اندازہ کر سکتے ہین، کہ "کوئی شخص شاعری مین ممتاز ہوتا تھا" اور "جب کوئی شاعر پیدا ہوتا تھا" مین کیا فرق ہے" اسی طرح ہر جملہ جس اہمیت کا اظہار کر رہا ہے، اس کا مولوی حالی کے یہاں کوئی پتہ نہین، دوسری مثال ملاحظہ ہو"

مولوی حالی۔

"مثنوی اصناف سخن مین سب سے زیادہ مفید اور بکار آمد صنف ہے کیونکہ غزل یا قصیدہ

---

۵۱ شعر العجم جلد ۴ صفحہ ۲۰۰ ۵۲ مقدمہ صفحہ ۲ ۵۳ شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۹۵

مین اس وجہ سے کہ اوّل سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہی، ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہوسکتی، مسدس مین وقت ہے کہ ہر بند مین چار قافیے ایک طرح کے اور دو ایک طرح کے لانے پڑتے ہین، پس اس مین مسلسل مضامین ایسی خوبی سے بیان کرنے کہ مطلب برابر بے کم و کاست ادا ہوتے چلے جائیں اور قافیوں کی نشست اور روزمرہ کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جائے، ہر شخص کا کام نہین، ترجیع بند بھی مسلسل مضامین کی گون نہیں ہی، کیونکہ اس مین ہر بند کے آخر میں وہی ایک ترجیع کا شعر بار بار آتا ہے، جو سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیتا ہے، ترکیب بند کے اگر تمام بندوں میں بیتوں کی تعداد برابر رکھی جائے تو بھی ایسی وقت پیش آتی ہی کیونکہ اس کے ایک بند مین ایک پوائنٹ عمدگی سے بیان ہوسکتا ہے، لیکن ہر پوائنٹ کی وسعت یکسان نہیں ہوتی، بلکہ کم و بیش ہوتی ہی، پس ضرور ہے کہ بند بھی چھوٹے بڑے ہون، ممکن ہے کہ ایک دو تین بند کا ہو اور دوسرا پندرہ بیس بند کا اور یہ بات اس تناسب کے برخلاف ہے جو شعر کا جزو اعظم ہی" الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں، اُن مین کوئی صنف مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں، ہی یہی وہ صنف ہے، جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دیجا سکتی ہے، عرب کی شاعری میں مثنوی کا رواج نہ ہونے یا نہ ہوسکنے کے سبب تاریخ یا قصہ یا اخلاق یا تصوف میں ظاہرا ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جاسکی، جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں ہیں"[۵۱]

اب بلیغ شبلی کو دیکھئے،

"انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید زیادہ وسیع زیادہ ہمہ گیر ہے، شاعری کے جس قدر انواع ہیں، سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہین، جذبات انسانی مناظر قدرت واقعہ نگاری، تخئیل، ان تمام چیزوں کیلئے

[۵۱] مقدمہ حالی ص۱۹۲-۱۹۳

مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا، مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ
.... یا کوئی قصہ
بیان کیا جاتا ہے، اس بنا پر زندگی اور معاشرت کے جسقدر پہلو ہین، سب اس مین آجاتے
ہین، عشق و محبت، رنج و مسرت، غیض و غضب، کینہ و انتقام، غرض جس قدر انسانی
جذبات ہیں، سب کے سماں دکھانے کا موقع مل سکتا ہے، تاریخ میں مختلف اور گوناگوں
واقعات پیش آتے ہیں، اسلیے ہر قسم کی واقعہ نگاری کا کمال دیکھا جا سکتا ہے،
مناظر قدرت، بہار و خزاں، گرمی و سردی، صبح و شام، جنگل و بیابان، کوہ و صحرا،
سبزہ زار وغیرہ کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے، اخلاق، فلسفہ، تصوف کے مسائل نہایت
تفصیل سے ادا کیے جا سکتے ہین،

"اس آسانی اور وسعت کی وجہ یہ ہے کہ مثنوی میں ہر شعر علیحدہ ہوتا ہے، اسلیے یہ پابندی
نہین ہوتی کہ پوری نظم ایک ہی قافیہ میں ادا کی جائے، جیسا غزل اور قصیدہ مین لازمی ہے،
مثنوی کے لیے اشعار کی تعداد بھی محدود نہیں ہے، اسلیے جسقدر وسعت دینا چاہین
دے سکتے ہین، مضامین کی بھی کوئی تخصیص نہین، رزمیہ، عشقیہ، تصوف، فلسفہ،
واقعہ نگاری، جو مضمون چاہین مثنوی میں ادا ہو سکتے ہیں"[۱]

اصحاب ذوق ان دونوں تحریرون کو دیکھکر خود فیصلہ کر سکتے ہین، کہ بلاغت کے
اس نکتہ کہ "جس چیز کو جس قدر پھیلا کر بیان کرنے کی ضرورت ہو اوسکو اسی قدر
پھیلانا چاہیئے، اور جس کے اختصار سے حسن پیدا ہوا، اُس کو اسیقدر کم کرنا چاہیے"
کی کس نے پوری پیروی کی ہے،

مولوی نذیر احمد صاحب میں اس قسم کی کوئی مثال پیش کرنا جو بلاغت کے
کسی اصول کے موافق بھی ہو، ایک سخت غلطی ہوگی، اون کی تمام عبارتین اس قسم کے

[۱] شعر العجم حصہ چہارم ص ۲۴۶

محاسن شعرا ہیں، ایک بہت بڑے مصنف و ناقد کا خیال ہے کہ مولوی نذیر احمد اور ابتذال مرادف ہیں، ہم نمونتہً یہاں پر اونکے صرف چند جملے پیش کرتے ہین آگے چلکر ہم اونکا مولانا شبلی سے بھی مقابلہ کر دینگے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ دونوں مین کس قدر بعد المشرقین واقع ہے اپنے متعلق ایک مذہبی کتاب میں لکھتے ہین،

"اسی اثنا میں اتفاق سے مجھکو تپ آنے لگی" اور مسہلوں تک نوبت پہونچی، علالت کی حالت مین مجھکو یہ خیال ہوا کہ اگر مین اس بیماری کی حالت میں مر گیا، تو کتنے کی موت مرا لہ "رتم اپنی ہستی کو کیوں بھولتے ہو، تو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کو تھ، کہان راجہ بھوج کہاں بھجوا تیلی"،[۲]

اپنی سب سے بڑی مہتم بالشان مذہبی تصنیف، الحقوق والفرائض کو جس مبتذل طریقہ سے شروع کیا ہے اس کا اندازہ اوس کے پہلے جملے سے ہو سکتا ہے۔
"وکسی نے کیا اچھی تلی ہوئی باؤں تولے پاؤ رتی بات کہی ہو کہ من عرف نفسہ عرف ربہ"[۳]

ہم اس قسم کی مثالیں دیکر ناظرین کا مذاق خراب کرنا نہیں چاہتے، اور آئندہ چل کر کسی مناسب موقع پر ہم اس کو شاید وضاحت سے بیان کر سکین۔

اب ہم کو بلاغت کی دوسری خوبی یعنی فارسی کی ترکیب کے استعمال کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے مولانا کو فارسی سے جو ذوق خاص تھا، اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، ایک مشہور انشاپرداز کی رائے ہے۔

"دنیا کی سب سے شیرین زبان یعنی فارسی شبلی کی خاص زبان ہے" انکو جس حد تک صحیح مذاق سخن ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہین، جو خود اہل زبان ہین، یا کم سے کم ذوق سلیم رکھتے ہین،

---

[۱] الاجتہاد صہ۹ [۲] الاجتہاد صہ۹ [۳] الاجتہاد صہ۵۵

جس طرح فارسی کے صحیح ادبی مذاق کا بہت بڑا حصہ آزاد کو ملا تھا، شبلی پر یہ شئے زیادہ اسکا خاتمہ ہو جائیگا، اس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں میں دیوان شبلی کو استشہاداً پیش کرنا چاہتا ہوں، شستہ، رفتہ کلام کی برجستگی، اپنا مرتبہ آپ بتائیگی، صاف معلوم ہوتا ہو کہ سچے جذبات میں ڈوبا ہوا شاعر خالص اہل زبان ہو جس کو ہند کی آب و ہوا تک نہیں لگی، اساتذہ کے ہزاروں اشعار نوک زبان اور روزمرہ اور محاورات کا ناخنوں میں ہونا، اضافی امور ہیں، جنکو شبلی کی بلند پایگی کے ثبوت میں پیش کرنا ایک متبدیانہ فعل ہوگا"[1]

مولانا میں اور مولوی آزاد میں فرق یہ ہے کہ مولانا نے اس سے صحیح کام لیا، اور آزاد اردو کو ہندی کے رنگ میں رنگنے کی کوشش میں اسکو اپنے ساتھ لے گئے، اور انکے یہاں نیز مولوی حالی صاحب کے یہاں اس قسم کی معدودے چند ہی مثالیں مل سکتی ہیں، لیکن مولانا شبلی کی جس تصنیف کو اوٹھا کر دیکھیے، اس قسم کی خوشنما ترکیبوں سے بھری ملیگی، ہم کو افسوس ہے کہ ہم تلاش کے باوجود بھی دوسروں کی تحریر سے اس قسم کی کوئی مثال نہ پاسکے، جس میں زور بیان، جوش، رنگینی، بلاغت موجود ہو، اس دعوی کا ثبوت مولانا کا یہ معجزانہ حصہ مضمون دیگا،

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئی ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہو جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جانفزا کیلئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی

---

[1] افادات مہدی صفحہ ۱۲۱ اور ۱۲۲

فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک،
توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجزہ طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، سب
اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں
آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے،
ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیان زبان میں لکھتے ہیں، کہ آج کی" رات ایوان
کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے۔ آتشکدہ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہو گیا
لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم اوج چین کے
قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر آتشکدہ کفر آذر کدہ
گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے،
شیرازہ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے
جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی ہدایت کی شعاعیں ہر طرف
پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا"[1]

اس ایک صفحہ کی تحریر سے ناظرین کو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ فارسی کی
کتنی خوشگوار ترکیبیں اور کتنے دل آویز استعارے مولانا کی زبان پر چڑھے ہوئے
تھے، اور وہ انکو جس طرح چاہتے تھے، نہایت ہی بے ساختگی و سہولیت کے ساتھ
استعمال کرتے تھے، اور ہمارے محترم مرحوم بزرگ مہاری حسن نے جو کچھ رائے قائم
کی ہے وہ کس قدر صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے، اس کے مقابلہ میں حالی اور نذیر احمد تو
خیر بیچارے اس دنیا کے آدمی ہی نہیں خود مولانا آزاد کے یہاں اس قسم کی کوئی
مثال نہیں ملتی، تاہم ہم کوشش کریں گے کہ تلاش کریں،

---

[1] سیرۃ النبی حصہ اول ص ۱۲۳

"دوسرے طبقہ نے خشکہ ھر کے میدان میں ملک سخن کو آباد کیا، پہلے زبان کی قدرتی طبیعت زمین شعر میں گل پھول کھلاتی تھی، اب زبانوں نے قدرت، فکروں نے پرواز، نگاہوں نے غور زیادہ پیدا کی، مشہور سخن آفرین، خاقانی، نظامی، انوری ہوئے، کلام نے لباس بدلا خیالات کا عالم بدلا عرب کے علوم ملک میں عام ہوگئے تھے، بلاغت کی کتابیں فارسی میں لکھی گئی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اول عرب کے الفاظ کا قبضہ زیادہ ہوا، پھر الفاظ و معانی کو صنائع و بدائع نے علمی رنگ دیا .... نثر کی تاریخ میں اِس کی توضیح کر چکا ہوں، پھر کر رکہتا ہوں، پہلے رنگِ گل اور نغمۂ بلبل کے بیان سے کلام میں بہار دکھاتے تھے اب شاہد گل کے رُخسار اور راشکِ بلبل کی آواز مضمون نکالنے لگے، اساتذہ مذکور نے اِس ایجاد کو خوب برتا اور ہمعصروں نے بقدر مراتب باوجود اس کے کہ اخلاقی خوبی ان باکمالوں کی اداے مافی الضمیر کی قدرت اور بیان کی صفائی تھی خاقانی ابتدائے رو نداد اور خاتمۂ مطالب کو نہایت خوبی اور تاثیر کے ساتھ نظم کرتے تھے، [1]

اس قسم کی ترکیبوں کی چند مثالیں ہم مولوی حالی صاحب کی تصانیف سے نقل کرتے ہیں،

"بہر حال جو لوگ اُردو شاعری کو ترقی دینا یا یوں کہو کہ اسکو صفحۂ روزگار پر قائم رکھنا چاہتے ہیں، اُن کا فرض ہے کہ اصنافِ سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً اِس اصول کو ملحوظ رکھیں کہ سلسلۂ سخن میں نئے اسلوب جہانتک ممکن ہو کم اختیار کیے جائیں"[2]

علاوہ جدّتِ مضامین اور طرفگی خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے

---

[1] سخندانِ فارس صفحہ ۳۰۰ ـ ۳۰۱ [2] مقدمہ حالی صـ ۱۵۲

کلام میں ایسی ہیں، جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں[1]

مولوی نذیر احمد صاحب کے یہاں تو ان چیزوں کا خیال ہی نہیں ہے، پھر بھی ہم انکی بھی ایک مثال پیش کر دیتے ہیں

"یہ مرتبہ خاصان خدا کا ہے کہ مصیبت میں بھی دل میں خدا کی طرف سے کسی طرح کی شکایت کا خیال نہ آئے۔ تاہم کوشش کرنی چاہیے کہ ؎

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست" خدا نخواستہ ہم کو دشمنی کرنے کے لیے نہیں پیدا کیا، اگر کوئی امر نا ملائم پیش آجاتا ہے تو وہ ہمارے کردار بد کا نتیجہ ہوتا ہے"[2]

ایجاز و اختصار بھی بلاغت کی ایک بڑی خوبی ہے مولوی محمد حسین آزاد چونکہ ہمیشہ خیالات کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں، اس لیے ان کو ہمیشہ وسعت ہی وسعت نظر آتی ہے، ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے بھی چونکہ اکثر خیالی فسانے لکھے ہیں اس لیے ان کو بھی اسکی طرف رجوع ہونے کی ضرورت نہ پڑی، مولوی حالی صاحب نے البتہ واقعات کے اندر رہ کر کچھ لکھا ہے لیکن انکی عبارت اس قدر سادہ اور یکساں ہوتی ہے کہ اس میں اس قسم کی مثالیں مشکل سے نظر آتی ہیں، لیکن مولانا شبلی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اس صنعت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اور ان مقامات پر بھی جہاں وہ بہت کچھ پھیل سکتے تھے، اختصار سے کام لیتے ہیں لیکن با این ہمہ ان کے جوش بیان اور زور میں کوئی فرق نہیں آتا، ہجرت کا واقعہ کسی قدر پر اثر ہے، لیکن اسکو اس مختصر تمہید سے شروع کرتے ہیں۔

"آفتاب کی روشنی دور پہونچکر تیز ہوتی ہے، نسیم گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بنتی ہے" آفتاب اسلام طلوع مکہ میں ہوا لیکن کرنیں مدینہ کے افق پر چمکیں"[3]

---

[1] یادگار غالب ص۹۵ [2] الحقوق والفرائض ص۶۱ [3] سیرۃ النبی۔

اسیطرح حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ کس قدر اہم اور مؤثر ہے لیکن اسکو کس اختصار کے ساتھ ادا کیا ہے اس کے ساتھ ہی واقعہ کا پورا زور اور پورا اثر قائم ہے۔

"حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے اور اُن کا دامن پکڑ کے فرمایا کیوں عمر، کس ارادہ سے آئے ہو، نبوت کی پرجلال آواز نے ان کو کپکپا دیا، نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ ایمان لانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ اللہ اکبر پکار اُٹھے، اور ساتھ ہی صحابہ نے ملکر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اُٹھیں" [1]

الفاروق کے خاتمہ میں حضرت عمرؓ کے رعب و وقار کا موازنہ کس اختصار کے ساتھ کیا ہے، لیکن اُنکے چند فقروں نے وہ زور پیدا کر دیا ہے جو صفحوں سے بھی شاید پیدا نہ ہوسکتا تھا۔

"سکندر و تیمور تیس تیس ہزار فوج ہمرکاب لیکر نکلتے تھے، جب انکا رعب قائم ہوتا تھا، عمر فاروقؓ کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا کچھ نہ تھا لیکن چاروں طرف غل پڑا ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آگیا ہے" [2]

آئیے اب اسکے مقابلہ میں ہم ان تین ہمعصروں کی تصانیف میں اس قسم کی مثالیں پیش کریں، لیکن ہم کو اقرار کرنا پڑے گا کہ اس اختصار کے ساتھ اُنکے یہاں کسی چیز کا وجود نہیں ہے، ایک جگہ ہم کو مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں اس قسم کی مثال ملتی ہے، جہاں اُنھوں نے ہندوستان کی موسمی حالت کا نقشہ کھینچا ہے لیکن اُنھوں نے اپنے خیال کی رنگینی میں تقریباً ۲ صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں لیکن مولانا شبلی نے اسی کو صرف ۷ سطروں میں ادا کر دیا ہے، ہم مولانا شبلی کی عبارت

---

[1] الفاروق۔ [2] الفاروق

نقل کرتے ہیں۔

"ایران ایک قدرتی چمن زار ہے، ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پر آب رواں، سبزہ زار، اور آبشاریں ہیں، بہار آئی اور تمام سرزمین تختۂ زمردین بن گئی۔ باد سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی لہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور، وہ سماں ہے، جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتا"[1]

اسی طرح حالی اور شبلی دونوں نے عشق و محبت کی ہمہ گیری کے متعلق اظہار خیال کیا ہے، مولوی حالی لکھتے ہیں۔

"محبت کچھ ہوا و ہوس اور شاہد بازی و کام جوئی پر موقوف نہیں ہے بندہ کو خدا کے ساتھ، اولاد کو ماں باپ کے ساتھ، ماں باپ کو اولاد کے ساتھ بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ، شوہر کو بی بی کے ساتھ، بی بی کو خاوند کے ساتھ، نوکر کو آقا کے ساتھ، رعیت کو بادشاہ کے ساتھ، دوستوں کو دوستوں کے ساتھ، آدمی کو جانور کے ساتھ، مکیں کو مکان کے ساتھ، وطن کے ساتھ، ملک کے ساتھ، قوم کے ساتھ، خاندان کے ساتھ، غرضکہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ و دلبستگی ہو سکتی ہے"[2]

اب مولانا شبلی کا اعجاز ایجاز دیکھیے کہ اس تمام عبارت کو انھوں نے صرف ایک جملہ میں ادا کر دیا ہے۔

"عشق و محبت انسان کا خمیر ہے، جہاں انسان ہے عشق بھی ہے"[3]

غریب نذیر احمد کے یہاں اس قسم کی کوئی مثال ہی نہیں ہے۔

آئیے اب ہم زور بیان اور جوش بیان کی طرف متوجہ ہوں۔

زور بیان کے لحاظ سے بھی مولانا شبلی کے مقابلہ میں کوئی شخص بھی گوئے سبقت نہیں لے گیا، مولوی محمد حسین آزاد اگرچہ عالم خیال میں نئے نئے باغ لگاتے ہیں

[1] شعر العجم حصۂ چہارم ص ۲۱۵ [2] مقدمہ حالی ص ۱۲۱ [3] شعر العجم حصہ پنجم ص ۳۳

اور اُن میں بہار و خزاں کے مؤثر مناظر پیش کرتے ہیں، لیکن چونکہ اُنکا تمام بیان ابتدا سے انتہا تک ایک ہی قسم کے رنگ میں ڈوبا ہوتا ہے، اس لیے مشکل سے پتہ چلتا ہے کہ کہاں پر اُن کے بیان میں زور پیدا ہوا ہے، مولوی حالی صاحب کے متعلق ہم کہہ آئے ہیں کہ وہ اس قدر سلیس، سادہ اور یکساں عبارت لکھتے ہیں، کہ اُنکے یہاں زور و جوش بیان کا کوئی نمونہ ہی سرے سے موجود نہیں ہے، مولوی نذیر احمد صاحب اپنے خیالات کی روانی میں اسکی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے لیکن مولانا شبلی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اگرچہ اُن کو واقعات کے اندر رہنا پڑتا ہے، لیکن پھر بھی جہاں کہیں جوش اور زور بیان کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں وہ زور پیدا کر دیتے ہیں کہ انسان اُچھل پڑتا ہے، مولوی آزاد نے اسلامی علوم و فنون کے وقت تاتاری خون ریزی کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

"دو شنبہ عرفارس کی زبان اپنے فرزندوں کے لیے سلیس اور فصیح قالب ڈھال رہی تھی، ایجادی قوتیں خیالات کی ہوا میں، پاک روحوں کی طرح اُڑتی پھرتی تھیں اور ظہور کا موقع ڈھونڈھتی تھیں، اس عالم میں ترکان چنگیزی کا قبضہ ملک پر ہو گیا، زبان کے لیے بڑا خطر تھا، خوش نصیبی تھی، کہ سر لاکھوں کٹ گئے، مگر زبان بچ گئی، وہ خونریز جاہل تھے، زبان تاتاری تھی، اور چینیوں سے ملتی جلتی لکیریں حرفوں کی بھی کھینچتے تھے، آج اُنکے تحریروں کے نمونے چاہو تو معدوم ہیں چنگیزی کی طبیعت میں قواعد و قانون کے ایجاد کی قوی طاقت تھی، طورہ (تورہ) چنگیز خانی کے کچھ کچھ ترجمے ہیں .... چنگیز خود ایک ملک گیر بادشاہ تھا اولاد کو ملک داری بھی کرنی پڑی، بلند ہمتیں ایران میں اپنی ناموری کے ایوان سجا رہی تھیں، تھیں، بلکہ سلطنت کی بنیاد مضبوط کرتی تھیں، وہ اس وقت ایران کے علوم و فنون کو سلطنت کا مؤید سمجھ کر ایرانی عالموں اور کاروانوں کی

پرورش کرنے لگا"[1]

اسی مضمون کو مولانا شبلی کا قلم یوں ادا کرتا ہے۔

"شاعری بلکہ تمام اسلامی علوم و فنون کا جوش شباب تھا کہ دفعتہً تاتار کی طرف سے اس زور کا طوفان اٹھا کہ دنیا کا شیرازہ بکھر گیا یعنی ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک بے چراغ کر دیا، کم و بیش چالیس لاکھ آدمی کا خون بہہ گیا، سیکڑوں ہزاروں شہر خاک کے برابر ہو گئے، مدارس اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، علمی خزانوں کا ایک ایک ورق اڑ گیا، لیکن اسلام کچھ ایسا سخت جان تھا کہ ان ہنگاموں پر بھی زندہ بچ گیا، بلکہ جوں ہی یہ طوفان تھمنا شروع ہوا، دبی چنگاریاں بھڑ چکیں، اور چمک کر اس طرح مشتعل ہوئیں کہ ایک دفعہ پھر۔

"عالم تمام مطلع انوار ہو گیا"

چنگیز خاں ایک غارتگری کی شان سے اٹھا تھا اور اپنے فوری اور سرسری انتظامات کے لیے اس قسم کے کچھ قاعدے بنائے تھے جو تورہ چنگیز خانی کے نام سے مشہور ہیں، لیکن جب سلطنت کو استقلال ہوا، تو شاہانہ نظم و نسق کی ضرورت پڑی، تاتاری لوٹ مار کے سوا کچھ نہ جانتے تھے، اسلیے مسلمانوں سے اعانت لینے کے سوا چارہ نہ تھا"[2]

اب ہم مولوی حالی اور مولوی شبلی کے زور بیان کو بتلاتے ہیں۔

مولوی حالی تحریر فرماتے ہیں۔

"کسی تقریب سے قاضی شہر کے گھر میں اُسکا گزر ہوا۔ اسوقت شیخ نہایت شکستہ حال تھا، اور مجلس میں تمام علما و فقہا کمال تزک و احتشام سے بیٹھے تھے اور شیخ سادگی سے

---

[1] مخزن فارس حصہ دوم صفحہ ۱۶۶ [2] شعر العجم حصہ سوم صفحہ ۲۰۱

سب کے برابر جا بیٹھا، خدام نے جھڑک کر وہاں سے اُٹھا دیا، اور مشکل سے پائین مجلس مین جگہ ملی، اسوقت کسی مسئلہ میں گفتگو ہو رہی تھی، اور کسی سے وہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا، شیخ نے دور ہی سے آواز بلند کیا، کہ اگر مجکو اجازت ہو تو اس باب مین مین بھی کچھ کہون، سب شیخ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور ایک کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پہ سب کو تعجب ہوا، شیخ نے اس مسئلہ کو نہایت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی صدا آنے لگی، قاضی نے مسند چھوڑ دی اور عمامہ سر سے اُتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔"

اب مولانا شبلی کے کمالِ ایجاز و جوش بیان کو دیکھیے۔

وہ ایک دفعہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے قاضی کے دربار میں گئے، اور اونچی صف میں جا کر بیٹھے، قاضی صاحب نے تیز نگاہوں سے دیکھا، اور میر دربار نے جو لوگوں کو حسب مدارج بٹھانے پر مامور تھا، اُنکے پاس آکر کہا۔

ندانی کہ برتر مقام تو نیست فروتر نشیں یا برو یا بایست،

بیچارے وہاں سے اُٹھ کر صف پائیں میں آکر بیٹھے، تھوڑی دیر کے بعد حسب معمول کسی فقہی مسئلہ پر بحث چھڑی اور ہر طرف سے شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں، لیکن کوئی شخص کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہتا تھا کہ سب اسکے سامنے سر جھکا دیں، شیخ کو اظہار کمال کا موقع ملا، پائیں سے للکار کر کہا،

کہ برہاں قوی باید و معنوی نہ رگہائے گردن بہ حجت قوی

لوگوں نے اُنکی طرف توجہ کی، اُنھوں نے اس خوبی سے اس مسئلہ کو سلجھا کر ادا کیا، کہ خود قاضی صاحب صدر مجلس سے اُٹھے، اور اپنی پگڑی اُتار کر سر پر رکھ دی"[1]

[1] شعر العجم حصہ سوم ص ۳۶-۳۷

سعدی کی گرفتاری، شادی، اور خانگی رنجش کو دونوں بزرگوں نے لکھا ہے، ہم اسکی ایک مختصر مثال پیش کرتے ہیں۔

وہ رئیس حلب کو اس کے حال پر رحم آیا، اور دس دینار دیکر شیخ کو قید فرنگ سے چھوڑا دیا، اور اپنے ساتھ حلب میں لے گیا، اسکی ایک بیٹی ناکتخدا (لاکدخدا) تھی شیخ کا نکاح سو دینار مہر مقرر کرکے اسکے ساتھ کر دیا، کچھ مدت وہاں گذری، مگر بیوی کی بدمزاجی اور زبان درازی سے شیخ کا دم ناک میں آگیا ایکبار اسنے شیخ کو یہ طعنہ دیا کہ آپ وہی ہیں، جبکو میرے باپ نے دس دینار دیکر خریدا ہے، شیخ نے کہا، ہاں بیشک میں وہی ہوں، دس دینار دیکر مجھے خریدا اور سو دینار پر آپ کے ہاتھ بیچا۔ [۱]

مولوی شبلی صاحب اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں۔

وہ دوست کو رحم آیا، فدیہ دیکر اُن کو چھوڑایا اور اپنے ساتھ حلب لائے، مزید عنایت سے سو اشرفی مہر پر اپنی بیٹی کے ساتھ شادی کردی ..... صاحبزادی نہایت شوخ اور زبان دراز تھیں، شیخ سے ہمیشہ اَن بن رہتی تھی، ایکدن کہنے لگیں، تم اپنی ہستی بھول گئے، تم وہی تو ہو کہ میرے باپ نے دس دینار دیکر تمکو چھوڑایا، شیخ نے کہا ہاں دس دینار دیکر چھوڑایا لیکن سو دینار کے عوض پھر گرفتار کرادیا۔ [۲]

غریب نذیر احمد نے بہت کچھ زور لگایا ہے، لیکن اُن کے یہاں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اب ہم ان صحاب سے الگ ہوکر خود مولانا شبلی کے زور بیان کے چند نمونے پیش کرتے ہیں، رسول مقبول (روحی فداہ) کی جامعیت ان الفاظ

---

[۱] حیات سعدی ص ۳۳ [۲] شعر العجم حصۂ سوم ص ۳۵

میں لکھی ہے۔

"لیکن اِسوقت تک دُنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے، اُسنے اِس قسم کے نفوس قُدسیہ جو پیش کئے ہیں، وہ فضائل و اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ و السلام کے مکتب درس میں صرف حلم وتحمل، صلح وعفو، قناعت وتواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت فرمانروائی کے لیے جو فضائل اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں اُن سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسےٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراقِ تعلیم میں عفو عام کے صفحے خالی ہیں، اِس بنا پر ہر ہر قدم نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی اور اِس لیے عالم انسانی اپنی تکمیل کے لیے ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا جو صاحب شمشیر ونگیں بھی ہو اور گوشہ نشیں بھی، بادشاہ کشورکشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہان بھی اور سبحہ گرداں بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریا دل بھی، یہ برزخ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفہ یزدانی، عالم کون کی آخری معراج ہے"[1]

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

"لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام بانیان مذہب جامعیت کبریٰ کے وصف سے خالی ہیں، انکے کارنامۂ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام ہی گئیں، جناب مسیح کی ۳۳ سالہ زندگی میں، صرف ۳ برس کے حالات معلوم ہیں، فارس کے مصلحان دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرت موسےٰ کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہوا ہے اسکا ذریعہ صرف موجودہ توراۃ ہے، جو حضرت موسےٰ سے

[1] سیرۃ النبی حصۂ اول ص ۲

۳۰۰۰ برس بعد عالم وجود میں آئی، یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ ان کے کارنامے اور اصولِ تعلیم ابدی نہ تھے، اسلئے نقل و روائت کے آئینہ میں جسقدر انکا ناتمام عکس اترا، اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا، قدرت خود ضرورت کی اندازہ دان ہے، اور جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ خود مہیا کر دیتی ہے"، [1]

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا تذکرہ ان موثر الفاظ مین کرتے ہین۔

"اب ایک طرف نود سالہ پیرِ ضعیف ہے، جس کو دعا ہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینین چڑھ چکی ہیں، اور ہاتھ میں چھری ہے،

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے، جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود مین پرورش پائی ہے، اور اب باپ ہی کا مہر پرورہا تھ اس کا قاتل نظر آتا ہے،

ملائکۂ قدسی، فضائے آسمانی، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشہ دیکھ رہے ہیں، اور انگشت بدنداں ہین، کہ دفعتہً عالم قدس سے آواز آتی ہے "یا ابراهیم قد صدقت الرؤیا انا کذلک نجزی المحسنین" [2]

طغیان ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیل درزیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم، اور جس حیرت خیز ثبات سے اپنے کو قربانی کے لئے پیش کیا، اس کا صلہ یہی تھا، کہ یہ رسم قربانی قیامت تک دنیا مین اس کی یادگار رہے"[3]

خانۂ کعبہ کی تعمیر کا ذکر اس شاندار طریقہ سے شروع کرتے ہین۔

"دنیا مین ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، ایران، ہند، مصر، یورپ مین عالم گیر اندھیرا تھا، قبولِ حق ایک طرف اس وسیع خطۂ خاک مین گز بھر زمین نہین ملتی تھی، جہان کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کلدان میں یہ صدا

[1] سیرۃ النبی جلد اول ص۲ [2] ایضاً ص۱۱۵

بلند کرنی چاہی، تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا، مصر گئے، ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا، فلسطین پہنچے، کسی نے بات تک نہ پوچھی، خدا کا جہاں نام لیتے تھے، شرک اور بت پرستی کے غلغلہ میں آواز دب دب کر رہ جاتی تھی، معمورۂ عالم کے صفحے نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے، اب ایک سادہ، بیرنگ، ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا ورق درکار تھا، جس پر طغرائے حق لکھا جائے، یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا، جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا تھا"۔[۱]

آپ نے حضرت عمرؓ کے سفر کا حال پڑھ لیا ہوگا، لیکن بلاغت کے اس اعجاز کو دیکھئے کہ جب فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ آتا ہے، تو الفاظ میں انوار نبوت کی جھلک پیدا ہوتی ہے۔

"سب سے اخیر کو کوکبۂ نبوی نمایاں ہوا جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا"۔[۲]

اگر مولوی حالی، نذیر احمد اور مولوی آزاد کی تمام تصانیف کے مقابلہ میں ہم صرف سیرۃ کی ایک جلد بھی انشا پردازی کے کمال کی حیثیت سے پیش کر دیں، تو وہ سب پر بھاری ہو جائے، لیکن صرف یہ دکھانے کے لیے کہ مولانا کی دوسری تصانیف میں بھی یہ وصف موجود ہے، ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔

عربی اور عجمی شاعر کے جذبات و مرتبہ میں جو فرق ہے، اس کو مولانا ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

"ایران میں عاشق اپنے آپ کو نہایت ذلیل و خوار سمجھتا ہے، اپنے آپکو معشوق کی گلی کا کتا کہتا ہے، اور اس پر بھی تسکین نہیں ہوتی، بلکہ اس کو بھی گستاخی سمجھتا ہے، ہر طرح کی ذلت و خواری اور بے قدری کو فخر خیال کرتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ

---

[۱] سیرۃ النبی ص ۱۱۱ ج ۱ [۲] ایضاً ص ۴۷۷

کمال عشق اسی کا نام ہے'

بخلاف اس کے عرب میں خودداری اور عزتِ نفس کے جذبات ہر حالت میں قائم رہتے ہیں' عرب کا عاشق طالب ہے' لیکن گدا نہیں' جانباز ہے لیکن غلام نہیں' آمادۂ مصائب ہے' لیکن ذلیل نہیں'' لہ

یا مثلاً "غرض ہر قسم کی علمی ایجادات اور اکتشافات پر پادریوں نے کفر و ارتداد کے الزام لگائے' تاہم چونکہ علمی ترقی کا ادھار تھا' ان کی کوششیں بیکار گئیں' اور علوم و فنون تکفیر ہی کے سایہ میں پھلے پھولے

پادریوں کے تعصبات اور وہم پرستی اگرچہ علم کو دبا نہ سکی' لیکن اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علمی گروہ نے پادریوں ہی کے خیالات اور اوہام کو مذہب سمجھا' اور اس بنا پر نہایت مضبوطی سے انکی رائے قائم ہو گئی' کہ مذہب جس چیز کا نام ہے' وہ علم اور حقیقت کے خلاف ہے' یہی ابتدائی خیال ہے' جس کی آواز بازگشت آج تک یورپ میں گونج رہی ہے'' ہے

"عباسیوں کے زمانہ میں اسلام کو جس خطرہ کا سامنا ہوا تھا' آج اس سے کچھ بڑھکر اندیشہ ہے' مغربی علوم گھر گھر پھیل گئے ہیں' اور آزادی کا یہ عالم ہے کہ پہلے زمانہ میں حق کہنا اس قدر سہل نہ تھا' جتنا آج ناحق کہنا آسان ہے۔ مذہبی خیالات میں عموماً بھونچال سا آ گیا ہے' نئے تعلیم یافتہ بالکل مرعوب ہو گئے ہیں' قدیم علماء عزلت کے دریچہ سے سر نکال کر دیکھتے ہیں' تو مذہب کا افق غبار آلود نظر آتا ہے'' سے

رنگینی عبارت میں اگر کوئی شخص مولانا کا حریف کہا جا سکتا ہے' تو وہ مولوی محمد حسین آزاد ہیں' لیکن اس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑیگا' کہ مولانا کی تحریروں میں

لہ شعر العجم حصہ ۴ ص ۲ الکلام ص ۱۳ سے علم الکلام ص ۳

روانی کے ساتھ جو متانت اور نزاکت پائی جاتی ہے، وہ مولانا آزاد کے یہاں مفقود ہے اون مین ظرافت، لطافت اور سلاست، سب کچھ پائی جاتی ہے، لیکن اون کے فقرون مین وہ زور، وہ اثر، وہ وزن اور وہ اوتار اور چڑھاؤ نہیں، جو مولانا کی ممتاز خصوصیت ہے، مثلاً مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"عالمگیر کے فرد جرم کا یہ سب سے اخیر نمبر ہے، لیکن اس کے دامن اوصاف کا سب سے زیادہ بدنما داغ ہے، اور جرائم کی نسبت عالمگیر کا ایک حامی کہہ سکتا ہے کہ اگر غیر سلطنتون کا تسخیر کرنا جرم ہے، تو مجرموں کی صف میں سکندر اور نپولین کو سب سے آگے کھڑا کرنا چاہیئے، اگر مرہٹون کی بغاوت کا دبانا گناہ ہے، تو پہلا مجرم شاہ جہان صاحبقران ثانی ہے، اگر راجپوت ریاستون پر لشکر کشی کرنا الزام ہے، تو فرد جرم مین سب سے اوپر اکبر اعظم کا نام ہونا چاہیئے، جس نے سب سے پہلے جے پور پر چڑھائی کی، اور اُس وقت تک اس ارادہ سے باز نہ آیا، جب تک راجہ زادیان تیموری حرم مین نہ آئین، اگر ہندوؤں کو بڑے معزز عہدے نہ دینا خلاف انصاف ہے، تو یورپ کی نسبت کیا کہا جائیگا، جس نے آج تک اپنی قوم کے سوا وزارت یا سپہ سالاری کے عہدے پر ممتاز نہیں کیا، لیکن عالمگیر کا حامی اس کا کیا جواب دے سکتا، کہ عالمگیر کے دامن پر بھائیوں کے خون کی چھینٹیں ہین اور اسکے مظلوموں میں خود اس کا نامور باپ شاہ جہاں بھی قید خانہ مین کڑیان جھیل رہا ہے، [۱]

آیئے اب ہم آخری دو شرائط کی طرف متوجہ ہوں اور دیکھیں کہ اوس میں بھی مولانا نے اپنے مرتبہ ادبیت کو قائم رکھا ہے یا نہیں متانت و وقار اور ہر شخص کے مرتبہ و حیثیت کا لحاظ رکھنا انشا پردازی کی جان ہے، ہر شخص کو ایک نظر سے دیکھنا نہ تو آداب اخلاق کے موافق ہے، نہ اصول بلاغت کے مطابق، دنیا میں مختلف مدارج اور

[۱] حیات شبلی مصنفہ مولوی عبدالسلام ندوی۔

حیثیات ہین کوئی بادشاہ ہے کوئی وزیر، کوئی صوفی ہے، کوئی عالم، کوئی شاعر ہی کوئی فلسفی، کوئی ولی ہے اور کوئی پیغمبر، کوئی گدا ہی اور کوئی رئیس، اسی طرح واقعات وحالات بھی مختلف ہیں، بعض خیالات ایسے ہوتے ہیں، جنکو علانیہ ظاہر کرنا غائت بلاغت ہے، لیکن بعض جذبات وخیالات ایسے ہوتے ہیں کہ اوس کے تصور سے خود متصور شرما جاتا ہی، اور اوس کا زبان پر لانا تو بڑی بات ہے، اس حیثیت سے بھی مولانا شبلی نے اپنے پوزیشن کو قائم رکھا ہے، اون کی عبارت میں ہر شخص اور ہر خیال کے متعلق جو الفاظ ملتے ہین، وہ ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور ممتاز ہوتے ہیں، لیکن دوسرون کے یہان یہ بات نہیں ہے، مثال کے طور پر اس واقعہ کو لیجئے کہ مثنویوں میں جہان بزم ووصال کے نقشے کھینچے جاتے ہین، اوس جگہ شاعر بہت بہکتے ہیں، اور جذبات کی عریانی سے خود انسان کو شرم آنے لگتی ہی،

مولوی حالی تحریر فرماتے ہیں

"رہی دوسری بات سو اس کا خیال تو ہمارے شعراء نے کبھی بھول کر بھی نہیں کیا، بلکہ جو باتیں بے شرمی کی ہوتی ہین، وہان اور بھی کھیل پڑتے ہیں، اور نہایت فخر کے ساتھ ناگفتنی باتوں کو کھلم کھلا بیان کرتے ہیں"[1]

اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں،

"اختلاط کے موقع پر جس بے تکلفی کے ساتھ معاملات کی تصویر اوس نے کھینچی ہے اس کی نسبت سوا اس کے اور کیا کہا جائے کہ، چور کی ماں گھٹنوں میں سر دے اور روئے"[2]

مولوی آزاد فردوسی کے مصور جذبات وفطرت ہونے کو یوں بیان کرتے ہیں

"یہ نہ سمجھنا کہ وہ حسن کا جوبن نہیں دکھا سکتا، اتنا ہی کہ اور شاعر بجا و بیجا

[1] مقدمہ حالی ص ۲۱۹، [2] مقدمہ حالی ص ۲۲۵

حسن و لوازمات حسن کے استعاروں سے کلام کو آلودہ کرتے ہیں، اور وہ اگر موقع پر کسی حسین کا ذکر کرتا ہے، تو اسکی کیفیت بھی دکھاتا ہے۔" لہ

اب مولانا شبلی کی باوقار اور متین تحریر ملاحظہ فرمایئے،

"ایشیائی شعراء کا عام قاعدہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حسن و عشق کا کہیں اتفاقی موقع آجاتا ہے، تو اس قدر پھسلتے ہیں اکہ تہذیب و متانت کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں، نظامی اور جامی جیسے مقدس لوگ اس حمام میں آکر ننگے ہو جاتے ہیں، لیکن فردوسی باوجود اس کے کہ اسکو تقدس کا دعویٰ نہیں ایسے موقعوں پر آنکھ نیچی کئے ہوئے آتا ہے، اور صرف واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ایک سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے" لہ

سعدی کی زندگی مولوی حالی کے اہم کارناموں میں ہے، لوح کتاب پر آپ کو "حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ" کا نام ملیگا، آپ کتاب کھولینگے، کہ اس میں ایک مقدس بزرگ کے حالات ایک مقدس رنگ میں قلمبند کئے ہیں، وہ سرسید اور غالب مرحوم کیلیے اپنی کتابوں میں ہمیشہ تعظیمی الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن آپ کے تعجب و ناامیدی کی کوئی انتہا نہ رہیگی، جب آپ دیکھیں گے کہ تمام کتاب میں حضرت سعدی کو اوس، وہ اور اس قسم کے دوسرے عامیانہ الفاظ سے یاد کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ قابل افسوس بات یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی کسی یوروپین مستشرق کا نام آگیا ہے، تو اس کی تعظیم کے لئے سروپا استادہ ہو جاتے ہیں، لیکن مولانا شبلی اس حیثیت سے بہت بلند ہیں مولوی آزاد بھی اس میں مولانا شبلی کے حریف اور مقابل کے ہیں، ہم اپنے ثبوت میں تینوں کی عبارت پیش کرتے ہیں مولوی آزاد لکھتے ہیں۔

"نام اس صاحب دل کامل کا مصلح الدین، باپ کا نام عبداللہ تھا، چونکہ اتابک

لہ سخندان فارس حصہ ۲ صفحہ ۲۷۹ لہ شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۴۹

سعد زنگی کی سلطنت میں ملکِ سخن پر اس کی فرمانروائی تھی، اس واسطے سعدی تخلص کیا تھا،[۱]

اب مولوی حالی صاحب کی تحریر ملاحظہ ہو۔

"اس کا نام شرف الدین، اور مصلح لقب، اور سعدی تخلص ہے . . . . .
چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا، اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے یہاں کسی خدمت پر مامور تھا، اسلئے اس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا"[۲]

اب مولانا شبلی کی تحریر سے ان کا موازنہ کیجئے، مولانا اسکو یوں ادا کرتے ہیں،

"مصلح الدین لقب، اور سعدی تخلص تھا، ان کے والد اتابک سعد بن زنگی بادشاہ کے ملازم تھے، اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا"[۳]

ہم نے کسی موقعہ پر ایک بڑے مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مولوی نذیر احمد اور ابتذال دو مرادف الفاظ ہیں، اب ہم اس موقع پر اوس کا ثبوت دینا چاہتے ہیں، اس سے ایک طرف تو ہمارا دعویٰ ثابت ہوگا، اور دوسری طرف مولانا شبلی کی تحریر کی خوبی ہمیشہ سے زیادہ واضح ہو جائیگی،

"ہجرت نبوی کا واقعہ کس قدر عجیب، اہم اور موثر ہے، مولوی نذیر احمد اس کو یوں تحریر فرماتے ہیں،

"خدا کا کرنا پیغمبر صاحب کو عین وقت پر معلوم ہو گیا، اندھیرے میں چپکے سے سٹک گئے"[۴]

ایک دوسری جگہ اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

"آخر دعوتِ اسلام کے چودھویں برس پیغمبر صاحب کو جان لیکر مدینہ بھاگ جانا پڑا"[۵]

[۱] نگارستان پارس صفحہ ۸ [۲] حیات سعدی صفحہ ۱۲-۱۳ [۳] شعر العجم حصہ سوم صفحہ ۱۸ [۴] الاجتہاد صفحہ ۴۱ [۵] الاجتہاد صفحہ ۴۳

اب آپ دیکھیں کہ مولانا شبلی اس واقعہ کو کس طرح ادا کرتے ہیں، لکھتے ہیں،

"کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا، اور رات زیادہ گذر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا، آنحضرت انکو چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا، اور فرمایا "مکہ! تو مجھکو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھکو رہنے نہیں دیتے،" لہ

ہم مولانا کی بلاغت کی تشریح کر کے اس مضمون کو طول نہیں دینا چاہتے، صرف مثالیں پیش کر دیتے ہیں، اور فیصلہ خود اصحاب رائے کے ہاتھوں میں ہے،

اسی طرح ہجرت حبش کا تذکرہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب اس طرح کرتے ہیں "پیغمبر صاحب نے اپنی خاندانی وجاہت کے بھروسہ پر جہاں تک ہوسکا ان نو مسلموں کی حمایت کی، لیکن نری وجاہت ایسے لوگوں کی عام شورش کے مقابلہ کیا کام آئے، جو ہر وقت مار کٹائی اور بیجر متی پر تلے رہتے تھے، آخر پیغمبر صاحب نے ان مسلموں کے تحفظ کے لیئے انکو نجاشی بادشاہ حبش کے یہاں چلتا کیا" کہ

علامہ شبلی کا قلم اس واقعہ کی تصویر ان پر روز الفاظ میں کھینچتا ہے،

"قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب باہم برس کر نہ کھلا، تو رحمتِ عالم نے جاں نثارانِ اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کی طرف ہجرت کر جائیں" سہ

قبیلۂ قریش نے حضرت شہنشاہ کونین کے ساتھ جو گستاخیاں کی ہیں، اون کو دونوں نے لکھا ہے، مولانا نذیر احمد صاحب

"وہ گرم مزاج لوگ بتوں کی تحقیر اور اپنے بزرگوں کی تجہیل کی تاب نہ لاسکے، بھڑوں کی طرح چھتوں سے باہر نکل پڑے، اور پیغمبر صاحب کے ساتھ گستاخی، اور بے ادبی، اور دشنام دہی اور موقعہ پا کر زد و کوب کا کوئی دقیقہ اوٹھا نہیں رکھا،" کہ

اسی واقعہ کو ایک دوسری جگہ یوں لکھا ہے،

لہ سیرۃ النبی جلد اول صـ ۱۹۸ کہ اجتہاد صـ ۲۹ سہ سیرۃ النبی صـ ۱۷۱ کہ اجتہاد صـ ۲۹۔

"اب تم ان حالات صحیح کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے انصاف تجویز کرو، کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعوئ رسالت کرکے کس مفاد کی توقع کرسکتے تھے، اسی دعوی نے تو اس کی یہ گت بنوائی تھی کہ

جھڑکی تو مدتوں سے مساوات ہوگئی | گالی کبھو نہ دی تھی، سو اب بات ہوگئی
باقی ہے مار کہانی تو سُن لوگے ایک دن | اس کی گلی میں اپنی بیاوقات ہوگئی

اسی دعوی نے انکو شہر بدر کرایا ......" [1]

علامہ شبلی کا بلاغت نگار قلم اس نازک فرض کو کس والہانہ شان سے ادا کرتا ہے۔

"خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے، جو اسلام کے مٹانے میں سب کے پیشرو تھے، وہ بھی تھے، جن کی زبانیں رسول اللہ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے، جن کی تیغ دستان نے پیکرِ قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلعم کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت کی ایڑیاں لہولہان کردیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آکر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے، جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹاکر سینوں پر آتشیں مہریں لگادیا کرتے تھے" [2]

ایک مشہور انشا پرداز نے مولانا کی اسی خوبی کی ان الفاظ میں داد دی ہے۔

"مولانا الفاظ کے انتخاب میں فرقِ مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں، یعنی جس شخص کی جو حیثیت ہوتی ہے، اسی کے مطابق انداز تحریر بھی بدل جاتا ہے ...."

[1] اجتہاد ص۸۳ [2] سیرۃ النبی حصہ اول ص۳۰۸

یہ مولانا کی خاص خصوصیت ہے جو اوروں میں بہت کم پائی جاتی ہے" [۱]

مذکورہ بالا صفحات میں ہم نے مولانا کو اونکے دوسرے معاصرین سے مقابلہ کرکے دکھایا ہے۔ اب ہم مولانا کی ان خصوصیات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو صرف اون ہی میں ہیں، اور جن کی مثال ان کے علاوہ اور کسی مصنف کی کتابوں میں نہیں ملتی،

مولانا کی ما بہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ بعض وقت کمال ایجاز میں صرف ایک لفظ یا ایک ترکیب یا جملہ سے وہ کام لیتے ہیں، جس کے لئے دوسروں کے یہاں صفحے کے صفحے شاید کافی نہ ہوں، یہ بلاغت کی معراج ہے، مثلاً مولانا کو یہ دکھانا ہے کہ دنیا عمر خیام کو رند سمجھتی ہے، نہ کہ صوفی، اسلئے اس کی شراب کے معنی بھی اب آتش سیال ہی ہے، اور اگر وہ صوفی تسلیم کرلیا جاتا، تو نہ معلوم اس لفظ کی کیا تعبیر ہوتی، جیسی کہ اکثر صوفیاء کے کلام کی ہوتی ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں،

"افسوس ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا، صوفی نہ تھا، ورنہ حافظ کی طرح یہی شراب شراب معرفت بن جاتی" [۲]

فردوسی نے اپنی عمر کا بڑا حصہ موعودہ انعام کے حصول کے لئے شاہ نامہ لکھنے میں صرف کردیا، لیکن محمود نے جیسا کہ عام بیان ہے، اشرفیوں کے بدلے روپیے دیئے، مولانا نے اس کو یوں لکھا ہے،

"فردوسی نے بڑی بیتابی سے دست شوق بڑھایا، لیکن سونے کے پھل کے بجائے چاندی کے پھل تھے؛ .... اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا، میں نے یہ خون جگر ان سفید دانوں کیلئے نہیں کھایا تھا" [۳]

اسی طرح مولانا کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے، کہ وہ بعض مصرعون یا آیتوں کو اس طرح اپنی عبارت میں ملا لیتے ہیں، کہ وہ کوئی اجنبی چیز نہیں

---

[۱] علی گڈھ میگزین ص۵۸ جولائی تا اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء [۲] شعر العجم حصہ دوم ص۱۴۳ [۳] شعر العجم ص۱۰۲

معلوم ہوتی، اور اون سے اوس تحریر میں زور اور وسعت پیدا ہو جاتی ہی، ہم اس کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں،

"اس واقعہ کا کانوں میں پڑنا تھا کہ گویا خدا کا قاصد آکر ایک ایک" کے کان میں وحی پھونک گیا، بچے، جوان، بوڑھے، جاہل، عالم، ارذل، شریف، نیک، بد سب یہی راگ گانے لگے، رفتہ رفتہ تقریر، تحریر، ضرب المثل، تلمیحات، افسانہ کوئی چیز اس سے خالی نہیں رہی، لیکن بالآخر تحقیق کی عدالت نے فیصلہ کیا ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ" [۱]

یا مثلاً "لیکن آخر یہ مسئلہ غور کے قابل ہے، کہ اس کی کیا وجہ ہو کہ شاہجہاں کے الزامات کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں، اور عالمگیر کے وہی الزامات افسانۂ بزم و انجمن ہیں" [۲]

یا مثلاً "تاہم غلط معلومات کا بادل جو آج سے کئی سو برس پہلے افق پر چھایا ہوا تھا، اب تک نہیں ہٹا، بہت سے بہت یہ ہوا کہ وہ کسی قدر ہلکا ہو گیا ہے، لیکن اب بھی اس قدر تاریکی ہے کہ اذا اخرج یدہ لم یکد یراہا....."

یا مثلاً "عالمگیر اس کے بعد دنیا سے اوٹھ گیا" اب یہ اوس کے جانشینوں کا کام تھا کہ ان اُڑتے ہوئے ذروں کو بھی فنا کر دیتے، لیکن خوبی قسمت سے تیمور کی مسند معظم شاہ کے ہاتھ آئی، اور بیدرد مورخوں نے نالائق اخلاف کا الزام بلند پایہ اسلاف کے نامۂ اعمال میں لکھا، اس سے بڑھ کر کیا ناانصافی ہوگی، کہ اب یہ حالت ہو کہ اسکول کا ایک ایک بچہ جس کے منھ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہو، عالمگیر پر نکتہ چینی کرنے کے لیئے طیار رہے، لیکن درحقیقت ان نادانوں کا قصور نہیں

ستم از غشوہ نمائیست کہ من میدانم

سر این فتنہ ز جائیست کہ من میدانم"

---

[۱] مضامین عالمگیر [۲] مضامین عالمگیر

خطوط دراصل انشائے لطیف کی صنف ہیں، اس میں بھی اگر غور سے دیکھا جائے اور اون کا موازنہ مکتوبات آزاد، مواعظ حسنہ، اور مولوی حالی کے طبع شدہ خطوط سے کیا جائے، تو وہ اس صنف میں بھی سب سے ممتاز نکلینگے، مولوی حالی نے یادگار غالب میں جہاں غالب مرحوم کے خطوط کے خصائص گنائے ہیں، وہاں سب سے زیادہ زور اس خصوصیت پر دیا ہے، کہ وہ خط اس طرح لکھتے تھے، گویا وہ مکتوب الیہ سے باتیں کر رہے ہیں، بزم احباب جمی ہوئی ہے، اور لوگ اونکی باتوں کا جواب بھی دیتے جاتے ہیں، مولانا شبلی میں اس خصوصیت کے علاوہ دوسری ضروری باتیں بھی موجود ہیں، ہم طوالت کے خوف سے صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں، مولانا کے عزیزوں اور دوستوں نے عرصہ سے اون کو کوئی خط نہیں لکھا تھا، اس پر وہ اپنے ایک عزیز دوست کو لکھتے ہیں۔

"مجلس"

"حاضرانِ مجلس"، مولوی محمد عمر صاحب، محمد سمیع، عبدالغفور، حمید، حافظ حسن علی صاحب، مولوی احمد اللہ،

باہمی گفتگو

بھئی کچھ سنا ہے؟ (محمد سمیع) خیر تو ہے، ہاں ایک تازہ واقعہ ہے، میاں شبلی کا انتقال ہوگیا (محمد سمیع) ارے سچ، نہیں جھوٹ ہوگا، ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا، اُنکا ایک خط میرے نام آیا تھا (مولوی محمد عمر صاحب) لو تم نے آج سنا ہے، ابھی اسکو تو کئی دن ہوئے اونھوں نے جو کتابیں بھیجی تھیں، اسکی رسید بھی تو میں نے اسی وجہ سے نہیں دی" (محمد سمیع) اناللہ! افسوس ابھی مرنے کے کوئی دن تھے، (حمید) ہاں واقعی سخت رنج ہے"

گر تقدیر سے کس کا زور چلتا ہے اور (دبی آواز سے) ارے میاں چلو قصہ پاک ہوا،
اچھے دن کی جگو مضمون سے دم ناک میں آ گیا تھا، بھلا روئداد تو خیر ایک بار کا کام تھا،
لکھ بھی لیا، اب روز بروز مدرسہ میں لڑکوں کو مسودہ لکھاتے پھرو،
اس پر طرہ یہ کہ ہفتہ وار مدرسہ کی رپورٹ لکھ کر انکے پاس بھیجتے رہو، اچھی خاصی بیگاری
بھگتا کرو، (عبدالغفور) ارے میاں خیر مرنا تو سب کے لیئے ہے، ہاں ان کے خط کا جواب
رہ گیا، اگر یہ بھی کوئی زبردستی ہے، جی نہ چاہے، تو مفت کی محنت کون گوارا کرے (حافظ
حسن علی صاحب) لو اب کی انکو خط لکھتے لکھتے رہ گیا، امتحاں کا حال لکھنا تھا، اور جو کچھ ہو،
آدمی تو مزے کا تھا، دو گھڑی کیفیت رہتی تھی، (مولوی محمد عمر صاحب) بھئی کیا کہیے۔
دل لگی ہی جاتی رہی، اور تو کس کام کا آدمی تھا، مگر ہاں ذرا جی بہل جایا کرتا تھا،
(مولوی احمداللہ) اجی جی کیا بہلتا تھا، دنیا بھر کی شکائتین ہوا کرتی تھیں کبھی انکی
نقل کی، کبھی انکا خاکہ اوڑایا، اور اس کے سوا انکا کام ہی کیا تھا، چلو اچھا ہوا

یار خوش قسمتی سے ایسے ایسے عزیز احباب ہاتھ آئے ہین

لوگ کہیں گے، کہ کیا حماقت کی ہے، مگر خدا کی قسم دل کی چوٹ، اور حضرات کی عنایت
کا پورا چربہ ہے، تمھیں انصاف کرو، خط کمبخت کونسا کام ہر مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا،
ش۔ نعمانی ۷ر فروری ۱۸۸۹ء"

مثلاً "کیا آپ واقعی یہان جلوہ فرما ہونگے، اور کیا درحقیقت ع

میرے ویرانہ میں ہو جائیگی دم بھر چاندنی"

نامہ والا کو بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں ع

سچ سچ بتا یہ حرف اونھین کے قلم کے ہیں

شبلی ۔ ۲۵ جون ۱۸۹۹ء"

مثلاً "میرا مضمون تم کہاں رکھ گئے، صفر کیلئے تم نے کچھ لکھا تھا یا نہیں اگر لکھا تھا

تو کہاں رکھ گئے، اس بے پروائی کے ساتھ تم جایا کرتے ہو کہ میں سخت پریشاں ہوں، محرم ہو چکا، صفر کا کچھ ساماں نہیں، نہ مجھ سے کچھ کہا، ہاں میں نے قران مجید پر جو کچھ لکھوایا تھا، وہ کہاں ہے"

اسی سلسلہ میں اگر ہم بعض اکابر کی رائے مولانا شبلی کی اُردو کے متعلق ظاہر کریں تو شاید وہ بے محل ورخالی از دلچسپی نہ ہو نگی، سر سید مرحوم نے المامون کا دیباچہ لکھا ہے، اس مین مولانا کی زبان کی ان الفاظ مین تعریف کی ہے،

"یہ کتاب اُردو زباں میں لکھی گئی ہے، اور ایسی صاف وشستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا"

اسی سلسلہ مین ہم کو مشہور انشا پرداز جناب مہدی حسن صاحب افادی الاقتصادی، کی رائے بھی پیش کرنی ہے، اون کا تقریبًا ہر مضمون ان فدائیان اردو کی تعریف سے مملو ہوتا تھا، لیکن مولانا شبلی کی انشا پردازی کے متعلق اُن کی خاص رائے تھی، اوس کو ہم اونھی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں،

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوئے خاصہ کی داد دیتی، جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اُٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا، کہ وہ اپنی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے، جوانیوں پر آئی ہوئی نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی، مدتوں شعرا سے گاڑھا اتحاد رہا، بہ اقتضائے سن بری طرح کھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے، اور بہتیرے بنائے بگاڑے، کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا لیکن، یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی، بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے، اور بال بال بچی، آخر اخیر میں ملک کے منچلے یعنی ناول تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اوٹھا نہیں رکھا، کبھی کبھی دبی زباں سے اسے یہ کہتے سنا "اری اوٹھ جاؤنگی میں صحنک سے"

لیکن دفعتہً اس کی حالت نے پلٹا کھایا، کثرتِ فواحش باعث سنجیدگی ہوگئی، اچھے دن آتے ہیں، تو بگڑی بن جاتی ہے، اب وہ مقدس علمار کی کنیزوں میں داخل ہے، لیکن سنا گیا ہے، خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے، اور قریب قریب انھیں کے تصرف میں رہتی ہے،، لے

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

"اردو لڑیچر کے پیدا کرنے والے تھوڑے ہیں، اس میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں، جو آج کل کے وسیع معیار قابلیت کے لحاظ سے اہلِ قلم کے صفِ اوّل میں شامل ہونے کے لائق ہوں، سرسید سے قطع نظر کے بعد جن کو باستحقاق اولیت کا فخر حاصل ہے، میرا خیال ہے شبلی بلحاظ فن ہندوستان نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں،، لے

غرضکہ مولانا شبلی انشا پردازی میں اپنے تینوں ہمعصروں سے بہت بلند تھے۔

(۲)

اُردو زبان کی مختصر تاریخ ہم ابتدار میں بیان کر آئے ہیں، مولانا شبلی اور اون کے ہمعصروں کے زمانہ میں اُردو کی جو کیفیت تھی، اور جس کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی، اس کا نقشہ آپ کے سامنے ہوگا، مولوی عبدالماجد صاحب بی اے، نے معارف کے ایک گذشتہ نمبر میں اون مصنفین کی ایک فہرست نہایت ہی جستجو و تلاش سے مرتب کر کے شایع کی تھی، جنکو اردو نثر کے قدما میں جگہ دیجا سکتی ہے، لیکن پھر بھی اُردو کا سرمایہ جو کچھ بھی تھا، وہ لاتعداد دیوان اور کلیات، متعدد افسانے اور تراجم، اور چند مستقل کتابیں تھیں،

لے افادات مہدی صٓ ۱۰۳-۱۰۴ ۔ لے افادات مہدی ص ۹۶

اُردو اس وقت بالکل اس قابل نہیں ہوئی تھی، کہ وہ تمام خیالات کو آسانی سے بیان کرسکے، سرسید مرحوم نے اس کام کو عملی حیثیت سے نہایت جوش و اخلاص سے شروع کیا، اس کے لئے اونھوں نے خود کتابیں لکھیں، علمی مجلس قائم کی، دوسرں سے ترجمے کرائے، اور کتابیں لکھوائیں، پھر بھی اون کی زندگی میں کچھ زیادہ نہ ہوسکا، زبان برسوں میں نہیں بنتی، اس کے لئے صدیاں درکار ہیں آیئے اب ہم دیکھیں کہ ان چار معزز مصنفیں میں اُردو کی خدمت سب سے زیادہ کس نے کی، اور کس کی تصنیفات سے ملک اور زبان زیادہ متاثر ہیں،

ہم نے ابتداء ہی مین ان چاروں مصنفین کی تقریباً تمام تصانیف کی فہرست دیدی ہے، اور اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ تصنیف و تنوعِ موضوع کے لحاظ سے بھی مولانا شبلی ہی سب پر فوقیت رکھتے ہیں، ہم آئندہ صفحات مین اسی چیز کو ذرا وضاحت سے لکھنا چاہتے ہیں،

مولوی محمد حسین صاحب آزاد، خیالی دنیا کے مالک تھے، اور جو کچھ اونھوں نے واقعات بھی لکھے ہیں، وہ عالم خیال ہی کے لکھے ہیں، اگرچہ اونکی کتابیں اُردو دنیا میں اس حیثیت سے خاص مقبولیت رکھتی ہیں کہ اُون کو اولیت کا فخر حاصل ہے لیکن پھر بھی اپنے عالم خیال میں کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں، دوسرے اون کی زبان مین یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اس میں علمی خیالات کا اظہار کیا جاسکے، فلسفہ، تاریخ فقہ، اصولِ فقہ، حدیث، اصولِ حدیث، سیرۃ، سیاسیات، تعلیمات، اور اس قسم کے متعدد موضوع ہیں، جن کے لیے اون کی زبان میں کوئی گنجایش نہیں، اور کوئی شخص بھی اپنی تمام کوشش کے باوجود اس میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا،

مولوی نذیر احمد صاحب کی زبان کا ہم ابھی مطالعہ کر آئے ہیں،

اور دیکھ آئے ہیں کہ اُردو کو بنانے کی جگہ اونھوں نے کس بری طرح بگاڑا ہی، اور اگر خدانخواستہ ملک میں ایک جماعت بھی اون کے مقلدین کی پیدا ہو جائے تو اُردو ادبیات کا خاتمہ سمجھئے،

مولوی حالی صاحب اس حیثیت سے علامہ شبلی کے حریف کہے جا سکتے ہیں، اونھوں نے اُردو زبان میں سلاست اور روانی ضرور پیدا کی، لیکن اوس کے ساتھ ہی اون کی تحریروں سے یہ صاف پتہ چلتا ہے، کہ وہ جدید خیالات کو اردو الفاظ میں پوری طور سے ادا نہیں کر سکتے، اسلیئے وہ ان کے لیے اکثر غیر زبانوں ہی کے الفاظ استعمال کر دیتے ہیں، اور اس طرح اون کی زبان غیر گنگا جمنی ہو کر رہ جاتی ہی، دوسرے اونکا دائرہ تصنیف بھی بہت محدود ہے، فلسفہ و منطق کو اونھوں نے ہاتھ نہیں لگایا، سیاسیات کے پاس بھی نہیں آئے، اور دوسرے علوم و فنون کے متعلق بھی ہم کو اُن کی تصانیف میں کچھ نہیں ملتا،

لیکن اب اس کے مقابلہ میں مولانا شبلی کو لیجئے اور دیکھیئے کہ اونھوں نے اُردو کو کس قدر فائدہ پھونچایا ہے، اور اس کو کتنا مالا مال کر دیا ہے، موجودہ علوم و فنون میں سے اکثر پر اون کی تصانیف یا کم از کم مضامین موجود ہیں، اس جگہ ہم ایک مرتبہ پھر "حیات نگار شبلی" کے الفاظ دہرانا چاہتے ہیں،

"مولانا شبلی نے ہر قسم کے موضوع پر قلم اُٹھایا ہی، اُنھوں نے بزرگانِ اسلام کے حالات لکھے ہیں، اُنھوں نے خلفا و سلاطین کی سوانح عمریاں لکھی ہیں، اُنھوں نے علم کلام کے دقیق مسائل کی تشریح کی ہے، اونھوں نے شعرا کے حالات قلمبند کئے ہیں، اونھوں نے شعرا کے کلام پر ریویو اور اونکا باہمی موازنہ کیا ہی، اونھوں نے یونانی منطق کی غلطیاں نکالی ہیں، اونھوں نے ترجمے کئے ہیں، اونھوں نے قومی، ملکی، سیاسی غرضکہ ہر قسم کے

مضامین لکھے ہین، اور سب سے اخیر مین اس مقدس زندگی کو اپنا موضوع قرار دیا ہو؛
جہاں ایک مطلق العنان شاعر بھی مرعوب ہوکر پکار اوٹھتا ہے ع

"آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قلم را" [۱]

اس کے علاوہ ہم یہ بھی دکھانا چاہتے ہین، کہ مولانا نے فلسفہ، تاریخ، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، تصوف وغیرہ پر بھی بہترین طریقہ سے قلم اُٹھایا ہو، اور اس کیلئے اُردو میں ایسا مواد جمع کر دیا ہو اور اُردو کے دامن کو ایسے گلہائے مضامین سے بھر دیا ہے، جس سے عرصہ تک اُردو کی فضا رہروانِ اُردو کی قوتِ شامہ کی مشام نوازی کرتی رہیگی، مولانا آزاد کے زمانہ تک قدیم اُردو طرز اد موجود تھا، چنانچہ اُونھوں نے اکثر جگہون پر اسی زبان مین لکھا ہے، تحریر فرماتے ہین۔

"سیر کرنے والے گلشنِ حال کے، اور دوربین لگانے والے ماضی اور استقبال کے، روائت کرتے ہیں، کہ جب زمانہ کے پیراہن پر گناہ کا داغ نہ لگا تھا، اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا، تو تمام اولادِ آدم مسرتِ عام اور بےفکری مدام کے عالم میں بسر کرتے تھے" [۲]

اسی طرح پرانے طرز پر بعض وقت مقفیٰ عبارتیں بھی لکھتے ہیں۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باتیں ہیں اور لطف یہ ہے کہ وہی کتابی حکایتیں ہین، جو نثر کی زبان ہو، وہی نظم کی شان ہو" [۳]

مولوی حالی صاحب بھی بعض وقت اسی طرز میں لکھتے ہیں۔

"بعض لوگون کا یہ خیال ہے کہ مرزا نے جو از راہِ شوخیِ طبع کے صاحب برہان کا جابجا خاکہ اوڑایا ہے، اور کہیں کہیں الفاظ نا ملائم بھی غیظ و غضب میں ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں، زیادہ تر اس وجہ سے مخالفت ہوئی" [۴]

---

[۱] حیاتِ شبلی [۲] نیرنگِ خیال حصہ اول ص۱۱، [۳] سخندانِ فارس ص۳۰۸ [۴] یادگارِ غالب ص۲۱

مولوی نذیر احمد کا سرمایۂ زندگی زیادہ تر افسانے ہیں، اگرچہ آخر میں اونھوں نے الاجتہاد، اور الحقوق والفرائض، لکھیں، لیکن اون کی زبان بھی اس قدر عامیانہ اور غیر فصیح ہے، کہ اس کو ہم اُردو کی خدمت نہیں، بلکہ اوسکی ہلاکت کہیں گے،

اب مولانا شبلی کی تصانیف کو لیجئے، مولانا کا اُردو پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اونھوں نے نہ صرف اردو کی اس قدامت کو دور کرنے کی کوشش کی، بلکہ ایسے جدید طرزِ تحریر کی ایجاد کی جو اردو کے لیئے ہمیشہ شمعِ ہدایت رہیگی، اونھوں نے ابتدا سے اپنی تصنیف میں اس بات کا خیال رکھا کہ قدیمی طرز ادا کو جس طرح بھی ہو سکے، فارسی طرزِ تحریر کی زنجیروں سے آزاد کیا جائے، اور اُس میں وہ توقع سے زیادہ کامیاب ہوئے،

اونھوں نے اُردو زبان کو اس لائق بنایا کہ اُس میں ہر قسم کی علمی، فنی، تعلیمی، سیاسی، مذہبی تصنیفیں کی جاسکیں، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم نہ ہونے پائے کہ یہ زباں ادائگی مطالب میں کسی زبان سے بھی غریب ہے، مولانا شبلی نے اس حثیت سے اُردو میں جو وسعت پیدا کی ہے، اور اونھوں نے جس کثرت سے اُردو کو علمی خیالات کا گھوارہ بنایا ہے، وہ ایسی خدمت ہے، جسے اُردو زبان کبھی بھی نہیں بھول سکتی، اور آج وہ اس قابل ہو گئی ہے کہ دنیا کی ہر علمی زبان کے مقابلہ میں ہر قسم کے خیالات، واقعات وجذبات کا اظہار کر سکے،

یہاں ہم نے جو کچھ لکھا، وہ اردو کی نثر کی اجمالی کیفیت تھی، اردو نظم مین بھی اُن لوگوں نے ایک نیا راستہ پیدا کیا، اور اس کو بھی ایک نئے سانچے میں ڈھالا، اُنکے پہلے تک فطری، قومی، علمی، معاشری، سیاسی، اور تاریخی شاعری کا رواج نہ تھا، اس حیثیت سے آزاد اور حالی کی خدمات بہت بلند ہیں، اور مولانا شبلی کے متعلق کہنا پڑتا ہے، کہ اگرچہ وہ اکثر حالات میں انکے حریف ہیں، لیکن بعض حیثیتوں سے

وہ اردو نظم مین آزاد اور حالی سے کم ہین، اگر ہم مولوی حالی کی مسدس کو پیش نظر رکھیں، تو ہم کو ماننا پڑیگا، کہ وہ اپنے عہد کی الہامی کتاب تھی، اس کی اشاعت کے ۲۵ - ۳۰ سال بعد تک ہم کو کوئی اسلامی مقرر ایسا مشکل سے ملیگا، جو اس مسدس کے اشعار سے حاضرین کو متاثر کرنا نہ چاہتا ہو، مولوی شبلی نے بھی اسی طرح کی ایک مثنوی "صبح امید" لکھی، لیکن وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی، بیچارے نذیر احمد یہاں بھی بہت محدود ہیں، لیکن نظم مین وہ نثر سے اچھے رہتے، یہاں یہ بھی ہم کو مولانا شبلی کی اس خصوصیت کو پیش کر دینا چاہیئے، کہ وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اُردو میں سیاسیات اور تاریخی واقعات کو موثر طریقہ سے نظم کا جامہ پہنایا، اور آج کا ایک بڑا طبقہ اوس کا تتبع کر رہا ہے، کشاف وصاف کے نام سے مولانا کی جو نظمیں الہلال وغیرہ میں شائع ہوئی تھیں، یا واقعہ کانپور، جنگ بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ پر اون کی جو نظمیں نکلی تھیں، اونھوں نے بعض حلقوں میں خاصی ہلچل ڈال دی تھی، یہاں پر ہم ایک بات اور واضح کر دینا چاہتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ علامہ شبلی غالب مرحوم کی طرح فارسی کو اپنے جذبات وخیالات کا ذریعہ بنانا ناپسند کرتے تھے، اور اون کے کلیات فارسی کے دیکھنے والے جانتے ہیں، کہ وہ اس حیثیت سے کس قدر بلند ہیں، اور اس میں اون کا کوئی ہمعصر مقابلہ نہیں کرسکتا،

مضمون طویل ہوگیا، اور بحث ختم ہونے کو نہیں آتی، لیکن اگر ہم اردو کی خدمت کے متعلق چند ضروری باتوں کی طرف توجہ مبذول نہ کرائیں، تو یہ مضمون نامکمل رہ جائیگا، اردو کی خدمت صرف تحریر و تقریر ہی کے ذریعہ نہیں ہوسکتی تھی، اوس کے لئے رسائل کی اشاعت، انجمن کا قیام اور مجالس کا انعقاد اور اس قسم کی بہت سی عملی چیزین بھی بہا ضروری ہیں،

اس حیثیت سے ہم نہایت زور دار الفاظ مین کہہ سکتے ہیں، کہ مولانا شبلی کا کوئی حریف نہین، علامہ شبلی نے اُردو میں علمی خیالات کی ترویج کے لئے الندوہ نکالا، اور اس کے ایڈیٹر رہے، اونھون نے انجمن ترقی اُردو کے ناظم کی حیثیت سے اردو کی توسیع و ترویج میں اپنی عمر کے متعدد بیش بہا سال قربان کر دئے، صوبہ متحدہ میں جب ہندی اُردو کا جھگڑا شروع ہوا، تو وہ پہلے شخص تھے جنھون نے اس کا سختی سے مقابلہ کیا، اور آخری دم تک عام مجالس و سرکاری حلقون مین اس کے متعلق کام کرتے رہے، سررشتۂ علوم و فنون کی نظامت کے زمانہ مین اونھوں نے دکن مین اُردو کی ترویج کے لیئے جو کام کیا، وہ ہمیشہ یادگار رہیگا، اور اپنے آخری دنوں میں "دار المصنفین" کو قائم کر کے خدمت اردو کی جو بنا ڈالدی ہے، وہ تاریخ اردو میں ہمیشہ انکو زندہ رکھیگی، یہ ایسا ایک سرچشمہ ہے، جس سے نہ صرف موجودہ نسلین سیراب ہوتی رہینگی، بلکہ آیندہ نسلون کی تشنگی کو بھی دور کر کے اون کے لیے آب حیات ثابت ہوگا، مولانا شبلی اس حیثیت سے بھی اپنے باقی ہمعصروں پر فوقیت رکھتے ہین، اور وہ یقیناً غیر فانی ہین، مہدی مرحوم نے انہی خصوصیات کو دیکھ کر لکھا تھا۔

"خاتم المصنفین شبلی نے ہمارے لئے کم و بیش ۵ ہزار صفحون کا ذخیرہ ادب چھوڑا ہے، یہ لٹریچر کی وہ قیمتی صنف ہے، جسے آجکل کی اصطلاح مین تنقیدات عالیہ (Higher Criticism) کہتے ہین، آپ لوہے کے چنے کہئے، اور میرا خیال ہے، اسلام کے متعلقات مین اتنا بڑا سرمایہ اور وہ بھی اس قدر کسی زبان میں موجود نہیں، شبلی میں ایک خاص طرح کا مادہ اختراعی تھا، وہ ایک ہی وقت میں اعلےٰ درجہ کے مورخ، اعلےٰ درجہ کے ناثر، اعلےٰ درجہ کے شاعر، غرض مشرقی زبانوں میں مختلف اصناف سخن کے پورے مالک تھے،

اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یورپ کے مستشرقین کی طرح انکا معیارِ تصنیف اتنا بلند تھا کہ میرا خیال ہے، سیکڑوں برس بعد بھی تصنیفات ٹکسال باہر نہ ہونگی، ایسا جامع حیثیات غالباً اب پیدا نہیں ہوگا" ۵ل

ایک اور موقع پر حالی اور نذیر احمد وغیرہ سے مقابلہ کرتے ہوے لکھتے ہیں۔

"مختصر یہ کہ آجکل کے مصنفین مین علامہ شبلی کو ایک خاص امتیاز فوقیت حاصل ہے، جو اونکے ہم عصروں کے حصہ میں نہیں آیا، ان کے سخت سے سخت حریفِ مقابل بھی انکی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہونچتے، بعضوں نے موضوعِ سخن ایسا اختیار کیا کہ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی، تو زیادہ جیتے معلوم نہیں ہوتے" نذیر احمد اپنی لائق رنگ عربیت کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی سے رہے، یا دش بخیر حالی نے مسدس کیساتھ مقدمۂ شاعری اور حیات جاوید لکھکر اپنا ٹھکانا کر لیا، لیکن شبلی قطعاً غیر فانی ہیں، آج ہزاروں صفحے اُن کے قلم سے نکل چکے ہین، اور جس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، کسی زبان میں اس سے بہتر مجموعۂ خیال موجود نہیں" ۵۲

ہم بھی حضرت مرحوم کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر کہتے ہیں، مولانا شبلی ہر حیثیت سے غیر فانی ہیں، اور اُن کی تصانیف اور کارنامے اپنی خاموش زبان سے کہہ رہے ہیں،

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

نجیب اشرف ندوی

۵ل افادات مہدی صفحہ ۲۵۸-۲۵۹ ۵۲ افادات مہدی صفحہ ۱۰۱

ضمیمہ نمبر ۱

سرسید مرحوم کی رائے

مولانا شبلی ۱۸۹۳ء میں سفرنامہ کی ترتیب میں مشغول تھے، کہ منشی سراج الدین احمد صاحب اڈیٹر انیسویں صدی نے سیرۃ الفاروق لکھ کر شائع کردی، چنانچہ سید صاحب نے اپریل ۱۸۹۴ء میں منشی سراج الدین احمد صاحب کی پیش قدمی کے متعلق حسب ذیل مضمون شائع کیا۔

"اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے، المامون، سیرۃ النعمان، کتبخانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں، اور اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ کہیں کہ "فاتوا بسورۃ من مثلہ" تو کچھ تعجب نہ ہوگا"[1]

ضمیمہ نمبر ۲

جرمن مستشرق کی رائے

علما اور مصنفین ہند میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ہے، اول مادہ تحقیق و تدقیق دوم جانچ پڑتال، سوم جدت، چہارم استحکام رائے، اور قوت استدلال علما و اور مصنفین ہند کا متخیلہ تو بیشک زیادہ زوردار ہے لیکن انہیں مبالغہ کی عادت ہے انکی تاریخی حکایات اور جنگی، افسانے مبالغے اور متضاد خیالوں سے پر ہیں برخلاف اسکے اہل مغرب کے دماغ منطقی استدلال اور موزوں اور درست الفاظ استعمال کرنیکے عادی ہیں۔ اہل مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں[2]

ضمیمہ نمبر ۳

علامہ شبلی کی تحریر اردو نثر کی معراج ہے (اقبال)

ضمیمہ نمبر ۴

زبان اردو کی خدمات

انجمن ترقی اردو

مولانا جبتک علی گڑھ میں رہے، ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے اپنے ضلع کے محدود رقبہ کے علاوہ کوئی عام قومی خدمت نہ کرسکے، ندوہ کی خدمات کیلئے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی لیکن خانگی مجبوریوں کی وجہ سے چند روز کیلئے حیدرآباد کی ملازمت پر مجبور ہوگئے، تاہم اب انکی عام قومی خدمات کا سلسلہ شروع ہوگیا جسکی پہلی کڑی انجمن ترقی اردو تھی، چنانچہ جب محمڈن کانفرنس میں اسکی بنیاد ڈالی گئی، تو سکرٹری شپ کے لیے مولانا کا انتخاب ہوا، اور مولانا نے ایک مدت تک اسکے فرائض ادا کیے، ہربرٹ اسپنسر کی کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ مولانا ہی کے زمانہ میں ہوا،

---

[1] حیات شبلی ص۲۶۵، الناظر

اسکے علاوہ اور بھی متعدد کتابوں کے ترجمے ہوئے لیکن مولانا کو جیسا کہ انکا خود بیان ہے، نظر آیا کہ وہ انجمن کا کام اپنے بلند معیار کے مطابق انجام نہیں دے سکتے، اسلیے انھوں نے اس عہدہ کو دیانت کے خلاف سمجھا، اور مستعفی ہو گئے،

ورناکیولر اسکیم کمیٹی الہ آباد اُردو کو ناگری ہونے سے بچایا

سنہ ۱۹۱۲ء میں الہ آباد گورنمنٹ نے ایک ورنیکولر اسکیم کمیٹی قائم کی تھی، جسکا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس ایسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اُردو و ہندی دونوں زبانوں میں ایک ہی عبارت و الفاظ کے ساتھ پڑھا جا سکے نیز اُردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی ضروری قرار دیا جائے مسٹر برن چیف سکریٹری نے اسکے متعلق ایک اسکیم مرتب کی تھی، جسکی دفعہ ۳ میں اس تجویز کی تائید میں حسب ذیل دلیل قائم کی تھی،

اُردو زبان اور ہندی زبان در اصل ایک ہی زبانیں ہیں، کیونکہ انکی گرامر متحد ہے اور جن زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے، وہ زبانیں در اصل ایک ہی ہوتی ہیں اس بنا پر ورنیکولر کورس ایسی مشترک زبان میں بننا چاہیے، کہ صرف رسم خط (کیرکٹر) کے فرق سے وہ اُردو اور ہندی دونوں میں پڑھا جائے،

لیکن ہندی زبان کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ اسکی نظم و نثر کی گرامر مختلف ہے اسکی ہندی نظم کی گرامر کی واقفیت اور عبارت کیلیے رامائن تلسی داس کورس میں داخل ہونی چاہیے ہندؤں کیلیے وہ لازمی کر دیجائے اور مسلمانوں کیلیے بھی اسکا پڑھنا مناسب ہوگا،

مولانا سے مرحوم بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے، اس موقع پر اردو زبان کے تحفظ و بقا کیلیے انھوں نے جو یادداشت مرتب کی تھی معارف میں شائع ہو چکی ہے،

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے نام

مکرمی تسلیم، میں اُردو ورنیکولر اسکیم کمیٹی کی شرکت کی غرض سے الہ آباد گیا تھا، مسٹر برن نے چند نہایت مضر تجویزیں اُردو کے حق میں پیش کی تھیں، ایک یہ بھی تھی، کہ رامائن بھاشا انٹرنس کے امتحان میں لازمی کر دیجائے اور اُردو جو مدارس میں ہے وہ ایسی کر دیجائے، کہ ہندی بن جائے، عجیب منطقی دلائل گھڑے تھے، پنڈت سندر لال وغیرہ کمیٹی کے ممبر تھے، تیسرے جلسہ میں کامل فتح ہوئی، تمام تجویزیں اڑ گئیں اگرچہ افسوس ہے کہ مسلمان ممبروں نے کوئی مدد مجکو نہ دی اور دیتے کیا، دینے کے قابل بھی نہ تھے،

"شبلی"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید۔ مولوی ظفر الملک اڈیٹر الناظر نے اپنے ایک مطبوعہ خط میں مجھسے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں ایک انعامی مضمون میں شرکت کروں جسکا عنوان یہ ہے:-

"آزاد، حالی، نذیر احمد اور شبلی مین سب سے بڑا انشا پرداز کون تھا اور سب سے زیادہ اُردو کی خدمت کس نے انجام دی" مجھے اپنے لایق دوست کے ارشاد کی تعمیل سے قبل یہ عرض کر دینا چاہیے کہ میں نے سیر المصنفین جلد دوم میں جو زیر طبع ہو اس قسم کے موازنوں اور محاکموں سے پرہیز کیا ہے۔ جہاں ان بزرگوں اور ان کے دیگر ہم عصروں کے حالات زندگی درج کئے ہیں اور ان کے اندازِ تحریر پر نقادانہ نظر ڈالی ہو وہاں ان کا آپس میں مقابلہ اور موازنہ نہیں کیا۔ صرف تاریخ نویسی کے اعتبار سے مولوی ذکاءُاللہ، آزاد اور شبلی کا کسیقدر موازنہ کر دیا ہے۔ دراصل ایسا موازنہ جسکی یہ صلائے عام یارانِ نکتہ داں کو دی گئی ہے، اگر مجھے معاف کیا جائے تو ایک بے جوڑسی بات ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک مصنف کی شاہراہ دوسرے سے جداگانہ ہے اور ہر ایک کا طرزِ تحریر دوسرے سے مختلف ہے اور لطف یہ ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں بے نظیر ہے۔ پس کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دینا ہرگز کسی اصولِ متعارفہ یا کسی اصولِ موضوعہ پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس سے ہم ایک مصنف کو اپنی نظروں میں محبوب اور
دلفریب سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اُسکے درجہ سے کم پایہ خیال کرتے ہیں۔ فی الحقیقت
مذاقِ صحیح ان سب میں خوبیاں دیکھتا ہے اور لطف اُٹھاتا ہے اور موازنہ کی خاردار
جھاڑیوں سے اپنے دامن کو اُلجھنے نہیں دیتا۔ انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے
کہ موازنہ ہمیشہ بدنما ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اپنے میلانِ طبعی کی بدولت ایک کو دوسرے پر
ترجیح دے سکتا ہوں اور دلائل بھی پیش کر سکتا ہوں لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ
سب آدمی میرے ہم خیال ہو جائیں اور میری رائے سے اتفاق کریں بلکہ زیادہ
تعداد ایسی ہوگی جو اختلافی پہلو لئے ہوگی۔ برخلاف اس کے اگر کسی مصنف کی تحریر
کے حسن و قبح پر نظر ڈالی جائے تو وہ ناظرین کو ہرگز برانگیختہ نہیں کر سکتی لیکن موازنہ
ایسی چیز ہے جو طبیعتوں میں جوش اور خروش پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ اخلاقی
مسائل پیش کرتا ہے جن میں بلاشبہہ بدنمائی کی جھلک پائی جاتی ہے اور انگریزی مثل
کی پوری پوری تطبیق ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس سے بھی انکار نہیں
کیا جا سکتا کہ مختلف مصنفوں کے درمیان محاکمہ کرکے اُن کے کارناموں کے جملہ
پہلوؤں پر تنقیدی نظر ڈالنے سے ادبی سرمایہ کی جانچ پڑتال ہوتی ہے اور بُرے بھلے
میں تمیز کرنے سے لوگوں میں مذاقِ سلیم کا مادہ پیدا ہوتا ہے جو ہر زبان کے لٹریچر کو وسعت
دینے کے لئے نہایت ضروری اور مفید شے ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ نسل کا یہ فرض بھی ہے
کہ وہ ایک باغبان کی طرح اُس گلشنِ ادب کی ضروری غور و پرداخت کرتی رہے جس کو
اُسکے بزرگ گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ و پیراستہ چھوڑ گئے ہیں تاکہ رطب و یابس کی
خاردار جھاڑیاں اپنی کثرت سے ان پھولوں کی نشو و نما میں حارج نہ ہوں اور انکو
ہمیشہ کے لیے پژمردہ نہ کردیں۔

مضمون مندرجہ عنوان کی دو شقیں ہیں۔ پہلی شق یہ ہے کہ ان چاروں میں

سب سے بڑا انشا پرداز کون تھا اور دوسری شق یہ ہے کہ ان میں سے کس نے اُردو کی خدمت سب سے زیادہ انجام دی؟ پہلے ہم جزوِ اوّل کو لیتے ہیں اور اُس پر اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اسکے بعد دوسرے جزو کی باری آئیگی۔

انشا پردازی کی تعریف

شاعری کی طرح انشا پردازی کی بھی یہی تعریف کی جاسکتی ہے کہ سُننے والوں اور پڑھنے والوں کے دل پر اثر پیدا کرے۔ اور اگرچہ وہ بلحاظ قوافی اور وزن کے موزون نہ ہو لیکن اُسکی روانی اور برجستگی میں فرق نہ آئے۔ اکثر مؤثر نثروں کو نظم کے ہم پلہ مانا گیا ہے بلکہ نظم کہا گیا ہے۔ چنانچہ کلام پاک کی عربی نثر، نظم قرآن کے نام سے موسوم ہے۔ فی الواقع اگر کلام بے اثر ہو تو اُس کا ہونا، نہ ہونا برابر ہے اور اس قابل نہیں کہ اُس کو کلام کہا جاسکے خواہ اُس میں ہزارہا صنعتیں اور رنگ آمیزیاں پائی جائیں۔

ایک مصنّف کے نزدیک "عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں لیکن محققین کی یہ رائے نہیں۔ وہ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں تاہم اُن کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے۔ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخئیل۔ ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر، شعر کہلانے کا مستحق ہوگا باقی اور اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسنِ بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔"

اسی طرح انشا پردازی میں بھی محاکات اور تخئیل لازمی ہیں۔ محاکات سے مراد کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اُس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے اور تخئیل سے مطلب ایک قوّتِ اختراع ہے یعنی وہ قوّت جس کا یہ کام ہے کہ اُن اشیاء کو جو مرئی نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں، ہماری نظر کے سامنے کردیے۔

ایک اَور مصنف لکھتا ہے:۔ ''غالباً اِس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اِس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اِسی ایک مقصد کے لئے کوئی الفاظ میں تراش خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی۔ کوئی کلام کی بنیاد متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر۔ کوئی سوچ سوچ کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اہلِ زبان کے محاورے اور روزمرے بہم پہنچاتا ہے۔ اِس طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کسی طریقہ پر۔ مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں''

''بے شک کلام کے مؤثر ہونے کے لیے اُس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضرور ہے مگر اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہوگا وہ مؤثر بھی ضرور ہوگا۔ کسی مصنف کے کلام میں جو تاثیر ہوتی ہے وہ درحقیقت اُس کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ ہوتی ہے اور اُسکے سیدھے، سادے اور معمولی الفاظ میں جادو کا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ تشبیہیں، استعارے، کنائے، تمثیلیں، تلمیحیں، بذلے اور لطیفے، کہاوتیں اور اشعار سب کچھ ہوں لیکن بے ساختہ پن نہ ہو تو کلام مؤثر نہیں ہو سکتا۔''

اِن دونوں مصنفین کے اقوال سے ہمارے نفسِ مضمون کے مطابق حسب ذیل نتائج مستنبط کیے جا سکتے ہیں:۔

(۱) ایک انشا پرداز کے لئے ضرور ہے کہ وہ محاکات میں کامل اور تخئیل میں فرد ہو یعنی وہ اپنے الفاظ سے کسی چیز یا خیال یا احساس کی ایسی تصویر کھینچ دے جو اصل سے بھی آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جائے اور سامعین پر یہ اثر ڈالے کہ یہ وہی چیز یا خیال یا احساس ہے جس کو لوگوں نے امعانِ نظر سے نہیں دیکھا تھا

یا اچھی طرح محسوس نہیں کیا تھا اور اس لئے اُس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

(۲) یہ انشا پرداز اُس وقت انشا پرداز کہلانے کا مستحق ہوگا جبکہ لوگ اس کی تحریر سے متاثر ہونگے یا بالفاظِ دیگر اس کا محاکات اور تخئیل میں کمال اُسوقت تسلیم کیا جائیگا جبکہ اُس کی دماغی کوشش بارآور ہو گی یعنی اُس کی تحریر سے ناظرین اثر پذیر ہوں گے۔

(۳) کسی کلام میں اثر اُس وقت پیدا ہوگا جبکہ لکھنے والا اپنے دل کی ترجمانی قلم کی زبان کے ذریعہ سے بے کم وکاست کریگا اور وہ خود راست باز اور حق گو ہو گا۔ الفاظ کی تراش، خراش یا سادگی یا تشبیہ واستعارات یا تلمیحات وغیرہ عوارض ومستحسنات ہیں لیکن کلام کی تاثیر ان باتوں پر مبنی نہیں ہے۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ان تینوں نتائج کے لحاظ سے ان چاروں بزرگوں کی تحریرات کہاں تک عہدہ برآ ہوتی ہیں اور پھر ان میں سے کون گوئے سبقت لیجاتا ہے۔

اس موقع پر یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ شاعروں کا موازنہ اُن کا ایک ایک شعر نقل کردینے سے آسانی ہوسکتا ہے کیونکہ اکثر ایک شعر میں جو مضمون شاعر ادا کرنا چاہتا ہے پورا ہوجاتا ہے یا کسی واقعہ کے متعلق دو چار یا زیادہ سے زیادہ دس بیس اشعار سے دونوں شاعروں کے کلام پر رائے زنی کی جاسکتی ہے لیکن برعکس اس کے انشاپردازوں کے پورے مضمون کو نقل کئے بغیر یہ منشا پورا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اِدھر اُدھر سے دس بیس سطروں کا انتخاب اُن کی انشا کے جوہر کو نمایاں نہیں کرسکتا تاوقتیکہ وہ مضمون جس پر اُنھوں نے قلم اُٹھایا ہے تمام وکمال آنکھوں کے سامنے نہ آجائے اور دل ودماغ اُسکے اثرات سے متاثر نہ ہوجائیں۔

پورے مضامین نقل کرنیکی ضرورت ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ چاروں بزرگ چاردانگِ ہند میں مشہور ومعروف ہیں اور ان کی کتابیں اور ان کے مضامین اپنی خوش ادائی اور دلفریبی سے لوگوں کو اپنا

گرویدہ کئے ہوئے ہیں۔ جو مضامین ہم نقل کرینگے اُردو خواں پبلک نے انھیں بارہا پڑھا ہوگا اور شاید اُس کے حافظہ میں بھی محفوظ ہونگے۔ لیکن ان مضامین کا ایک دُھندلا خاکہ اُس کے دماغ میں ہوگا اور موازنہ کی غرض سے غالباً اُس نے کبھی ان کو نہ پڑھا ہوگا۔ اس لئے ان مضامین کا اعادہ قند مکرر کا مزہ دیگا اور جو محاسن یا معائب ہم ان مضمونوں کے شمار کرائینگے، وہ سب پیشِ نظر ہونگے کسی دیگر کتاب کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔ پس ہم کو معاف کیا جائے اگر ہمارا مضمون، نقولِ مضامین سے طویل ہو جائے۔

سب سے پہلے ہم مولوی نذیر احمد کی کتاب توبۃ النصوح سے جو اُن کی بہترین تصنیف ہے نصوح کا خواب نقل کرتے ہیں جو اس کتاب کا سب سے عمدہ حصّہ ہے۔

نصوح کا خواب

"آنکھ کا بند ہونا تھا کہ نصوح ایک دوسری دنیا میں تھا۔ جو خیالات ابھی تھوڑی دیر پہلی اُسکے پیشِ نظر تھے سب اُسکے دماغ میں بھرے ہوئے تھے۔ اب متخیلہ نے ان کو اگلے پچھلے تصورات سے گڈمڈ کرکے ایک نئے پیرائے میں لا سامنے کھڑا کیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑی عمدہ اور عالیشان عمارت ہے اور چونکہ نصوح خود کبھی ڈپٹی مجسٹریٹ حاکم فوجداری رہ چکا تھا تو اُس کو یہ تصور بندھا کہ یہ گویا ہائی کورٹ کی کچہری ہے۔ لیکن حاکم کچہری کچھ اس طرح کا رعب دار ہے کہ باوجودیکہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا اجتماع ہے مگر ہر شخص سکوت کے عالم میں ایسا دم بخود بیٹھا ہے کہ گویا کسی کے منھ میں زبان نہیں اور جو کوئی بضرورت بولتا اور بات بھی کرتا ہے تو اس قدر آہستہ کہ کانوں کان خبر نہ ہو۔ اتنی بڑی تو کچہری مگر مختار اور وکیل کسی طرف دیکھنے میں نہیں آتے۔ کچہری کے عملے اس طرح کے کھرے اور اپنے حاکم سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کسی اہلِ معاملہ اور مقدمے والے کو اپنے پاس تک آنے کے روادار نہیں۔ غرض کیا مجال کہ کوئی اپنے بارے میں ناجائز پیروی

کر کے یا روپے پیسے کا لالچ دکھا کر یا سعی سفارش بہم پہنچا کر کاربرآری کر سکے۔
اگرچہ انصاف اور معاملہ فہمی اور ہمہ دانی کی وجہ سے حاکم کی ہیبت ادنیٰ اعلیٰ سب پر
چھائی ہوئی ہے مگر جتنے مجرم ہیں، کیا خفیف کیا سنگین، کوئی اس کے رحم سے
ناامید نہیں۔ اختیارات اُسکے اسقدر وسیع ہیں کہ نہ اُسکے فیصلے کی اپیل ہے،
نہ اُسکے حکم کا مرافعہ۔ کام کرنے کا ایسا اچھا ڈھنگ ہے کہ کام روز کا روز صاف،
کتنے ہی مقدمے پیشی میں کیوں نہ ہوں، ممکن نہیں کہ تاریخ مقررہ پر فیصل نہو جائیں
پھر یہ نہیں کہ کسی مقدمے کو رواروی اور سرسری طور پر تجویز کر کے ٹال دیا جائے
نہیں جو حکم صادر کیا جاتا ہے، ہر عذر کو رفع، ہر حجت کو قطع بلکہ خود مجرم کو قائل
معقول کر کے اور گنہگار کے منہ سے اُس کی خطا تسلیم کرانے کے بعد۔ غرض جو تجویز ہے
موجہ، جو فیصلہ ہے مدلل، جو رائے ہے حتمی و اذعانی، جو حکم ہے دودھ کا دودھ،
پانی کا پانی۔ گواہوں کے باب میں ایسی احتیاط ملحوظ ہے کہ صرف عادل، ثقہ اور
راست گو کی گواہی لی جاتی ہے اور وہ بھی ایسے کہ واقف الحال، چشم دید، بلکہ مجرم کے
رفیق اور ہم نشین کہ اُسکے رازدار اور معین و مددگار ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہے کہ ہر مجرم کو
فرداً فرداً فردِ قرارداد جرم کی ایک نقل دی گئی ہے کہ وہ اُس کو پڑھ رہا ہے اور
جتنے الزام اُس پر لگائے گئے ہیں، سب کو سمجھتا اور اپنے برارت کے وجوہات کو سوچتا ہے
کچہری کا خیال نصوح کو حوالات کی طرف لے گیا تو دیکھا ہر شخص ایک علیحدہ جگہ میں
نظربند ہے۔ جو جیسا مجرم ہے مناسب حالت حوالات میں سختی یا سہولت سے
ساتھ رکھا گیا ہے۔ حوالات کے برابر جیلخانہ ہے مگر بہت ہی بڑا ٹھکانا ہے۔ محنت
کڑی، مشقت سخت۔ جو اُس میں گرفتار ہیں سولی کے متمنی اور پھانسی کے خواستگار
ہیں۔ نصوح یہ مقام ہولناک دیکھتے ہی اُلٹے پاؤں پھرا۔ باہر آیا تو پھر
حوالاتیوں اور زیر تجویزوں میں تھا۔ اِن لوگوں میں ہزارہا آدمی تو اجنبی تھے

لیکن جابجا شہر اور محلّے کے آدمی بھی نظر آتے تھے مگر وہ جو مر چکے تھے۔ نصوح کو یہ سب سامان دیکھکر اسی خواب کی حالت میں ایک حیرت تھی کہ الٰہی یہ کون سا شہر ہے کس کی کچہری ہے، یہ اتنے مجرم کہاں سے پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میرے ہم وطنوں نے کیا جرم کیا ہے کہ ماخوذ ہیں اور یہ کیسے مرے تھے کہ میں ان کو یہاں جواب دہی میں دیکھتا ہوں۔ اسی حیرت میں لوگوں کو دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا کہ دور سے اسکو اپنے والدِ بزرگوار حوالاتیوں میں بیٹھے نظر پڑے۔ پہلے تو سمجھا کہ نظر غلطی کرتی ہے مگر غور کیا تو پہچانا کہ نہیں واقع میں وہی ہیں۔ دوڑکر قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا یا حضرت ہم سب آپ کی مفارقت میں تباہ ہیں، آپ یہاں کہاں۔

باپ۔ میں اپنے گناہوں کی جوابدہی میں ماخوذ ہوں۔ یہ مقام جو تم دیکھتے ہو دارالجزا ہے اور خداوند تعالیٰ جل وعلا شانہ اس محکمے کا حاکم۔

بیٹا۔ یا حضرت آپ تو بڑے متقی، پرہیزگار، خداپرست، نیکوکار تھے۔ آپ پر اور گناہوں کا الزام۔

باپ۔ گناہ بھی ایک دو نہیں، سیکڑوں، ہزاروں۔ دیکھو یہ میرا نامۂ اعمال کیسی رسوائی اور فضیحت سے بھرا ہوا ہے اور میں اسکو دیکھ دیکھ کر سخت پریشان ہوں کہ کیا جواب دوں گا اور کون سی وجہ اپنی برارت کی پیش کروں گا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو نصوح نے ہر شخص کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور اسکو دنیا کے خیالات کے مطابق فردِ قراردادِ جرم سمجھا تھا۔ باپ کا نامۂ اعمال دیکھا تو تھرّا اٹھا۔ شرک اور کفر اور نافرمانی، ناشکری اور بغاوت اور بے ایمانی، کبر و نخوت، دروغ و غیبت، طمع و حسد، مردم آزادی، نفاق و ریا، حبِّ دنیا کوئی الزام نہ تھا کہ اس میں نہ ہو۔ چونکہ نصوح کے دماغ میں خیالاتِ دنیوی گونج رہے تھے لگا باپ کے نامۂ اعمال میں تعزیراتِ ہند کا دفعہ اور ضمن ڈھونڈنے، سو تعزیراتِ ہند

کی دفعات کی عوض قرآن کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا، متعجب ہو کر باپ سے پوچھا کہ یا حضرت پھر کیا آپ ان تمام جرموں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ باپ۔ سب کا۔ بٹیا۔ کیا آپ حضورِ حاکم اقرار کر چکے ہیں۔

باپ۔ انکار کی گنجائش ہی نہیں، میری مخالفت میں گواہی اتنی وافر ہے کہ اگر میں انکار کروں بھی تو پذیرا نہیں ہو سکتا۔

بٹیا۔ جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت پر آمادہ ہیں۔

باپ۔ اول تو دو شخص کراما کاتبین اس بلا کے ہیں کہ میرا کوئی فعل اُن سے مخفی نہیں، جتنی باتیں کہتے ہیں سچ کی، اور کہتے کیا ہیں میرا روزنامچۂ عمری لکھتے گئے ہیں اب جو میں اسکو دیکھتا ہوں حرف بحرف صحیح اور درست پاتا ہوں۔ دوسرے یہی میرے اعضاء ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان وغیرہ کوئی میرے کہنے کا نہیں۔ سب کے سب مجھ سے منحرف، سب کے سب مجھ سے برگشتہ۔ میری مخالفت پر آمادہ میری تذلیل پر کمر بستہ ہو رہے ہیں۔

بٹیا۔ آخر آپ کچھ اس کی وجہ بھی سمجھتے ہیں۔

باپ۔ میں اِن کو غلطی سے اعوان و انصار، بھیدی، رازدار سمجھتا تھا مگر واقع میں یہ سب جاسوس ایزدی تھے اُنھوں نے وہ سلوک میرے ساتھ کئے کہ تسمہ لگا نہیں رکھا۔

بٹیا۔ پھر آپ کا کیا حال ہے۔

باپ۔ جب سے دنیا کو چھوڑا قبر کی حوالات میں ہوں، تنہائی سے جی گھبراتا ہے، انجام کار معلوم نہیں، شبانہ روز اِسی اندیشے میں پڑا کھُلتا ہوں۔ حوالات میں مجھ کو اِس قدر ایذا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مگر صبح و شام ہر روز آتے جاتے جیل خانے کے پاس سے ہو کر گزرنا ہوتا ہے۔ دوزخ وہی ہے وہاں کی تکلیفات

دیکھ کر اور سُن کر ہوش اُڑے جاتے ہیں اور غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ اے کاش ہمیشہ کے واسطے اسی حوالات میں رہنے کا حکم ہو جاتا۔

بٹیا۔ پھر ہنوز آپ کا مقدمہ پیش نہیں ہوا۔

باپ۔ خدا نہ کرے کہ پیش ہو۔ جو دن حوالات میں گزرتا ہے غنیمت ہے۔ اوّل وہل جب میں حوالات میں آیا تو اعمال نامہ مجھکو حوالہ کر دیا گیا۔ بس اسی کو دیکھتا اور انجام کار سے ڈرا کرتا ہوں نجات کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔

بٹیا۔ بھلا کسی طرح ہم لوگ آپ کی اس مصیبت میں کام آسکتے ہیں۔

باپ۔ اگر میرے لئے عاجزی اور خلوص کے ساتھ دُعا کرو تو کیا عجب ہے کہ مفید ہو ابھی میرے ہمسائے میں ایک شخص کی رہائی ہوئی ہے، اُس پر بھی بہت سے الزام تھے مگر جہاں اللہ تعالیٰ میں کامل درجہ کا انصاف ہے، رحم بھی پرلے ہی سرے کا ہے، اُس شخص کے پس ماندوں نے اُس کے واسطے بہت زاری کی تو پرسوں یا اترسوں اُس کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ تیرے افعال جیسے تھے وہ اب تجھپر مخفی نہیں رہے مگر ہمارے کئی بندے تیری معافی کے واسطے ہمارے حضور میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ تیرے ہی زن و فرزند ہیں۔ ہم کو تیری ہی ایک بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ تو نے اپنے خاندان میں نیکی اور دینداری کا بیج بویا، جا ہم نے تیری خطا معاف کی۔ بٹیا! سچ کہنا تم لوگوں نے بھی کبھی میرے حق میں دُعائے خیر کی ہے۔

بٹیا۔ جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت کچھ ہوا اور اب تک اِس شدّت کے ساتھ ہوتا ہے کہ گویا آپ نے ابھی انتقال فرمایا ہے اور یہ رونا تو ہم لوگوں کے دم کے ساتھ ہے، آپ کی عنایتیں، آپ کی شفقتیں جب تک جئیں گے یاد کریں گے رسم دنیا کے مطابق آپ کا کھانا بھی برادری میں تقسیم کر دیا ہے۔ لوگ شاید میرے مُنھ پر خوش آمد سے کہتے ہوں مگر کہتے تھے کہ اسی مہنگے سمے میں باپ کا کھانا اچھا کیا۔

دُعا کے بارے میں غلط بات کیونکر عرض کروں اہتمام نہیں ہوا۔ آپ کے بعد ترکہ و میراث کے ایسے جھگڑے پڑ گئے کہ آج تک نہیں سلجھے مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ تو صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے، کیا اعمال و افعال کچھ بھی کام نہ آئے۔

باپ۔ کیوں نہیں یہ اُن ہی اعمال کا طفیل ہے کہ تم مجھ کو اس حالت میں دیکھتے ہو ورنہ بہتیرے مجھ سے بھی زیادہ تکلیف میں ہیں، حوالات میں جیل خانے کی سی ایذا ہے مگر یہاں اعمال میں خلوص نیت شرط ہے۔ میں نے اپنے اعمال کو آکر دیکھا تو اکثر جیسے جھوٹے موتی، کھوٹے روپے۔ نمازیں بے حضورِ قلب اکارت گئیں اور روزے چونکہ پابندیِ رسم کے طور پر رکھنے کا اتفاق ہوتا تھا خالی فاقے کے شمار میں آئے۔

بیٹا۔ پھر اس دربار میں کچھ سعی سفارش کا دخل نہیں۔

باپ۔ استغفر اللہ! کوئی کسی کی بات تو پوچھتا ہی نہیں، نفسی نفسی پڑی ہے ہر شخص اپنی بلا میں مبتلا اور اپنی مصیبت میں گرفتار ہے، دوسرے کی نجات تو کوئی کیا کرائیگا پہلے آپ تو سُرخ رو ہولے۔

بیٹا۔ کیوں جناب! معاذ اللہ یہ شرک و کفر کا الزام آپ پر کیسا! ہم لوگ تو خیر، سارا شہر آپ کے اتقا کا معتقد تھا۔ کیا آپ خدا کے قائل نہ تھے؟

باپ۔ قائل تو تھا۔ دل سے معتقد نہ تھا۔

بیٹا۔ جناب آپ کے تمام اعمالِ ظاہر سے مستنبط ہوتا تھا کہ آپ کو خدائے کریم کے ساتھ بڑی راسخ عقیدت ہے۔

باپ۔ وہ تمام عقیدت معلوم ہوا کہ اوپری دل سے تھی۔ جب اوّل اوّل میرا اظہار لیا گیا تو پہلا سوال مجھ سے یہی پوچھا گیا کہ تیرا رب کون ہے؟ چونکہ مرتے وقت مجھکو ایمان کی تلقین کی گئی تھی میں نے جواب دیا کہ اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ۔ تب اسپر جرح کیا گیا کہ بھلا جب تو نوکری سے برخاست ہو کر گھر آیا اور مدت تک خانہ نشین رہا

اور جو کچھ کما کر لایا تھا سب صرف ہو گیا اور نانِ شبینہ کو محتاج ہو کر نوکری کی جست وجو میں اِدھر اُدھر پھرتا اور مضطر ہو ہو کر ہم سے دُعائیں مانگتا تھا مگر ہم تیرا صبر واستقلال آزمانے کے لئے تیرے مُدعا کو حیز التوا میں ڈالے ہوئے تھے اور ایک انگریز حاکمِ ضلع نے کہ وہ بھی مثل تیرے ہمارا بندہ تھا، ہمارے ایما سے تیری پرورش کا وعدہ کیا مگر ہم نے تجھپر اپنے ایما کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور تو یہی سمجھا کہ وہ تیری ہی کوشش کا نتیجہ تھا۔ سچ بتا کہ تجھکو اُس انگریز کے وعدۂ زبانی کا زیادہ آسرا تھا یا ہمارے تحریری تمسک وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُہَا کا ۔ اگر تو ہم کو صمیم قلب سے حاضر وناظر سمیع وبصیر وقادر جانتا تھا تو گناہ پر تجھکو کیوں کر جسارت ہوتی۔ تھی تو بھول کر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا، کبھی کھولتے پانی میں تو تُو نے ہاتھ نہیں ڈالا ۔ کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا مگر تو گناہوں کا نہایت بے باکی سے مرتکب ہوتا تھا ضرور ہے کہ یا تو تجھ کو ہمارے فرمانے کا یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتشِ دوزخ ہے یا اگر یقین تھا تو تو اُس کو دنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ۔ جو کچھ عیش وآرام ہم نے تجھکو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا کیا تو نے اُسکو ہمیشہ اپنی حسنِ تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا، جو تکلیف تجھکو دنیا میں پہنچی اگرچہ تو اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارا کرتا تھا مگر کیا تو اُسکا الزام ہماری ذات مجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا ۔ اے احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھپر کیے اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا اے ناشکرا بے شمار نعمتیں میں نے تجھکو عطا فرمائیں مگر تجھپر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا، اُتنا ہی تو میری مخالفت پر کمربستہ رہا۔ جتنی میں تیری رعایت کرتا رہا اُسی قدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا۔ اس حیات بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر لے چلا تھا۔ اس

چند روزہ زندگی پر تو اس قدر مغرور تھا کہ دائرۂ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے تجھکو نیست سے ہست کیا اور خلعتِ انسانیت سے سرفراز بنایا، جو تجھ کو درکار تھا سو دیا، جس کا تو حاجت مند تھا سب مہیّا کیا، ہر حال میں تیرے حافظ، ہر کیفیت میں تیرے نگہبان رہے کیا اس واسطے کہ تو کبھی بھولکر بھی ہماری طرف توجہ نہ کرے اور ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہم سے جدا رکھے۔ جب تو ایک مضغۂ گوشت تھا، ضعیف ولاعقل، نادان وجاہل، ضعیف اتنا کہ نقل وحرکت پر قادر نہیں، نادان ایسا کہ خویش وبیگانے کا امتیاز نہیں، ہم نے تجھکو دودھ پلوا پلوا کر توانا کیا اور اپنے بندے جو تجھ سے ہر طرح کا شرف رکھتے تھے یعنی تیرے ماں باپ تیری خدمت گذاری پر مقرر کئے اور اُن کے دلوں میں محبت ڈال دی کہ انھوں نے ہمارے حکم سے تجھکو پالا پوسا اور تو روز بروز چونچال اور خوش حال ہوتا گیا، پھر ہم نے عقل کو تیرا اصلاح کار بنایا تو اُس کی مدد سے اپنی آسائش جائز کے واسطے ہر طرح کا سامان بہم پہنچائے۔ دنیا کے چرند، پرند، حیوانات، نباتات، جمادات سب کو تیرا مطیع فرمان بنا دیا کہ تو اُن پر حکمرانی کرے اور اُن میں متصرف رہے کیا اس لئے کہ تو بہک کر کبھی بھی ہماری طرف رُخ نہ کرے اور سدا ہم سے بھاگا بھاگا پھرے۔ تیری زندگی محض ایک ہستی بے بود تھی۔ دو لمحے تجھکو تنفس کے لئے ہوا نہ ملتی تو تیرا دم نکل جاتا۔ ایک رات دن بھی آب ودانہ تجھکو جینا دشوار ہوتا، منوں ہوا تو سونگھ گیا اور کبھی نہ سوچا کہ ہمارے طفیل سے، غلّہ انبار کے انبار ٹھونس گیا اور کبھی نہ سمجھا کہ ہماری بدولت۔ زندگی بھر کتنی کنوئیں تو نے خالی کئے ہونگے مگر کبھی دھیان نہ کیا کہ ہمارے صدقے میں۔ اور ایک پانی اور ہوا اور غلّہ غذا کیا، ضرورت کی کل چیزیں تو کہاں سے لاتا اور کہاں سے بہم پہنچاتا تھا ہمارے توشہ خانۂ عام سے۔ مگر اس پر تیری یہ ہیکڑی تھی کہ گویا ہم تیرے قرضدار ہیں یا ہم پر کچھ تیرا اُدھار آتا ہے۔ تو کھاتا تھا اور مکرتا تھا، لیتا تھا اور بھول بھول جاتا تھا

دنیا کی باتوں میں تو تیری عقل بڑی رسا تھی مگر تو جان بوجھ کر ہمارے ہی ساتھ
تجاہل کرتا تھا۔ منھ پر آنکھیں تھیں اور اندھا۔ ایک چھوڑ دو دو کان تھے اور بہرا
زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، جنگل، دریا، میدان، انواع و اقسام کے
درخت، پھل پھول کھانے کو الوانِ نعمت، پہننے کو رنگا رنگ خلعت، جواہر بیش بہا،
نقرہ و طلا، دنیا بھر کا سامان ہم نے تیرے واسطے مہیا کیا اور ایک تیرے دم کیلئے اس قدر
لوازمہ بہم پہنچایا، ہم کو یہاں تک تیری خاطر عزیز اور تو ہم سے منحرف، ہم کو اس قدر
تیری بزرگ داشت ملحوظ اور تو ہم سے برگشتہ۔ ہم چاہتے تو ایک ادنیٰ سی چیونٹی
تیرے ہلاک کرنے کو کافی تھی، ہم حفاظت نہ کرتے تو خود تیرے جسم میں فساد کا مادہ
ایسا تھا کہ ایک ذرا سا روگ تیرے فنا کردینے کو بہت تھا۔ اگر ہم تجھ سے دوستی کرتے تھے
اور تو ہم سے عداوت۔ ہم عنایت کرتے تھے اور تو بغاوت۔ کیا یہی تھا بدلہ جو تو نے
ہم کو دیا۔ کیا یہی تھا صلہ جو تجھ سے ہم کو ملا۔ ہم نے تجھکو دنیا میں بھیجتے وقت کیا
تاکید کی تھی کہ دیکھ روح ایک جوہر لطیف ہے اور مجھ کو بہت ہی عزیز ہے ایسا نہ کرنا
کہ اس کو دنیا میں جا کر بگاڑ لائے۔ یہ میری عمدہ امانت اور نفیس ودیعت ہے،
دیکھ اس کی احتیاط کما ینبغی اور حفاظت کما حقہ کیجیو، جیسا اُجلا، شفاف، براق
روشن یہاں سے لئے جاتا ہے ایسا ہی دیکھ لوں گا۔ آج تو اے روسیاہ! اُس کو لایا ہی
پوتھ سے بدتر اور ٹھیکری سے کمتر بنا کر نجس، ناپاک، تیرہ، بے آب، بدرونق خراب
ہم نے تجھ سے چلتے چلتے کہدیا تھا کہ تو دنیا میں دل مت لگائیو اور اس طرح رہیو
جیسے سرائے میں مسافر۔ تو وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور ایسی لمبی تان کر
سویا کہ قبر میں آکر جاگا۔ تھا تو مسافر اور بن بیٹھا مقیم، تھا تو سیاح اور ہو گیا متوطن
کیا تو تمام عمر دنیا میں مال نہیں جمع کرتا رہا اور کیا تو نے پکی پکی عمارتیں اس خیال سے
نہیں بنوائیں کہ مدتوں اُن میں رہیگا۔ مسافر کا یہی کام ہے، سیاح کا یہی شیوہ ہے

تو تو جانتا تھا کہ تجھکو یہاں لوٹ کر آنا ہے، پھر مرنے کے نام سے تجھکو موت کیوں آتی تھی اور چلنے کی خبر سنکر تو مچلتا کیوں تھا۔ اوّل تو تجھکو ہماری عبادت کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ لیکن جب کبھی تو لوگوں کی شرم حضور یا دکھاوے یا اتباع رسم کی وجہ سے مصروف عبادت ہوا بھی تو کس طرح کہ دل کہیں تھا اور تو کہیں، کوئی نماز بھی تیری سجدۂ سہو سے خالی تھی۔ دُنیا کی برسوں کی بھولی بسری باتیں تجھکو نماز میں یاد آتی تھیں اور نماز تو کیا پڑھتا تھا گھاس کاٹتا تھا۔ نہ تعدیلِ ارکان ٹھیک، نہ قومہ درست، نہ قعدہ صحیح۔ برس بھر تو دوزخ شکم کو اناپ شناپ بھرتا رہتا تھا، برسویں دن صرف ایک مہینے کے روزے رکھنے کا ہم نے تجھکو حکم دیا تھا کہ تجھکو ہماری نعمتوں کی قدر ہو، تجھکو اپنے ابنائے جنس پر جو مبتلائے مصیبت ہیں، رحم آئے اور تیری صحتِ بدنی کو بھی نفع پہنچے، تیرے مزاج میں فروتنی اور انکسار کی صفتِ محمود کہ یہ ادا ہم کو بہت بھاتی ہے پیدا ہو لیکن یوں دنیا کے کام دھندے میں تو تو دن دن بھر بے آب و دانہ مصروف رہا نہ شکوہ نہ گلہ، تازہ دم، ہشاش بشاش، پھر کھانا ٹھونسنے کو موجود، مگر روزہ چونکہ ہمارے حکم سے تھا، دن میں سیکڑوں مرتبہ تو پیاس کی شکایت اور جو آیا اُس سے ضعف و ناتوانی کی حکایات العطش اور الجوع یہی تیرے دو وظیفے تھے۔ روزہ افطار کیا اور تو بدحواس ہو کر چارپائی پر ایسا گرا کہ گویا جان نہیں، باوجودیکہ تو دو دو دن کا کھانا ایک ہی رات میں کھالیتا تھا، پھر بھی اس تصوّر سے کہ کل پھر روزہ رکھنا ہے، تیری جوع البقر کو کسی چیز سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ تو عید کا اس طرح منتظر رہتا تھا جیسے کوئی قیدی تاریخ رہائی کا، تیرا بس چلتا تو ۲۹ کیا ۱۹ کی عید کرتا، کیا ایسے ہی روزوں کے ثواب کا تو اُمیدوار اور اجر کا متوقع ہے۔ میں نے تجھکو انسان بنا کر بھیجا تا کہ مصیبت زدوں کی ہمدردی کرے مگر تو نے

ایسی تن آسانی اختیار کی کہ راحت پہنچانا تو درکنار، دوسروں کو تکلیف دیکر بھی اپنی
آسائش حاصل کرنے میں تجھکو باک نہ تھا۔ تیرے ہمسائے میں ہمارے بندے
رات کو فاقے سے سوتے تھے اور تجھکو سوء ہضم کے علاج سے اُن کی پرداخت کی
پروانہ تھی تیرے پڑوس میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جاڑے کی لمبی راتیں آگ تاپ تاپ کر
سحر کرتے اور تو دوہرے دوہرے لحاف اور بھاری بھاری تو شکوں میں چین سے
پاؤں پھیلا کر سوتا، نعمت، مال و دولت جو ہم نے تجھکو عطا کی تھی تو نے تکلفاتِ
لایعنی اور نمود و نمائش کی غیر ضروری چیزوں میں بہت کچھ تلف کی اور جو لوگ
اُس کے سخت حاجتمند تھے ترستے کے ترستے رہ گئے۔ تیری سب خباثتیں مجھکو معلوم
ہیں، تو نے درماندگی کا نام خدا رکھ چھوڑا تھا۔ جب تک سعی و تدبیر سے تجھکو کاربرآری
کی امید ہوتی تھی، تجھکو ہرگز پروا نہیں ہوتی تھی کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور انتظامی
دنیا میں اُس کو بھی کچھ دخل ہے، مگر ہاں جب تو عاجز اور درماندہ ہوتا تھا، تب تو
خدا کو یاد کرتا تھا، اگر ہماری خدائی اور سلطنت تیری فرمانبرداری کی محتاج ہوتی
تو تو نے اُسکے اُٹھا دینے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ تو نے ہمارے فرمان واجب الاذعان
کی بے حرمتی اور احکام لازم الاحترام کی بے توقیری کی اور تو نے اپنا بُرا نمونہ دکھا کر
میرے دوسرے بندوں یعنی اپنے فرزندوں کو بھی گمراہ کیا، ہر روز تو لوگوں کو مرتے
دیکھتا اور سُنتا تھا کیا تجھکو نہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ ایک دن تو بھی مریگا۔ خود تیری
حالت میں کتنے کتنے انقلاب واقع ہوئے، لڑکے سے جوان ہوا، جوان سے بڈھا
ناتوان، بال تیرے سفید ہوئے، دانت تیرے ٹوٹے، کمر تیری جھکی، قوتوں میں
تیری فتور آیا، غرض ہم نے تجھکو سوتا دیکھکر بہتیرا جھنجھوڑا، بہتیرے ٹھنڈے پانی کے
چھینٹے ڈالے کئی بار اُٹھا اُٹھا کر بٹھا دیا مگر تیرے نصیب کچھ ایسے سوتے تھے کہ تو نے
کروٹ ہی نہ لی سو۔

تمامی عمر تو غفلت میں سویا ہمارا کیا کیا کچھ اپنا کھویا

سخت گیری خود ہماری عادت نہیں اور سخت گیری ہم کریں بھی تو کس پر،
اپنے بندوں پر، جن کا مارنا اور جلانا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے، مگر جب
بندہ بندہ ہو اور ہم کو اپنا مالک سمجھے، نہ خرناشخص کہ ہم تو دیں نوں اور وہ کہے
کہ آنکھیں پھوٹیں۔ ہم سے زیادہ بھی کوئی درگزر کرنے والا ہو گا کہ ایک معذرت
پر عمر بھر کے گناہوں کو ہم نے قاطبۃً بھلا بھلا دیا ہے۔ لیکن توبہ و استغفار، ندامت
و حسرت کا اظہار بھی تو کوئی کرے، ہماری رحمت حیلہ جو، ہماری رافت بہانہ طلب
کتنی کتنی بار جوش میں آئی مگر ہم نے اس کو صرف کرنے کا موقع نہ پایا۔ اگر بندہ ہمارے
ساتھ نسبتِ عبودیت صحیح رکھتا تو ہم اس کی لاکھ برائیوں پر خاک ڈالتے۔ ہم کو تو بڑی
شکایت یہی ہے کہ اس نے ہم کو معبود ہی نہ گردانا۔ عالم اسباب میں رہ کر اسباب
پرست ہو گیا۔ پھر ہم جو دیکھتے ہیں تو ہمارے احکام بھی کچھ سخت نہ تھے۔ کھانے کو ہم نے
نہیں روکا، سونے کو ہم نے منع نہیں کیا۔ تمتعاتِ دنیوی سے ہم نے باز نہیں رکھا،
پھر جو تو نے اُن کی بجا آوری نہ کی تو سوائے تیری بدنفسی کے اور تو کوئی وجہ
معلوم نہیں ہوتی۔ اے شخص جس نجات کا تو اب نہایت آرزومندی کے ساتھ
خواہاں ہے، اے کاش زندگی میں تجھ کو اس کی اتنی ہی پروا ہوتی جیسے اُردو پر
سفیدی۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے نقصان اور ذرا ذرا سے زیاں تجھ کو مضطر اور
بے چین کر دیا کرتے تھے۔ اگرچہ کیا دنیا اور کیا دنیا کا خسارہ؟ کیا بدی اور کیا بدی
کا شور، بالیکن تباہیِ دین کی تجھ کو خبر تک بھی تو نہیں ہوئی۔ اے کاش تجھکو نماز
کے قضا ہونے کا اتنا ہی رنج ہوتا جتنا ایک مٹی کے پرانے آبخورے کے ٹوٹ جانے
کا ہوتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب تجھکو بہت ہی بڑی ندامت ہے لیکن اس
ندامت کا کچھ ماحصل نہیں، اس واسطے کہ یہ دار الجزا ہے، دار العمل نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تو ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا لیکن حجت تمام کرنے کی نظر سے ہم تجھکو مہلت دیتے ہیں، جا اپنے نامۂ اعمال کو دیکھ اور اچھی طرح سوچ سمجھکر کوئی بات ہم سے بیان کر بشرطیکہ معقول اور قابلِ قبول ہو۔"

اس مضمون میں تینوں نتائج متذکرہ بالا کے لحاظ سے سب خوبیاں موجود ہیں۔ یعنی اس میں محاکات بدرجۂ کمال پائی جاتی ہیں اور تخئیل بھی ہے اگرچہ مضمون نہایت عام ہے اور ہر مسلمان اس کو خوب جانتا ہے اور اسکو خوبی کے ساتھ ادا کرنا مشکل بھی ہے لیکن مولانا نے ایسا خوب لکھا ہے کہ اس طرز سے بہتر ایسے مشہور و معروف مضمون کا ادا کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ تخئیل سے کام لیکر ....

مضمون نگار کی رائے نصوح کے خواب پر

...... مولوی نذیر احمد صاحب نے خدائے عزّ وجل کی عدالت العالیہ قائم کی اور وہی الفاظ استعمال کئے ہیں جو اس دنیا کی عدالتوں اور کچہریوں میں روزانہ لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ خواب میں جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں ناممکن باتیں بھی ممکن الوقوع ہوجاتی ہیں پس ناقدین کے لیے بھی جائے اعتراض باقی نہ رہی۔ جو لوگ حشر و نشر کا یقین رکھتے ہیں اُن کی آنکھوں کے سامنے روزِ قیامت کی تصویر کھنچدی ہے۔ مُجَلّی مشہور سنگ تراش، نقاش، مصوّر اور شاعر نے "میدانِ حشر کی تصویر" کامل آٹھ برس میں تیار کی تھی جسکی وجہ سے وہ دنیا میں لاجواب مصوّر مانا گیا ہے مولانا کو شاید اس مضمون کے لکھنے میں آٹھ دن بھی نہ لگے ہونگے لیکن مولانا کی تصویر مُجَلّی کی تصویر سے زیادہ صاف، زیادہ واضح اور مکمل ہے کیونکہ اپنے خیالات اور احساسات کو جس خوبی سے ادا کیا گیا ہے تصویر میں ان کو دکھایا ہی نہیں جاسکتا۔ روانی اور برجستگی الفاظ سے ہویدا ہے۔ اثر بھی کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ القصّہ جو ماحصل تھا وہ پورا ہوگیا مجموعی حیثیت سے یہ مضمون بے نظیر ہے۔ اور انشا پردازی اسی کا نام ہے

الفاظ اور محاورات کا بے محل استعمال

لیکن چند محاورے اور الفاظ ایسے آگئے ہیں کہ ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے

ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اُن کا بھی اظہار کر دیں کیونکہ وہ موقع اور محل کے لحاظ سے مناسب نہیں ہیں۔

(۱) "بیٹیا - جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت پر آمادہ ہیں؟

باپ - اوّل تو دو شخص کراماً کاتبین اس بلا کے ہیں کہ میرا کوئی فعل اُن سے مخفی نہیں......"

کراماً کاتبین کے لئے "دو شخص" کا لفظ غلط ہے "فرشتے" ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ شخص نہیں ہیں بلکہ فرشتے ہیں۔

(۲) "کئی بار اُٹھا اُٹھا کر بٹھا دیا اگر تیرے نصیب کچھ ایسے سوتے تھے کہ تو نے ہی کروٹ نہ لی"۔

یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب کئی بار اُٹھا اُٹھا کر بٹھا دیا تو کروٹ نہ لینا کیا معنی۔ کروٹ نہ لینا ایک محاورہ ہے جسکے معنی ہیں ٹس سے مس نہ ہونا - لیکن اُس کو حرکت دی جا چکی ہے اُسکو کئی بار اُٹھا اُٹھا کر بٹھایا گیا ہے۔ اس موقع پر سونے کی رعایت سے اگر کہا جاتا "کہ تو ہی نہ جاگا" تو زیادہ موزوں ہوتا۔

یہاں اس امر کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب کی تحریرات میں محاوروں کی بوچھار ہوتی ہے وہ محاورہ کی خاطر متانت اور سنجیدگی کو خیرباد کہکر پھکڑ بازی پر اُتر آتے ہیں۔ اور یہ اُن میں ایک نقص ہے اور بڑا نقص ہے انھیں محاورات کے بے موقع استعمال سے بعض بعض جگہ اُن کے ناظرین تلخ کام ہوتے ہیں اور سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

(۳) "نہ خبر نا مشخص کہ ہم تو دیں نون اور وہ کہے کہ آنکھیں پھوٹیں"۔

خدائے تعالیٰ کی زبان سے غیظ و غضب میں بھی ایسے الفاظ جاری ہونا موقع اور محل کے لحاظ سے بالکل نامناسب ہیں۔ وقار اور متانت کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے تھا۔ خدا کی گفتگو سوقیانہ الفاظ میں کبھی نہ ادا ہونی چاہیے۔

(۴) "اگرچہ کیا دنیا اور کیا دنیا کا خسارہ! کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا"
یہہ پڑھکر بے اختیار ہنسی آجاتی۔ یہاں مولانا نذیر احمد اپنے جوش و خروش میں
اپنے ناظرین کو اس قدر متاثر کیے بغیر کہ الفاظ کے حسن و قبح کا خیال باقی نہ رہے
بہت آگے چلے گئے ہیں۔ یعنی اُن کے ناظرین اسقدر اثر پذیر نہیں ہیں جسقدر کہ وہ
خود متاثر ہو گئے ہیں۔ پس ایسے محاورات کا استعمال ایسے موقع پر اصول انشاپردازی کے
بالکل خلاف ہے۔ تمام مضمون پڑھکر جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ اس محاورہ کی بدولت
ہنسی میں رفو چکر ہوجاتا ہے یا اتنا گہرا اثر باقی نہیں رہتا جتنا کہ دلوں میں سرائت
کرچکا تھا۔ اگر یہہ دونوں محاورے مضموں میں سے نکال دئے جائیں تو مطلب
سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی اور مضمون کا اثر بیش از بیش ہوجائیگا۔ یہ دونوں
محاورے بالکل غیر ضروری ہیں۔

مولانا شبلی کی بہترین تصنیف سیرت النبیؐ ہے، ہم اُس کے دیباچہ سے
کچھ عبارت بطور نمونہ نقل کرتے ہیں:-

سیرت نبوی کی تالیف کی ضرورت

"عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدّم فرض، اور سب سے زیادہ مقدس خدمت
یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے۔ یعنی پہلے
ہر قسم کے فضائلِ اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو،
عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے
قائم کئے جائیں، اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔
اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے۔ اس سے زیادہ متمدن
طریقہ یہہ ہے کہ فنِ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی جاکر تمام ملک میں پھیلائی
جائیں، اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے، ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر
محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دُنیا میں جاری ہیں، اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا، لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے، کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کیے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے، بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے، اور جس کا ایک ایک اشارہ، اوامرِ سلطانی بن جائے۔ دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے، سب انہی نفوسِ قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش نگار ہیں، لیکن اسوقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے، اُس نے اس قسم کے نفوسِ قدسیہ جو پیش کیے ہیں، وہ فضائلِ اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جنابِ مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتب درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائلِ اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے۔ حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراقِ تعلیم میں عفوِ عام کے صفحے خالی ہیں۔ اس بنا پر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی، اور اس لئے عالمِ انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامع کا محتاج رہا جو صاحبِ شمشیر و نگین بھی ہو، اور گوشہ نشین بھی، بادشاہِ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی، مفلسِ قانع بھی ہو اور غنیِ دریادل بھی، یہ برزخِ کامل، یہ ہستیِ جامع، یہ صحیفۂ یزدانی، عالمِ کون کی آخری معراج ہے، "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ"۔

عالمِ فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لئے یہ ہستیِ جامع، دنیا میں آکر ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے ضرور ہے کہ اُسکی زبان کا ایک ایک حرف اِسکی

حرکات و سکنات کی ایک ایک ادا، اُس کے حلیۂ وجود کے ایک ایک خط و خال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحل زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے رہنمائی کے کام آئے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام بانیانِ مذہب جامعیتِ کبریٰ کے وصف سے خالی تھے اُن کے کارنامۂ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام لی گئیں جنابِ مسیح کی ۳۳ سالہ زندگی میں سے صرف تین برس کے حالات معلوم ہیں۔ ہم فارس کے مصلحانِ دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر، افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے اُس کا ذریعہ صرف موجودہ توراۃ ہے، جو حضرتِ موسیٰ کے تین سو برس بعد عالمِ وجود میں آئی۔ یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ ان کے کارنامے اور اصولِ تعلیم ابدی نہ تھے، اس لئے نقل و روایت کے آئینہ میں جس قدر اُن کا ناتمام عکس اُترا اُس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا۔ قدرت، خود ضرورت کی اندازہ داں ہے، اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے

تمام اربابِ مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اُسی قدر عزیز ہے جس قدر دوسرے کو ہے، اس لئے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیتِ کبریٰ کا وصف نمایاں تھا؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئینگی، لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے، کہ دنیا میں وہ کون شخص گزرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی، اس طرح قلمبند ہوا کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لئے بھی نہ ہو سکا، اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال و افعال، وضع و قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاقِ طبیعت، اندازِ گفتگو، طرزِ زندگی، طریقِ معاشرت کھانے پینے، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا

محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہو سکتی ہے (محمدؐ عربی فداہ ابی وامی)۔

علمی حیثیت

یہ جو کچھ کہا گیا، مقصدِ تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم وفنون کی صف میں سیرت (بیوگرافی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنی سے ادنی آدمی کے حالاتِ زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیل راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے، اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی وعمل، جدوجہد، ہمت وغیرت کی جو عجیب وغریب نیرنگیاں سکندرِ اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن، عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو "شخص" کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں، وہ کس وسعت اور استقصاء وتفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں، تاکہ مراحلِ زندگی کی تمام راہیں، اور ان کے پیچ وخم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آجائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فردِ کامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

وجوہِ مذکورۂ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں، بلکہ تمام عالم کو اس وجودِ مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے

جس کا نام مبارک "محمد" (رسول اللہ ہے) اللہم صل علیہ وسلم صلوٰۃ کثیراً کثیراً،
یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایک علمی ضرورت
ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے،
اور مختصر یہ ہے کہ مجموعۂ ضروریاتِ دینی و دنیوی ہے۔

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرضِ اولین
یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرتِ نبوی کی خدمت انجام دیتا۔ لیکن
یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت
نہ کرسکا، تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی
جاتی ہیں۔

علم کلام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت

اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت، صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے
تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب،
صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے۔ لیکن جب اقرار نبوت
بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا
اس کے حالات اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مؤرخین، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں
وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے۔ آجکل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے
عربی علوم سے بالکل محروم کردیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے
حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انہی یورپ کی تصنیفات کی
طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر
کرتی جاتی ہیں، اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا
گروہ پیدا ہوگیا ہے جو پیغمبر کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگرچہ مجمع انسانی

میں کوئی اصلاح کردی تو اُس کا فرض ادا ہو گیا۔ اس بات سے اُس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اُسکے دامنِ اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنھوں نے مجھکو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرتِ نبوی پر ایک بسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا۔ یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، اُن کو سامنے رکھکر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھدینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہوسکتی۔"

سیرتِ نبوی کی تالیف کی ضرورت پر اظہار رائے

سیرتِ نبوی کی تالیف کی ضرورت اس عمدگی کے ساتھ دکھائی گئی ہے کہ کسی کو بھی اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوسکتا۔ الفاظ شاندار ہیں اور کانوں کو خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ علمیت ٹپکی پڑتی ہے۔ متانت حد سے زیادہ ہے۔ استدلال کا طریقہ نہایت عمدہ ہے۔ اپنے احساس کو کس خوبی سے محسوس کرایا ہے، کیا قابلِ تعریف نتیجہ اخذ کیا ہے "اس لئے نقل و روایت کے آئینہ میں جس قدر اُن کا ناتمام عکس اترا اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا۔ قدرت، خود ضرورت کی اندازہ داں ہے اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے۔"

علمی حیثیت سے جو سیرت النبی کی تالیف کی ضرورت دکھائی ہے وہ بھی خوب ہے۔ مسلمان تو اس تمام مضمون کو پڑھکر جھومنے لگتا ہے لیکن عام ناظرین پر بھی یہ عبارت اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ فی الحقیقت جو کچھ مولانا شبلی کے دل میں جاگزیں تھا اُس کا اظہار کر دیا ہے۔ ع

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

اس لئے اس تحریر میں اثر پیدا ہونا لازمی ہے۔ انشاپردازی اس سے زیادہ اور کیا دکھا سکتی ہے؟۔

عجیب بات ہے کہ جس مضمون کی تعریف میں ہم رطب اللسان ہیں جب اُسکی تحلیل و تقسیم کی جاتی ہے تو اس میں کچھ خرابیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں، چنانچہ اس تحریر میں بھی بعض الفاظ ایسے استعمال کئے گئے ہیں جو اُکھڑے اُکھڑے معلوم ہوتے ہیں اس مضمون کی پہلی ہی سطر اگرچہ مہتم بالشان ہے لیکن 'مقدم' اور 'مقدس' کے ساتھ الفاظ 'سب سے بڑا' اور 'سب سے زیادہ' استعمال کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ 'مقدم' وہی ہے جو سب سے پہلے ہو، چھوٹے اور بڑے کا کیا ذکر اور 'مقدس' ہمیشہ مقدس ہے کم اور زیادہ مقدار کیا؟ 'عالم کائنات' سے اگر اہلِ عالم مُراد ہیں تو فعل مجہول نہ لانا چاہیئے تھا یعنی "کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے" کے بجائے "کہ وہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کرے" ہونا چاہیے تاکہ مطلب سمجھنے میں کسی قسم کی دقت اور رکاوٹ نہ ہو۔ اسی فقرہ کے بعد 'یعنی' کا لفظ بے موقع اور بے محل ہے۔ جو بات پہلے کہی گئی ہے 'یعنی' سے اُسی مطلب کو سمجھانا مقصود ہوتا ہے حالانکہ دوسرا فقرہ معلول ہے اور پہلا علت۔ جب دنیا کی علتِ غائی یہ ہے کہ وہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کرے تو نتیجتاً اُسکو چاہیے کہ وہ ہر قسم کے فضائلِ اخلاق کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقے سے قائم کرے اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کرے۔ پس 'یعنی' کی جگہ 'لہذا' یا 'اس لئے' کا لفظ ہوتا تو خوب ہوتا کیونکہ مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتا۔

آگے چل کر جس ترتیب سے الفاظ "صاحب شمشیر و نگیں بھی ہو، اور گوشہ نشین بھی، بادشاہِ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سجہ گرداں بھی" استعمال کئے گئے ہیں وہاں اُس ترتیب کو بدل دینا اور یہ کہنا کہ "مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریادل بھی" مناسب نہیں ہے بلکہ اُسی ترتیب کو

قائم رکھکر "غنی دریا دل بھی ہو اور مفلس قانع بھی" کہنا چاہیے تھا۔ علاوہ اس بے ترتیبی کے، صاحب مضمون جو متضاد الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہے وہ بعض بعض جگہ متضاد نہیں رہے بلکہ صرف مختلف ہو گئے ہیں۔ مثلاً "صاحب شمشیر و نگین" اور "گوشہ نشیں"، متضاد نہیں ہیں بلکہ مختلف ہیں۔ نیز اس فقرہ میں کہ "بادشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی" لفظ گدا قابل اعتراض ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم "سائل" نہ تھے اگرچہ فقر و فاقہ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ گدا کے لفظ سے یہ پہلوئے ذم بھی نکلتا ہے۔

مولانا حالی کا مضمون "زبانِ گویا" زبان زدِ خاص و عام ہے لہذا ہم اسکو یہاں نقل کرتے ہیں :-

"اے میری بلبلِ ہزار داستاں! اے میری طوطیِ شیوا بیاں! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے، جس کے سحر کا رد، نہ جادو کا اُتار، کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے، جسکے زہر کی دارو، نہ کاٹے کا منتر تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے۔ جسکے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے

والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل۔ کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیکنامی، ہماری بدنامی، ہمارا جھوٹ، ہمارا سچ۔ تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اس 'ہاں' اور 'نہیں' نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں، مگر طاقت تیری نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ! اس طاقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ! اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ! اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانہ کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصحِ شفیق تیری صفت ہے اور مرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا ورنہ یہ منصبِ عالی تجھ سے چھن جائیگا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی

اُٹھائے، تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبوں ہے بلکہ سراسر زیاں ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فایق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منھ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائیگی ورنہ گدّی سے کھینچکر نکالی جائیگی۔

لے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجالائے، اُنھوں نے سخت الزام اُٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے اُنھیں فریبی اور مکّار کہا، کسی نے گستاخ اور منھ پھٹ اُنکا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھیرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بدعہد بنایا اور کسی نے غمّاز۔ غیبت اور بہتان، مکر اور افترا، طعن اور تشنیع گالی اور دُشنام، پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی، غرض دنیا بھر کے عیب اُن میں نکلے اور وہ سب کے سزاوار ٹھہرے۔

اے زبان! یاد رکھ، ہم تیرا کہا نہ مانینگے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئینگے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑینگے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائینگے۔ ہم جان پر کھیلینگے، پر تجھسے جھوٹ نہ بلوائینگے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائینگے۔

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے، تو بے اختیار ہنہناتا ہے اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ نام کے جانور اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں، ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں 'نہیں' اور زبان پر 'ہاں'۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبانِ راست گفتار دے اور اگر دل پر تجھکو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں، سچے

کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بنکر آئیں ۔"

یہ مضمون پڑھکر بے اختیار زبان سے سبحان اللہ اور واہ واہ کے نعرے نکل جاتے ہیں ۔ کمال انشاپردازی اسی کو کہتے ہیں کہ الفاظ اور معانی برابر برابر ہوں ۔ ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑے ۔ جو مضمون، صاحب مضمون الفاظ کے ذریعے سے ادا کرنا چاہتا ہو وہ الفاظ اُس کے دل کی پوری پوری ترجمانی کریں اور معانی سے پیچھے نہ رہ جائیں ۔ کلام میں کہیں اہمال یا اشکال نہ ہو ۔ جس موقع کے لیئے جو لفظ موزوں اور مناسب ہو وہی استعمال کیا جائے اور اگر اُسکی جگہ دوسرا لفظ بٹھانا چاہیں تو وہ نہ بیٹھ سکے ۔ "زبانِ گویا" کیا خشک اور دل اُکتانے والا مضمون ہے لیکن مضمون نگار نے کیا شاداب سرسبز اور دلچسپ کر دکھایا ہے اور معانی کے دریا بہا دیئے ہیں ۔ محاکات اور تخئیل اِس میں دونوں موجود ہیں اور دونوں بدرجہ اتم ۔ اثر جو غائتِ مضمون ہونا چاہیے لفظ لفظ سے پیدا ہے اور زبانِ گویا کی راست گفتاری کی عظمت و اہمیت کا نقش برابر دل و دماغ پر منقوش کر رہا ہے ۔ متضاد الفاظ کس خوبی سے ادا ہوئے ہیں، صفائی اور سلاست اِس مضمون کا حصّہ ہے ۔

زبان گویا پر ایک رائے کا اظہار

لیکن ۔ اور ہمیشہ نقد و تبصرہ میں "ایک لیکن" بھی ہوتا ہے ۔ جہاں مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی ۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی" وہاں بچپن اور جوانی کے علاوہ بڑھاپے کی زبان کا بھی ذکر ہونا چاہیئے تھا اور اُس کی بھی توصیف و مذمت ہونی چاہیئے تھی کیونکہ انسان کی زندگی کے تین زمانے ہیں، بچپن، جوانی،

بڑھاپا۔ پھر کیا وجہ کہ بڑھاپے میں زبان کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ نہ دکھائی جائے۔ اس لئے اس موقع پر زبانِ گویا' کی تصویر کسی قدر نامکمل ہے۔ اگرچہ صرف ایک یا دو سطر سے یہ کمی پوری ہو سکتی تھی۔ مثلاً "تو وہی زبان ہے کہ بڑھاپے میں کہیں اپنی کڑوی پند و نصیحت سے سامعین کو تلخ کام کرتی ہے اور کہیں اپنی شیریں صلاح و مشورہ سے لوگوں کو شکر دہاں بناتی ہے" (یہ جوڑ بلاشبہ زربفت کے لباس میں ٹاٹ کا پیوند ہے)۔

اب ہم پروفیسر آزاد کی بہترین تصنیف "آبِ حیات" سے ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کا حال نقل کرتے ہیں۔ چونکہ ذوق، آزاد کے اُستادِ شعر تھے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے اُستاد کا حال لکھنے میں انشاپردازی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ہوگا اور جس قدر اُن کی زبان اور اُن کا قلم یاری دے سکتا ہوگا اُنھوں نے دونوں سے کام لیا ہوگا اور جیسا کہ ناظرین پر جلد منکشف ہو جائیگا انھوں نے ذوق کی مدح سرائی میں اپنے کمالِ انشاپردازی کو واقعی صرف کیا ہے:۔

شیخ ابراہیم ذوق آبِ حیات سے

"جب وہ صاحب کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرتِ عام بنکر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اُس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے ملک الشعرائی کا سکہ اُس کے نام سے موزوں ہوا اور اُس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظمِ اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز اُمید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستان رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اُس زبان کے لئے ٹکسال تھا۔ وہاں بھانت بھانت کا

جانور بولتا ہے شہر چھاؤنی سے بدتر ہوگیا۔ اُمرا کے گھرانے تباہ ہوگئے۔ گھرانوں کے وارث علم وکمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہوکر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اِس قسم کی ایجاد واختراع کی فرصتیں دی ہیں۔ وہ اَور اَور اصل کی شاخیں ہیں، اُنھوں نے اور پانی سے نشو ونما پائی ہے۔ وہ اَور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں، پھر اُس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ۔

کیسا مبارک زمانہ ہوگا جبکہ شیخ مرحوم اور میرے والدِ مغفور ہم عمر ہونگے۔ تحصیلِ علمی اُن کی عمروں کی طرح حالتِ طفلی میں ہوگی۔ صرف ونحو کی کتابیں ہاتوں میں ہونگی اور ایک اُستاد کے دامنِ شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔ اُن نیک نیت لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ اُن کا عمروں کے ساتھ بڑھتا گیا اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا اُن کے تحریرِ حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھینگے مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اِس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اِس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اُس شعر کے پُتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کونسے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو، یہ کام کا نہیں اور کون سی حرکت اُس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور جو بات اُن کے سلسلۂ حالات میں مسلسل ہوسکیگی اُس کا ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے

تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے اُنھیں حالاتِ زمانہ سے ایسا باخبر کر دیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتبِ تواریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دلّی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے اور نواب لطف علی خاں نے اُنھیں معتبر اور بالیاقت سمجھکر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ اُن کے اکلوتے بیٹے تھے کہ ۱۲۰۴؁ھ ہجری میں پیدا ہوئے اُس وقت کسے خبر ہوگی کہ اِس رمضان سے وہ چاند نکلیگا جو آسمانِ سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ اُن کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلّے کے اکثر لڑکے اُنھیں کے پاس پڑھتے تھے۔ اُنھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے شوق تخلص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں، ویسے شعر کہتے تھے۔ محلّے کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہلوا لے جایا کرتے تھے اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اُن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔

شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دُعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی! مجھے شعر کہنا آجائے ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہہ فقط حُسنِ اتفاق تھا کہ ایک حمد میں تھا اور ایک نعت میں۔ مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اِس مبارک مہم کو خود اِس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو اور دوسرا نعت میں۔ جب یہ خیال بھی نہ تھا کہ اِس قدرتی اتفاق کو مبارک فال سمجھوں مگر اُن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی۔ اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ اُنھیں کہیں اپنی کتاب میں، کہیں جا بجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائی سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سناتا تھا اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرض کہ

اسی عالم میں کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

اسی محلہ میں میر کاظم حسین نام ایک ان کے ہم سن، ہم سبق تھے۔ بیقرار تخلص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی براقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق تھے اور کبھی باد و باراں۔ انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں اچھے اچھے موقع ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحاد طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میداں میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انھیں سے یہ اصلاح لی ہے شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور ان کے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے۔

سلسلۂ اصلاح جاری تھا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ واہ طبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پر لگاتی تھی۔ کہ رشک جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے استاد، شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقع پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے ان کی غزل کو دیکھ کر بے اصلاح پھیر دیا اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو" کبھی کہدیا یہ کچھ نہیں، پھر سوچ کر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی اس سے بے ادائی پائی گئی۔ ادھر انہیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا، کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلوتہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے جو براقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ ان کی غزلوں میں توارد سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لئے انہیں

زیادہ رنج ہوا۔

اگرچہ ان کی طبیعت حاضر، فکر رسا، بندش چست، اُس پر کلام میں زور، سب کچھ تھا مگر چونکہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ نہ دُنیا کے معاملات کا تجربہ تھا، نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل وقال میں ایک دن سودا کی غزل پہ غزل کہی "دوش نقش پا، آغوش نقش پا" شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ اُنھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ اُستاد کی غزل پر غزل کہتا ہے۔ اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔ ان دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کر کے گھر سے نکالا مشاعرہ میں جاکر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ اُس دن سے جُرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے۔ اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سُننے والوں کے دلوں میں اثر برق کی طرح دوڑنے لگی۔ اُس زمانہ کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کر کے دل بڑھاتے بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سُنتے۔

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ اُنھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی مگر مرزا ابوظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے، شعر کے عاشقِ شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملکِ شہرت کی تسخیر کیا تھا اس لئے دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے، وہیں آکر جمع ہوتے تھے اپنے اپنے کلام سُناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا، میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔

لیکن اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی، جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے۔

شاہ نصیر مرحوم کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے، دکن چلے گئے میر کاظم حسین اُن کی غزل بنانے لگے۔ انھیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہدنامے کرنے کو چلے۔ انھیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت وعلمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اُس عہدہ پر سفارش کے لئے ولیعہد سے شُقّہ چاہا۔ مرزا مغل بیگ اُن دنوں میں مختارِ کل تھے اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظرِ عنایت ہو اُس کو سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اس قدرتی پیچ پر میر کاظم حسین کو شُقّۂ سفارش آسان حاصل ہوگیا اور وہ چلے گئے۔

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں، انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنادو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سُنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ "بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو"۔ غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکار ولیعہدی سے چار روپیہ مہینا بھی ہوگیا۔

چند سال کے بعد اُنھوں نے ایک قصیدہ لکھکر اکبر شاہ کے دربار میں سُنایا جس کے مختلف شعروں میں انواع واقسام کے صنائع، بدائع صرف کئے تھے مطلع اُس کا یہہ ہے!۔

جبکہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن   آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اسپر بادشاہ نے "خاقانیِ ہند" کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

اواخر ایّام میں ایک بار بادشاہ (بہادر شاہ) بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی اور اُنھوں نے ایک قصیدۂ غرّا کہکر نذر گزرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب "خان بہادر" اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گزرانا جس کا مطلع یہ ہے:-

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت   نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

۲۴۔ صفر سنہ ۱۲۷۱ ہجری جمعرات کا دن تھا۔ ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا:-

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے"

اوّل ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آزاد نے جہاں یہ لکھا ہے کہ "اسی واسطے میں لکھونگا اور جو بات اُن کے سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکیگی اُس کا ایک حرف نہ چھوڑوں گا"، ہم نے آزاد کی اس آزادی کو اِس موقع پر کسی قدر جکڑ بند کر دیا ہے یعنی الف سے ی تک ذوق کے حالات کی آبِ حیات سے نقل نہیں کی بلکہ تسلسل کو صدمہ پہنچائے بغیر اکثر باتیں چھوڑ دی ہیں۔ کیونکہ تمام و کمال حالات کا نقل کرنا نہ صرف ہمیں اجیرن معلوم ہوا بلکہ مضمون کی حد سے زیادہ طوالت غالباً ناظرین کے دل و دماغ پر بھی بُرا اثر ڈالتی۔

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ لوح سے تمّت تک آبِ حیات کا یہ قطرہ موتی سے زیادہ آبدار ہے اور انشا پردازی کے آسمان کا درخشندہ ستارہ ہے۔

ذوق کے حالات [illegible]

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اگرچہ اس کا بے ساختہ پن، ساختہ ہے اور اس میں آمد، آورد کے زور سے پیدا کی گئی ہے کیونکہ بقولِ بعض، آزاد نے آبِ حیات کے مسودہ کو آٹھ آٹھ دس دس مرتبہ کاٹا چھانٹا ہے، تب یہ روانی، برجستگی، بے ساختگی اور پاکیزگی پیدا ہوئی ہے۔ آزاد نے سیدھے، سیدھے، صاف اور سادے بیان میں جا بجا رنگینیِ طبع کی ایسی جدولیں کھینچی ہیں کہ واہ وا۔

الفاظ کی شستگی اور سلاستِ بیان ہر فقرہ سے نمودار ہے۔ آبِ حیات میں محاکات اور تخئیل دونوں پانی بھرتے ہیں۔ اثر بھی اس بلا کا ہے کہ پڑھنے والا اس کو ناول اور قصہ سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ نثر میں نظم کا سا لطف ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ مگر آزاد کی نہ صرف یہ تصنیف بلکہ اور تصنیفات بھی اس عیب سے بری نہیں کہ ان میں جنبہ داری پائی جاتی ہے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے معاملات میں بے تعصب بھی اور اکثر صاحبِ قلم اہلِ ہنود اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن دہلی اور لکھنؤ کے معاملہ میں ضرور انھوں نے لکھنؤ کے بعض باکمال اصحاب کو اپنی اسی کتاب آبِ حیات میں نظر انداز کر دیا ہے مولوی عبدالحلیم شرر نے اپنے ایک مضمون اردو لٹریچر میں اس کی سخت شکایت کی ہے۔ اور ایک حد تک صحیح ہے اسی مضمون میں آزاد نے اپنے استاد ذوق کو کس قدر آسمان پر چڑھایا ہے اور جا و بیجا ان کی مدح سرائی کی ہے۔ حالانکہ آج زمانے نے ورق اُلٹ کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہرگز اس تعریف کے قابل نہ تھے جسکی بوچھار ان پر کی گئی ہے۔ الحاصل آزاد فنِ تنقید سے دراصل ناآشنا نہ تھے لیکن اپنے محسن استاد کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہی وہ جوہرِ شرافت جانتے تھے اور یہ نہ سمجھتے تھے کہ اپنے ممدوح کو فرشتہ بنا دینا

ل یہاں سے ہم نے اپنی کتاب سیر المصنفین جلد دوم سے جو زیرِ طبع ہے کچھ عبارت مستعار لی ہے۔ تنہا۔

انسان ضرور ہے لیکن وہ جوہر بشریت سے معرّیٰ ہو جاتا ہے اور اُسکے تمام محامد اُسکو انسانیت سے خارج کئے دیتے ہیں۔

ذوقؔ کے حالات میں جہاں یہ لکھا ہے کہ "جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستان رہے۔ نہ اِس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اُس زبان کے لئے ٹکسال تھا، وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ اُمرا کے گھرانے تباہ ہو گئے، گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اِس قسم کی ایجاد اختراع کی فرصتیں دی ہیں، وہ اَور اَور اصل کی شاخیں ہیں، اُنھوں نے اور پانی سے نشوونما پائی ہے وہ اَور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں، پھر اُس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ" دلّی کی تباہی کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے اور اپنی زبان کی بدقسمتی کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ لیکن کوئی سمجھدار اور انصاف پسند شخص اِس بات کو تسلیم نہ کریگا کہ ذوقؔ پر نظم اُردو کا خاتمہ ہو گیا۔ یا قادر الکلامی اُن پر ختم ہو گئی۔ مرزا غالبؔ، ذوقؔ کے بہت بعد تک زندہ رہے اور آج تغزل میں اُن کا رنگ لاجواب سمجھا جاتا ہے۔ امیرؔ مینائی کے قصائد اور داغؔ کی غزلیں اپنی آپ نظیر ہیں۔

پس آزادؔ کی انشا پردازی میں اگر کوئی نقص ہے تو یہی ہے کہ صرف ناواقف اصحاب اُس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ واقف کار طبیعتیں بلند پردازی سے زیادہ آزادؔ کی انشا پردازی کو وقعت نہیں دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر اسکول اور کالج کے طلباء آزادؔ کی تحریرات سے محظوظ ہوتے ہیں اور دل سے پسند کرتے ہیں، اُس قدر اہلِ علم اور مبصر اُن سے حظ نہیں اُٹھاتے۔

اس قدر لکھنے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ ان چاروں بزرگوں میں کس کو ترجیح دی جائے۔ چونکہ رات زیادہ آگئی تھی اور دماغ مسلسل لکھنے کی وجہ سے تھک گیا تھا میں اپنے پلنگ پر آرام کرنے کے لئے جا لیٹا۔ کچھ دیر تک اسی اُدھیڑ بن میں لگا رہا کہ کس کو سب پر تفوق حاصل ہے؟ اور یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ میں علی گڑھ کالج کے پرانے یونین کلب میں بیٹھا ہوں اور وہاں اسی مضمون پر کہ "اردو کے زندہ انشا پردازوں میں سب سے بڑا انشا پرداز حالی ہے" مباحثہ ہو رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ دیکھکر مجھکو کس قدر خوشی حاصل ہوئی اور میری طبیعت نے جو بیداری میں بےچین تھی کسقدر سکون محسوس کیا۔ چنانچہ میں اس مباحثہ کو غور سے سُننے لگا۔

پہلا طالب علم "جناب والا! سر سید مرحوم کے بعد اردو کے انشا پردازوں میں میں سب سے زیادہ صحیح طور پر اپنے خیال کو ادا کرنے والی اور موزوں الفاظ استعمال کرنے والی صرف دو ہستیاں ہیں۔ آزاد اور حالی۔ یہ سچ ہے کہ مولوی نذیر احمد کی تحریر میں بھی بکثرت موزوں الفاظ پائے جاتے ہیں اور برمحل محاوروں کے استعمال سے اُن کی عبارت میں لطف پیدا ہو جاتا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ اُنھوں نے محاورات اور روزمرہ کو اس نہج پر استعمال کیا ہے کہ اُن کا انداز تحریر خاص ہو گیا ہے۔ الفاظ کی شوکت، عبارت کی متانت، طرز ادا کی بلاغت اُن کے قلم کی خاص اور مابہ الامتیاز صفت ہے۔ بعض لوگ معترض ہیں کہ مولانا مغلق الفاظ لکھتے ہیں اور غیر مانوس لغت لاتے ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اُن کے اس انداز سے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ بہت سے نئے الفاظ جو مقبول عام ہیں اُن کی بدولت زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس لئے اُن کا یہ انداز قابل ستائش ہے

نہ لایقِ ملامت ایسے ہی مصنفوں کی بدولت زبان وسعت پاتی ہے نہ لکیر کے فقیروں سے
اُن کا اسلوبِ بیان بھی نرالا ہے محاورے کو وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے مگر عام
اسلوب کی شاہراہ پر چلنا اُن کو پسند نہیں۔ جہاں عام طرزِ ادا ابتذال پاتے ہیں
خود اکثر رفعت و متانت اختیار کرتے ہیں۔ اگر کسی باب میں عام روش، ثقاہت
و متانت کے دوش بدوش ہوتی ہے اور اُس کا بدلنا دشوار ہوتا ہے تو خود بلندی سے
پستی کی طرف آجاتے ہیں۔ متانت و رزانت چھوڑ کر سُبکی اختیار کر لیتے ہیں مگر عام
پامال رستہ پر نہیں چلتے۔ تاہم اُن کی تحریرات میں بعض بعض موقع پر محاورات کا استعمال
برمحل نہیں ہے۔ وہ انشا پرداز ہیں لیکن انشا پردازوں میں فوقیت کے مستحق نہیں۔

مولانا شبلی کی تصانیف کی سب سے بڑی خصوصیت فلسفیانہ تحقیق و تدقیق،
مضبوطیِ رائے اور منطقی استدلال ہے۔ ان میں ایک قسم کی جدت بھی ہے اور طرزِ ادا
میں دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جو خصوصیتیں اوائلِ اسلام
کے ائمہ و مجتہدین میں پائی جاتی تھیں اُن کی جھلک یہاں بھی نمودار ہے۔ عالمانہ
عبور، غور و خوض کی قوت، تحقیق و تجسس، درایت، علمی جانچ پڑتال کی عادت،
اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچنا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں اور خارستان
سے نکال کر سلجھانا اور پھر تقسیم و تحلیل کرنا بعد ازاں اُسے ایسے طور سے ترتیب دینا
کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے۔ یہ اُن کی خصوصیات ہیں۔ مولانا شبلی
میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ مطلق اجنبیت
باقی نہیں رہتی معاملہ فہمی اور دور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے۔

آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت اور
خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر اقوام پر ان کے پڑھنے سے اسلام
کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہو جاتی ہیں۔ یہ کتابیں سہل پسندی،

عام فہمی اور دلاویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔
باایں ہمہ موجودہ انشاپردازوں پر اُن کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔
وہ ہمیشہ تصویر کا ایک رُخ دکھاتے ہیں اور دوسرے رُخ سے چشم پوشی اختیار کرتے
ہیں۔ اپنے ممدوح کی تعریف میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ جو آئینِ جہانبانی
اِس زمانہ سے وابستہ ہیں، اُن میں سے بعض بعض کو وہ خلفائے راشدین
کے زمانہ میں موجود بتاتے ہیں جن کو صحیح ماننا اور تسلیم کرنا صرف راسخ العقیدہ
مسلمانوں کا کام ہے۔ غیر مذہب والے ہرگز اُن کی اِس قسم کی تحریرات سے
مطمئن نہیں ہو سکتے۔
جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے اب صرف آزاد اور حالی رہ جاتے ہیں۔
مولوی ذکاءُاللہ کا شمار انشاپردازوں میں نہیں ہو سکتا اگرچہ اُن کی تصنیفات کی
تعداد (۱۴۳) ہے۔ بے شک ہماری بدقسمتی سے آزاد باوجود زندہ ہونے کے
اُردو کی خدمت سے معذور ہیں کیونکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہ جنون کے
مرض میں مبتلا ہیں تاہم جو کچھ اُردو کی خدمت اُن سے ظہور میں آئی ہے۔ میں
بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ وہ موجودہ مصنفین کی خدمات سے بہت زیادہ اور
ارفع ہے۔
ایک طالب علم (درمیان میں اُٹھکر انگریزی میں) جناب! مقرر نفسِ
مضمون سے علیحدہ ہو کر دوسری طرف جا رہا ہے۔ اُسکو روک دیا جائے۔
نائب صدر۔ (یہہ بھی ایک طالب علم ہے اور اگرچہ پرنسپل یونین کلب کا
صدر ہوتا ہے لیکن صدارت ہمیشہ ہی نائب صدر کیا کرتا ہے۔ مقرر سے انگریزی
میں مخاطب ہو کر) کیا آپ مہربانی فرما کر اصل مضمون کی طرف رجوع کریں گے
اور اعتراض کا موقع نہ دیں گے؟

پہلا طالب علم (اپنی تقریر کو شروع کرتے ہوئے) آزاد کی انشا پردازی سے
کون منکر ہو سکتا ہے؟ اب کا تو کیا ذکر لیکن جب اُن کا دماغ جنون کے اثر سے
محفوظ تھا تو قلم اُن کی چوب تھی اور کاغذ اُن کا نقارہ اور انھیں سے اُن کی
شہرت کا آوازہ سارے ہندوستان میں گونج اُٹھا ۔ لیکن آبِ حیات میں
ذوق کا حال پڑھو اور دربارِ اکبری میں اکبر کا تو معلوم ہوگا کہ اُردو کا لارڈ
میکالے آزاد ہے ۔ جس طرح انگریزی میں لارڈ میکالے کی تاریخ پایۂ اعتبار سے
گری ہوئی ہے یا اُسکے مضامین کو وہ وقعت نہیں دی جاتی جس کے وہ زبان کی
سلاست اور روانی کے لحاظ سے مستحق ہیں، اسی طرح اُردو میں ذوق اور اکبر کے
حالات شوق سے ضرور پڑھے جاتے ہیں لیکن دونوں کی نسبت صحیح رائے اُن تحریرات
کے مطالعہ سے قائم نہیں ہو سکتی ۔

برخلاف اس کے مولانا حالی کا ڈھنگ جداگانہ ہے ۔ وہ فنِ تنقید کے
بادشاہ ہیں اور سوانح عمری لکھنے میں اپنی آپ نظیر ہیں ۔ طرزِ عبارت سادہ
اور مؤثر ہے ۔ مبالغہ سے پاک ہے اور واقعیت سے وہ کبھی تجاوز نہیں کرتے ۔
تعریف ہے تو حدود کے اندر، اور اعتراض ہے تو صحیح ۔ نہ اُستادی کا خیال ہے
نہ دوستی کا، نہ بزرگی کا خیال ہے نہ پبلک کے مذاق کا، بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے
صاف صاف بے کم و کاست کہتے ہیں اور کبھی بیجا طور پر نکتہ چینی نہیں کرتے
اور واقعی نقائص کے دکھلانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے ۔

اُن کو انگریزی کے مشہور مصنف مسٹر[1] جان مارلے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے
بعینہٖ جو فرق میکالے اور مارلے میں ہے وہی آزاد اور حالی میں ہے ۔ میکالے کا
اندازِ تحریر اب مفقود و متروک ہے اور مارلے کا اسلوبِ بیان دلکش و مقبول ہے

---

[1] بعد ازاں لارڈ مارلے ہوئے اور وزیر ہند بھی رہ چکے ہیں ۔ اب فوت ہو گئے ہیں تنہا ۔

اسی طرح افسوس آزاد ہی کی زندگی میں آزاد کا رنگ مفقود و متروک ہوگیا ہے اور حالی کے طرز کا سب اتباع کرتے ہیں اور میں یہ کہوں گا کہ حالی کا رنگ ہمیشہ مقبول رہیگا۔ میر امن کو مرے ہوئے غالباً سو برس ہوئے ہیں لیکن اُن کی باغ و بہار اب بھی زندہ ہے۔ کیا وجہ؟ سادگی کے ساتھ اُن کی زبان میں لوچ ہے اور یہی بات حالی میں موجود ہے۔ لہذا میری رائے میں اُردو کے موجودہ انشا پردازوں میں حالی سب سے فائق ہے۔"

دوسرا طالب علم:- "مجوز صاحب نے جو یہ تجویز پیش کی ہے کہ "اُردو کے زندہ انشا پردازوں میں سب سے بڑا انشا پرداز حالی ہے" میں اُسکی تردید کے لئے یہاں کھڑا ہوا ہوں۔ مجھے ہرگز مجوز سے اتفاق نہیں اور میں یہ کہنے کے لیے مجبور ہوں کہ آزاد کے ہوتے ہوئے مجوز صاحب کی زبان سے حالی کا کیونکر نام نکلا۔ اُن کو چاہیے تھا کہ وہ موجودہ تجویز کی بجائے یہ تجویز پیش کرتے کہ "اُردو کے زندہ انشا پردازوں میں سب سے بڑا انشا پرداز آزاد ہے"۔ کیا مجوز صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ حالی جا بجا انگریزی الفاظ اپنی تحریرات میں استعمال کرتے ہیں؟۔ کیا اِس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حالی اپنی زبان کے لحاظ سے بے بضاعت ہیں اگر یہ کہا جائے کہ ہماری اُردو زبان خود بے بضاعت ہے۔ تو میں یہ امر ہرگز تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں حالی کی تحریرات میں ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ دکھلا سکتا ہوں کہ انھوں نے خواہ مخواہ انگریزی الفاظ ٹھونس دیے ہیں حالانکہ اُن کے مرادف الفاظ ہماری زباں میں موجود ہیں۔ اور اگر وہ ذرا غور و تامل سے کام لیتے تو جن انگریزی الفاظ کو انھوں نے استعمال کیا ہے اُن کی جگہ عربی کے لفظ لکھ سکتے تھے۔ غالباً عربی زبان کے خزانہ کو اتنا خالی نہ سمجھا جائیگا جتنا کہ اُردو زبان کو مفلس و نادار سمجھا جا رہا ہے۔ آزاد نے کسی انگریزی لفظ کو جب تک کہ وہ ہماری

زباں میں مروّج نہیں ہو گیا اور خود ہماری زبان کا لفظ نہیں بن گیا استعمال نہیں کیا۔
اِسی ایک بات کے موازنہ سے حالیؔ، آزادؔ سے کم درجہ پر نظر آتے ہیں۔

جہانتک انشا پردازی کا تعلق ہے آزادؔ پر یہ اعتراض بیجا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کا روشن پہلو دکھاتے ہیں یا اُسے آسمان پر چڑھا دیتے ہیں۔ ہمارا مقصود بالذات تو یہ ہے کہ وہ "کیسا" لکھتے ہیں نہ یہ کہ وہ "کیا" لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُن کی تحریرات کا کوئی ہمِ مقابل نظر نہیں آتا۔ کسی کی تحریر میں اُن صفات کا شائبہ تک نہیں جن سے اُن کی تصنیفات مالامال ہیں۔ وہ تشبیہ و استعارات، وہ طرزِ بیان، وہ سلاستِ زبان، وہ شستگی الفاظ، وہ برجستگی، وہ بے ساختہ پن کسی اور تصنیف میں کہاں ہے؟۔

آزادؔ نے اُردو نثر کے باغ میں نئے گل بوٹے لگائے۔ نئی کیاریاں اور نئی روشیں نکالیں اور اسکے بوسیدہ جسم میں نئی روح پھونکی۔ ایجاد اور نو آئینی اِسے کہتے ہیں کہ انہدام کے ساتھ تعمیر بھی ہو۔ سادگی کے ساتھ رنگ آمیزی بھی ہو۔ آزادؔ نے پرانے ملبہ میں ایک اینٹ بھی کام کی ہوئی تو اُٹھائی اور نئے چونے سے نئی عمارت میں چُن دی۔ ماضی کی عزت، حال پر شفقت، مستقبل کی فکر یہ طرزِ عمل اِس ادبی مصلح کا رہا ہے اور حق یہ ہے کہ اُردو ادب میں یہ اختراع و اصلاح کر کے پروفیسر آزادؔ نے زباں دانانِ ملک کے لئے ایک شاہراہ بنا دی ہے خواہ کوئی اس پر چلے یا نہ چلے۔ آزادؔ نے آبِ حیات لکھکر احیائے قدامت کیا ہے، اُردو نثر کو نظم کا ہمپایہ بنا دیا، اور اُردو زبان کو تاریخی حیثیت بخشی ہے۔

دربارِ اکبری بھی اپنی عبارت کی رنگینی کے اعتبار سے اُن کی بہترین تصنیفات میں سے ہے اگرچہ یہ کتاب وہ خود ترتیب و نظرِ ثانی کے بعد نہیں چھپوا سکے تاہم کتاب کے دلاویز ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اِس کتاب میں اکبر کے زمانہ کی تاریخ کو صرف شاہی کارناموں تک محدود نہیں کیا ہے بلکہ اُس زمانہ کے رسم و رواج، طرزِ ماند و بود،

ملک کی عام حالت، رعایا کی مرفہ الحالی اور دیگر خیالات کا نقشہ کھینچکر پڑھنے والوں کو یہ یقین دلادیا ہے کہ وہ اُس زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے تمام حالات مشاہدہ کر رہے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر میں اس تجویز سے اتفاق نہیں کرتا اور یہ ترمیم پیش کرتا ہوں کہ بجائے حالی کے آزاد کا نام تجویز میں درج کیا جائے۔ بہرحال میں موجودہ تجویز سے سخت اختلاف رکھتا ہوں اور اس کا مخالف ہوں۔

تیسرا طالب علم۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج کا مضمون نہایت ہی دلچسپ ہے اور ممبرانِ کلب اس میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انشاپردازی سے کیا مراد لی جارہی ہے؟ کیا شاعری کی طرح اسے بھی مبالغہ اور رنگینی کا آماجگاہ سمجھا گیا ہے۔ اگر یہ خیال ہے تو بالکل غلط ہے۔ انشاپردازی سے مطلب صرف لوگوں کے دلوں پر اثر پیدا کرنا ہے خواہ یہ مقصد تشبیہ و استعارے سے حاصل ہو، خواہ تلمیحات سے، خواہ محاورات سے، خواہ مثلوں اور کہاوتوں سے خواہ لطیفوں اور بذلوں سے۔ لہذا میں یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ مولوی نذیر احمد کی تحریرات دل میں جاگزیں ہو جاتی ہیں۔ اُن کی کتابیں مرآۃ العروس اور بنات النعش اور توبتہ النصوح اپنی آپ نظیر ہیں۔ پہلی دو کتابیں عورتوں کی تعلیم میں نہایت ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں اور توبتہ النصوح تربیت اولاد اور مذہبی تعلیم کے لحاظ سے لاجواب کتاب ہے۔ قرآن شریف کا ترجمہ ہر مسلمان کیلئے کارآمد اور مفید ہے۔ ابتک جو ترجمے ہماری زبان میں تھے وہ عبارت کی بے ترتیبی کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ مولانا نذیر احمد نے اپنی انشاپردازی سے کام لیکر ایسا بامحاورہ ترجمہ کیا ہے جو اب کوئی اور شاید نہ کر سکے۔ یہ ایسا مشکل کام تھا کہ جسکے اہل نہ شبلی تھے نہ حالی اور نہ آزاد۔ بس میں اس تجویز

کی مخالفت کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ میرے نزدیک موجودہ انشا پردازوں میں سب سے فایق و برتر مولوی نذیر احمد ہیں۔

چوتھا طالب علم۔ "جس قدر عبور اپنی زبان پر آزاد کو حاصل ہے وہ دوسرے کو میسّر نہیں۔ مولوی نذیر احمد بھی کسی مصنّف سے اِس بارہ میں کم نہیں۔ مولانا حالی بھی ضرور قادر الکلام ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُنھوں نے انگریزی الفاظ ضرورت سے زیادہ استعمال کئے ہیں۔ اِس سے اُن کی قادر الکلامی میں بٹّہ نہیں لگتا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اُنھوں نے انگریزی الفاظ اُسی موقع پر استعمال کئے ہیں جہاں اُردو کے الفاظ اُس مطلب کو جس کو وہ ادا کرنا چاہتے ہیں ظاہر کرنے میں قاصر ہیں۔ علاوہ ازیں ہماری زبان کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہر زبان کے الفاظ کو آسانی سے جگہ دے دیتی ہے۔ ایک انشا پرداز اجتہاد کا درجہ رکھتا ہے۔ اُس کے لئے ضرور نہیں کہ وہ اُنھیں الفاظ کو استعمال کیا کرے جو اگلے مصنفین اُسکو ترکے کے طور پر چھوڑ گئے ہیں۔ اُسکو اختیار ہے کہ وہ متروک لفظ کو مستعمل بنا دے اور مروّج کو متروک کر دیے۔ ہماری زبان میں جو لچک ہے اِس کے لحاظ سے اِسکو بے مایہ کہنا سراسر غلطی ہے۔ اِس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ جو لفظ چاہے کسی دوسری زبان سے چھین لے اور اُسکو اپنے میں ایسا ملا لے کہ مطلق اجنبیت باقی نہ رہے۔ پس مولانا حالی پر جو اعتراض انگریزی الفاظ کے استعمال کے بارہ میں کیا گیا ہے وہ بیجا ہے اور میں اُسکے ماننے کے لیئے ہرگز تیار نہیں ہوں (شنو شنو کے نعرے)۔ کیا مولوی نذیر احمد اور علامہ شبلی اِس سے مستثنٰی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ آزاد بھی اِس سے آزاد نہیں صرف فرق کم و بیش کا ہے جو نظر انداز کئے جانیکے قابل ہے۔ البتہ میری رائے میں حالی کی جگہ شبلی کو یہ درجۂ امتیاز حاصل ہے کہ وہ انشا پردازوں میں سب سے بیش بیش اور برتر

مانے جائیں ۔ اُنھوں نے مختلف النوع کتابیں تحریر کی ہیں ۔ اُن کی تصنیفات سے ہم کو سلفِ صالحین کے عادات و حالات کا پتہ چلتا ہے ۔ تاریخِ اسلام کا علم جو ہمارے لئے نہایت ضروری اور ناگزیر ہے شبلی کی تحریرات میں موجود ہے۔ قرآنِ شریف کا ترجمہ جو مولوی نذیر احمد نے کیا ہے بے شک وہ بامحاورہ اور سہل الفہم ہے لیکن مولوی صاحبان اُس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بعض بعض جگہ غلط ترجمہ ہوا ہے ۔ حالی کی تصنیف حیاتِ جاوید بے شک عمدہ اور کارآمد ہے اور مجھکو بدقسمتی سے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر سنتا ہوں کہ شعر و شاعری پر اُن کا مقدمہ لاجواب ہے ۔ شاید ایسا ہو لیکن حال ہی میں شبلی کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر شائع ہوئی ہے ۔ کیا اس سے زیادہ موشگافیاں اور نکتہ سنجیاں حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری میں پائی جاتی ہیں ؟ ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ چاروں بزرگ قابلِ احترام اور لائقِ عزت ہیں اور سچ یہ ہے کہ اپنی اپنی پسند ہے ۔ میں تو علامۂ شبلی کو سب پر ترجیح دیتا ہوں اور تجویزِ موجودہ سے اختلاف کرتا ہوں ۔"

اس کے بعد کئی طالب علموں نے تقریریں کیں دو چار نے تجویز سے موافقت کی اور ایک دو نے مخالفت کی بعد ازاں مجوز نے مخالفین کا جواب دیا وہ تقریریں حافظہ میں محفوظ نہیں رہیں لہذا اُن کے لکھنے سے معذوری ہے ۔ جب تمام تقریریں موافق و مخالف ختم ہوچکیں تو تجویز کو دوبارہ پڑھا گیا اور نائب صدر نے ممبران کی آراء طلب کیں ۔ کثرتِ رائے سے تجویز پاس ہوگئی اور جلسہ برخاست ہوا ۔ علی گڑھ کے طالب علم شور و شغب کرنے میں مشہورِ آفاق ہیں اور شرارت اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے ۔ جلسہ برخاست ہوتے ہی اُنھوں نے اتنا شور و غل مچایا کہ میں پلنگ پر سوتا سوتا اُچھل پڑا اور میری آنکھ کھل گئی ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نہ علی گڑھ کالج ہے

نہ یونین کلب ہے، نہ علی گڑھ کے شریر طلباء۔ نہ ۱۹۰۶ء کا وہ مباحثہ ہے بلکہ ۱۹۲۴ء کی ۲۸ر دسمبر کی صبح نمودار ہے۔ اور میں غازی آباد میں اپنے مکان پر موجود ہوں۔

میں نے جلدی جلدی حوائجات سے فارغ ہوکر وضو کی اور نمازِ فجر ادا کی۔ بعد ازاں فوراً رات کے خواب کی سرگزشت جو کچھ حافظہ میں قائم تھی لکھنی شروع کی۔ الحمد للہ کہ بحث کا ضروری حصہ یاد رہ گیا۔

سوال کا جواب۔

اور میں نے اسکو تائیدِ غیبی سمجھا کہ مولوی ظفر الملک صاحب علوی کے سوال کا جواب یہی دیا جائے کہ مولانا حالی سب سے بڑے انشا پرداز تھے۔ صبح صادق کا خواب کبھی جھوٹا نہیں ہوتا پس میں تو اس رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوں کہ مولانا حالی انشا پردازی میں سب سے گوئے سبقت لیگئے ہیں۔ آپ اس کو مانیں یا نہ مانیں۔

جو بات تھی صلاح کی سو ہم نے دی بتا   آیندہ اپنے فعل کا ہے تم کو اختیار

سوال کا دوسرا جزو اور اسکا جواب

لیکن مولوی ظفر الملک کے سوال کا دوسرا جزو ابھی حل طلب ہے۔ وہ یہ کہ "سب سے زیادہ اُردو کی خدمت کس نے انجام دی؟" بلاشبہ مولانا حالی نے اپنی نظم و نثر سے قومی خدمت سب سے زیادہ کی ہے مگر سوال اُردو کی خدمت کا ہے۔ سوانح عمری کا رواج اُردو زباں میں مولانا حالی کی بدولت ہوا مقدمۂ شعر و شاعری سے، شاعری کی اصل حقیقت کا پتہ چلا اور طبیعتیں قدیم طرز کی شاعری سے نفور ہو گئیں۔ مجالس النسا سے تعلیمِ نسواں کو بہت مدد پہنچی اور مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی تحریک پیدا ہو گئی۔ یہ چاروں انشا پرداز عجیب اتفاق ہے کہ تھوڑے بہت شاعر بھی تھے۔ ہم نے تھوڑے بہت کا لفظ مولوی نذیر احمد صاحب کی وجہ سے استعمال کیا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی نظمیں کہہ لیتے تھے۔ آزاد، شبلی اور حالی پورے شاعر تھے لیکن حالی کا درجہ میدانِ شاعری میں ان تینوں سے بہت ارفع اور اعلیٰ ہے اس لئے

اُردو کی جو بلحاظ شاعری خدمت دیکھی جائے تو اس میں بھی حالی ہی سب سے آگے نظر آئینگے ۔ لیکن سوال کے پہلے جزو کو دوسرے جزو کے ساتھ پڑھنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بلحاظ انشا پردازی ان میں سے کس نے سب سے زیادہ اُردو کی خدمت انجام دی؟ مجھکو اپنے خواب پر جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں بیحد اعتقاد ہو گیا ہے ۔ چنانچہ پہلے طالب علم نے اپنی تقریر کے دوران میں یہ الفاظ ادا کئے تھے ۔

"بے شک ہماری بدقسمتی سے آزاد باوجود زندہ ہونے کے اُردو کی خدمت سے معذور ہیں کیونکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہ جنون کے مرض میں مبتلا ہیں تاہم جو کچھ اُردو کی خدمت اُن سے ظہور میں آئی ہے میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ وہ موجودہ مصنفین کی خدمات سے بہت زیادہ اور ارفع ہے" اسپر ایک طالب علم نے اعتراض کیا تھا کہ مقرر نفس مضمون سے علیحدہ ہوکر دوسری طرف جارہا ہے اور نائب صدر نے مقرر سے کہا تھا کہ وہ اصل مضمون کی طرف رجوع کریں ۔ مجھکو اب تک اُس طالبعلم پر غصہ آرہا ہے کہ اُسنے مقرر کو خواہ مخواہ ٹوک دیا ۔ ورنہ وہ اپنی تقریر میں ضرور اس مسئلہ پر بھی کافی روشنی ڈالتا اور مجھکو سوال کے اس دوسرے جزو کے جواب دینے میں آسانی ہو جاتی ۔ تاہم جواب تو وہ طالب علم دے ہی چکا ہے اب مجھے صرف اس جواب کو مدلل کرنا باقی ہے میں بھی فی الواقع سمجھتا ہوں کہ آزاد نے ان سب اصحاب سے زیادہ اُردو کی خدمت انجام دی ہے ۔ آزاد نہ کسی ایسوسی ایشن کے ممبر تھے نہ وہ کسی کانفرنس میں شریک ہوئے اور نہ وہ کسی ملی و ملکی تحریک کے بانی ہوئے ۔ اُن کو شروع سے اپنی زبان کے تحفظ کا خیال تھا اور اسی کو دلچسپ اور ہر دلعزیز بنانے میں انھوں نے اپنی تمام عمر صرف کردی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کرنل ہالرائڈ جو ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم صوبہ پنجاب تھے اُنھوں نے آزاد کی مدد سے صوبۂ پنجاب میں اُردو کو ہردلعزیز بنا دیا ۔ اور دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد اُردو کا صدر مقام لاہور ہو گیا ۔ سیکڑوں اخبارات

ورسائل پنجاب سے شائع ہونے لگے اور اب بھی اُردو اخبارات ورسائل جسقدر صوبہ پنجاب سے شائع ہوتے ہیں کسی اور صوبہ میں اتنی تعداد میں نہیں نکلتے۔ کیا کوئی اُردو مصنّف دعویٰ کرسکتا ہے کہ اُس نے کسی ایسے صوبے میں جہاں عوام کی زبان اُردو نہ ہو اُردو کو رائج کردیا ہے اور اُردو کی قدر وطن سے زیادہ غربت میں کی گئی ہے۔ یہ فخر آزاد ہی کو حاصل ہے اور اِس میں چون و چرا کرنے کی حاجت نہیں۔ مختلف النوع کتابیں لکھنا اُور بات ہے اور اُردو کو اپنی تحریرات سے مطبوع و مقبول کرادینا دوسری بات ہے۔

فرق ہی چیزے دگر آں چیزے دیگر است

یوں تو اِن سب بزرگوں نے حق المقدور اُردو کی خدمت کی ہے اور اُردو زبان ان کے احسانات سے کسی آیندہ زمانہ میں بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی لیکن آزاد کی خدمات نہایت وسیع اور نہایت اعلیٰ ہیں۔ اور اُس زمانہ میں اُن سے ظہور میں آئی ہیں جب اُردو کے مخالفین خوابِ غفلت میں تھے۔ یعنی اُنھوں نے اُردو کی خدمت کسی مخالفت کی بنا پر نہیں کی بلکہ اُن کا ذوقِ زبان اُن کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنی زبان کا تحفظ کریں اور اپنے اردگرد کے لوگوں میں اِسی کا چرچا کریں۔ جب اُردو ناگری کا قضیۂ نامرضیہ اِس صوبہ میں اُٹھا تو سوائے سرسید کے اُور اہلِ زبان یا مصنفین نے کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں کیا اور اب تک کچھ نہیں کرتے۔ تصنیفات سے بلاشبہ اُردو کی خدمت ہوتی ہے لیکن آجکل کے زمانہ میں سب سے بڑی خدمت اُردو کی یہی ہے کہ تصنیفات کو اہلِ ملک کے ہاتوں تک پہنچایا جائے۔ ورنہ کتابوں کا لکھا جانا اور کیڑوں کی نذر ہونا بے سود ہے۔ آزاد کی خدمت اِس بارہ میں ظاہر ہے۔ پنجاب میں اُردو کتابیں نہ صرف لکھی جاتی ہیں بلکہ خوب فروخت ہوتی ہیں۔ اُردو اخبارات ورسائل نہ صرف

شائع ہوتے ہیں بلکہ عوام دلچسپی سے خریدتے اور پڑھتے ہیں ۔ اور یہ حالت جو اس وقت پنجاب میں ہے میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ حضرتِ آزاد ہی کے دم قدم سے ہے ورنہ پنجاب میں کوئی اُردو کا نام بھی نہ جانتا ۔

محمد یحییٰ تنہا (بی۔اے)
وکیل غازی آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو کا سب سے بڑا انشا پرداز!

یہ سوال کہ دو شمس العلماء، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی، مولانا حالی، اور مولوی نذیر احمد صاحب میں اُردو ادب کا سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟ اور اُردو کی سب سے زیادہ کس نے خدمت کی؟ جس قدر آسان اور دلچسپ ہے اُتنا ہی اس کا جواب مشکل، اور غیر فیصل ہوگا۔ اُردو دنیائے ادب کے یہ شموس[1] اربعہ یوں تو اپنی اشراق و تنویر سے چپہ چپہ کو روشنی پہونچا رہے ہیں۔ مگر فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ ان میں کوکب اعظم کون ہے، اور کس کی ادبی روشنی سے اوروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے یعنی ان میں بحیثیت انشا پرداز سب سے بڑا کون ہے؟

جو لوگ زبان کے چٹخارے، محاورے، اور روزمرے پر جان دیتے ہیں، بیگمات سے لے کے ایک معمولی بازاری کی گفتگو، کتابوں کے صفحوں پر حروف کا لباس پہنے ہوئے دیکھکر خوش ہوتے ہیں، اور انشا پردازی کی

[1] چاروں حضرات شمس العلماء ہیں۔

حد اسی پر ختم سمجھتے ہیں، کہ ہر کس و ناکس، شریف و رذیل، امیر و غریب، شاہ و گدا کی گفتگو، اُنھیں الفاظ میں ادا کیجائے، جو علی العموم استعمال کیئے جاتے ہیں، ڈاکٹر نذیر احمد ایل ایل ڈی کو پیش کرینگے، کہ یہ شرف انھیں کو حاصل ہے اور انکی کثیر تصانیف کے ہوتے ہوئے جو اپنے طرز میں لاجواب ہی نہیں بے مثل ہیں، کسی کا حق نہیں کہ وہ اُردو کا سب سے بڑا انشا پرداز بنایا جائے۔
اس دعویٰ کے ثبوت میں، لاتعداد تصانیف کے نام، جن میں منتخب الحکایات سے لے کے ترجمہ قرآن مجید تک ہے، پیش کئے جائینگے، اور مراۃ العروس، توبۃ النصوح، رویائے صادقہ اور ابن الوقت وغیرہ وغیرہ کے ایک ایک کرکے حوالے دئے جائیں گے، عبارتیں نقل ہونگی، اور ان کی سادگی، برجستگی، شستگی، روزمرہ اور سلاست کی زندہ دار الفاظ میں تعریف و تحسین کیجائے گی، شوخی و بے تکلفی اور اس امر کی، کہ آپ نے عورتوں کے کیرکٹر کس خوبی سے دکھائے ہیں، عورتوں کی زبان اور خیالات کو ہو بہو کس لطافت و خوبی سے ادا کیا ہے ستائش کیجائے گی۔ ان کی مضحکات و طنزیات بزم میں لائی جائینگی کہ باعث رونق ہوں۔
مسدس حالی پر سر دھننے والے پانی پت کے اُس بزرگ کے نام کا "قرعہ" نکالیں گے جس کو دنیا الطاف حسین حالی کہتی ہے۔ انکی تصانیف کی فہرست اگرچہ اُتنی طویل نہ ہوگی جتنی ڈاکٹر صاحب کی ہے، مگر ان کی بے مثل نکتہ سنجی و دقیقہ شناسی، سخن فہمی و سخن آفرینی، بلند پروازی و وسعت نظری کے ثبوت میں، یادگار غالب، حیات سعدی اور حیات جاوید، پیش ہونگی، اور نقادانہ طرز تحریر و محققانہ کنہ رسی دکھانے کے لئے، سعدی و غالب کے حالات سے رونق محفل بڑھائی جائیگی۔ مسدس مدوجزر اسلام کے ساحرانہ بند نقل کئے جائینگے اور نیچرل شاعری کی اولیت کا طرہ، دستار فضیلت و کمال میں لگاکر، اُردو کے

سب سے بڑے انشا پرداز کے تخت پر بٹھائیں گے۔

پرستاران شبلی! اور اسلامی تاریخ و ایام گذشتہ و مشاہیر اسلام سے دلچسپی رکھنے والے الفاروق کے مصنف کو بزم میں لائیں گے، کہ اس محقق، وسیع نظر مصنف کی موجودگی میں، جس نے اُردو سی بے حقیقت زبان کو جبیں کسی علمی خیال کے ادا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی، اپنی فلسفیانہ تحریر، محققانہ طرز استدلال عالمانہ ومورخانہ تحقیق اور بےنظیر انشا پردازی سے معراج کمال پر پہونچایا کہ آج اُردو دنیا کی مہذب ترین زبانوں کے سامنے الفاروق والمامون، النعمان و الغزالی، سیرۃ النبی و شعر العجم کے ہوتے ہوئے نظر نیچی نہیں کرسکتی، یورپ کے بڑے بڑے مستشرقین نے، شبلی کے بہم پہونچائے ہوئے معلومات سے استفادہ کیا، اپنی کتابوں اور مضمونوں کا ماخذ بنایا، پھر ایسی تصانیف کے مصنف کے سوا کس کا حق ہے، جس کو اُردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کہا جائے؟ انکی زبردست انشا پردازی، وسیع النظری، نکتہ فہمی و دقیقہ سنجی اور فلسفیانہ طرز استدلال کے ثبوت میں، الفاروق والمامون، الکلام والغزالی، سیرۃ النبی و شعر العجم کی ضخیم جلدیں پیش کیجائیں گی، صفحے کے صفحے مولانا کے زور قلم کا اعلیٰ نمونہ دکھانے کیلیے نقل ہونگے۔

مگر ان حضرات کے معتقدین و پرستار یا تو سوال کی حقیقت کو نہیں پہونچے، یا اُس شخص سے ناواقف ہیں، جو ان تینوں اصحاب پر بحیثیت انشا پردازی فوقیت رکھتا ہے اور جو خالص انشا پرداز ہے، اور سب سے بڑا انشا پرداز، جس کی تحریر کا ایک ایک نقط ادب و انشا کی جان ہے، جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ "اُردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے" جس کی انشا پردازی اتنی اعلیٰ وارفع ہے کہ اُس کے علو و رفعت کا اندازہ ہم سے لوگوں کے لیے مشکل ہے۔

انسان اپنے معتقدات میں ایسا سخت ہوتا ہے کہ مشکل سے اُسمیں تبدیلی گوارا کرتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہونگے، جو ظفر الملک صاحب کے اعلان کے پہلے ان چاروں بزرگوں کی نسبت خاص خاص رائے رکھتے رہے، اور اب اُسی کی پیروی کرتے ہوئے، اپنی اصابت رائے کی داد لینے کے واسطے زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے، بہت کم لوگ ہوں گے جو جناب ظفر الملک صاحب کے اعلان کے بعد غور و فکر کر کے کسی نتیجہ پر پہونچے ہوں، اور ان بزرگ ہستیوں کے مقابلہ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہوئے، مرجحات و خصوصیات جو انکو دوسروں سے ممتاز کرتی اور باعث تفوق ہیں، بیان کر سکیں۔

ممکن ہے میری نسبت بھی یہ کہا جائے کہ میری بھی اس کے قبل کوئی رائے تھی، جس کے اظہار کے لیئے ذیل کے صفحات رنگ رہا ہوں، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، میں چاروں بزرگوں کی نسبت کوئی رائے نہیں رکھتا تھا اور نہ مجھکو کسی سے عقیدت اور نہ کسی کا طرفدار، یوں ہر شخص کو صاحب کمال مانتا تھا اور اپنے اپنے رنگ و طرز، اور اپنی جگہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا تھا۔ مولانا ظفر الملک صاحب علوی کے اعلان کو دیکھکر ارادہ کیا، میں بھی کچھ لکھوں، جہانتک مجھکو مل سکیں، ان اصحاب کی تصانیف مطالعہ کیں، غور و فکر سے پڑھا، عمیق نظروں سے مطالب و معانی پر نگاہ ڈالی، اور انکی انشاپردازی کا باہم مقابلہ کیا، آخر کو بعد غور و خوض بسیار اس رائے پر پہونچا، جس کے اظہار کے لیئے یہ صفحات اختیار کیئے ہیں۔

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ لوگ اس سوال کی حقیقت کو نہیں پہونچے، اس سے حاشا وکلا کسی کی کم فہمی، یا اپنی سخن فہمی ظاہر کرنا مقصد نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ لوگ حدود مقرر کیئے ہوئے بغیر ہر اُس خوبی کو جو ممدوح

میں پائی جائے پیش کر دیتے ہیں، حالانکہ سوال کے حدود سے تعلق رکھنے والے امتیاز ہرگز باعث تفوق نہیں ہو سکتے، مثلاً یہ دریافت کیا جائے کہ تاریخ اسلام کے مولانا شبلی زیادہ محقق ہیں کہ مولانا شرر، اور مولانا شرر کو اس لئے ترجیح دیجائے کہ وہ ناول اچھے لکھ لیتے ہیں۔

سوال کا تجزیہ کیا جائے۔ تو دو حصوں پر منقسم ہوگا۔

(الف) انہیں ادب اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟۔

(ب) اردو کی سب سے زیادہ کس نے خدمت کی؟۔

میں علیحدہ علیحدہ ان دونوں حصوں پر روشنی ڈالوں گا لیکن ان حدود کے باہر قدم میں نہ رکھوں گا، مثلاً کسی میں تاریخی یا عدم تحقیق کا نقص ہو، مگر انشا پردازانہ خوبیوں کا مالک ہو، تو میرے لئے یہ نقص چنداں قابل اعتنا نہیں، یعنی میں مقابلہ صرف انشا پردازی میں محدود رکھونگا، جو سوال سے تعلق رکھتا ہے

قبل اس کے کہ حصہ الف سے بحث کی جائے، یہ بتا دینا مناسب ہی نہیں ضروری ہے، کہ انشا پردازی کس کو کہتے ہیں، انشا پردازی کی تعریف کیا ہے؟ یوں تعریف کیجائے تو طول طویل ہوگی، اور ہم اپنے مقصد سے دور جا پڑینگے انشا پردازی کی سب سے زیادہ آسان عام فہم، اور مختصر تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ کسی حال یا خیال کو ایسے الفاظ و عبارت میں بیان کرنا کہ پڑھنے یا سننے والے پر وہی عالم وہی سمان وہی کیفیت اور وہی حالت طاری ہو جائے۔ اور جذبات یا تاثرات جو اصل شی سے پیدا ہو سکتی ہیں، پیدا ہوں، بلکہ کلام میں اتنا اثر ہو کہ اصل حال کے دیکھنے اور خیال کے دل پر گذرنے میں وہ لطف و مزہ نہ حاصل ہو جو اس کے بیان میں جذبات انسانی مثلاً سرور و غم، غصہ و رحم، شجاعت و بزدلی

نخوت و غرور کی تصویر الفاظ میں اس طرح کھینچے کہ مجسمہ پیش کر دے ۔ خیالات کو محسوسات کر دکھائے ، آنکھوں سے دکھا دے ۔ کسی چیز کا حال لکھے ، تو ایسی عبارت میں کہ سامنے لاکے کھڑا کر دے ۔ رزم کا نقشہ کھینچے ، تو صفحہ قرطاس کو خونیں بنا دے آنکھوں کو مارنے اور مرنے ، حملہ و دفاع کے مناظر اور کشتوں کے پشتے دکھا دے ۔ جنگ کی کیفیت اس طرح بیان کرے کہ الفاظ سے تلوار کی چمک آنے لگے ، بزم کا چربہ اُتارے تو یوں ، کہ سرور و انبساط کو مجسم بنا دے عیش و راحت کی تجسیم و تشخیص کر کے سامنے لے آئے ، ہر لفظ و جملہ مسرت و خوشی کا عالم ہو ، اور ہر ترکیب و بندش بہجت انگیز ہو ۔

اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لغات کے الفاظ ختم کر ڈالے جائیں ، غیر مانوس کلام سے کان مانوس کئے جائیں ، عربی و فارسی کے ثقیل اور بڑے بڑے لفظ اضافت در اضافت کے ساتھ لائے جائیں ، جس سے مضمون دقیق و پیچیدہ ہو کر عام فہم نہ رہجائے ۔ بلکہ انشا پردازی کا سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انشا پرداز عام فہم ، صاف و سلیس ، محاورے و روز مرے میں تاریخ و فلسفے کے مسائل اس حسن و خوبی سے ادا کرے کہ دلوں پر گراں نہ گذرے خشک مضامین کلام کی شگفتگی و شوخی سے ایسا کر دے کہ علوم و فنون کے مسائل فسانے معلوم ہوں ، جاہل سے جاہل ، ان پڑھ سے ان پڑھ اپنی عقل اور سمجھ کے موافق سمجھ لے ۔

ظاہر ہے کہ انشا پردازی میں معاشرتی و مذہبی اصلاح داخل نہیں ، اور نہ تاریخ و تنقید میں منحصر ہے ۔ شمس العلما مولانا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی کا لٹریچر بحیثیت انشا پردازی وقعت و عزت رکھتا ہے ۔ بخلاف مولانا نذیر احمد و شبلی و حالیؒ کہ ان لوگوں کا لٹریچر خاص حیثیت و موضوع اور علم و فن کے لحاظ سے قابل دادہے

مولانا نذیر احمد کی تمام کتابیں، معاشرتی ومذہبی اصلاح سے تعلق رکھنے کی وجہ سے
اس قابل ہیں کہ اُردو کی بہترین تصنیفات میں شمار کی جائیں، علامہ شبلی کی تمام تر
تصنیفات تاریخ وفلسفہ تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں، اور پڑھنے والا ان کی فلسفیانہ
تحقیق ومورخانہ تدقیق کی داد دیگا، مولانا حالی کا لٹریچر نقادانہ وسخن سنجانہ ہے
اور اسی حیثیت سے لائق تحسین، مگر علامہ آزاد ان تمام قیود سے بالاتر ہیں، انکی
انشا پردازی فی نفسہٖ اتنی وقیع ورفیع ہے کہ انکی تصانیف تاریخ وفلسفہ تاریخ
کے معیار سے کوئی وقعت نہ رکھتی ہوں تو بھی محض انشا پردازی کے لحاظ سے
اس لائق ہونگی کہ اُردو ادب نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، واقعۃً علامہ آزاد
کی انشا پردازی اتنی بلند ہے کہ آجتک دنیائے اُردو نے بایں ترقی نظیر نہیں پیدا
کیا ہے۔ علامۂ مرحوم، اپنے طرز خاص کے موجد اور ساتھ ہی اس کے "خاتم"
تھے، کہ اب تک اُنکی کوئی برابری نہیں کرسکا ہے اور آئندہ کے لئے اُمید ہے بلکہ وہم
سے ماوراء یہ بات خیال کرنی چاہیئے کہ کوئی آزاد سا ہوسکے۔ انکی انشاپردازی کی
بنا پر ایک مشہور موقعہ پر کہا گیا ہے، کہ "آزاد اُردوئے معلی کا ہیرو ہے"۔
انکی بےمثل انشا پردازی کو تعریف وتوصیف کی حاجت نہیں، نہ کسی کے قلم
میں اتنا زور ہے کہ اس کی خوبیاں دکھا سکے، نہ کسی کے ہاتھوں میں طاقت ہے
کہ اس کے معنوی حسن کو اُبھار سکے۔
سلاست وروانی، بیساختگی وبرجستگی اور سادگی وبےتکلفی انکی انشاپردازی
کے خاص محاسن ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے، معمولی الفاظ، سلیس فقرے، برجستہ
شستہ ترکیب ہوتی ہے، مگر اس کے ساتھ، بیان کی جدت، مضمون آفرینی و
بلند خیالی، ملکے وہ کام کرتی ہے جو جادو سے نہیں ہوتا۔ انسان مسحور ہوتا ہے
لیکن انکی تحریر، اور سادہ تحریر اس سے کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اثر کی

یہ حالت ہے کہ پڑھنے والے کا دماغ معطل ہوجاتا ہے۔ دماغ کا کام ہر بات میں غور و فکر کرنا ہے مگر انکا طرزِ بیاں، اس قدر دلکش و دلفریب، محیر و مبہوت کن ہوتا ہے کہ دماغ بیکار ہو جاتا ہے۔ ممکن نہیں آپ کسی موضوع پر آزاد کی تحریر پڑھیں اور اُن کے ہم خیال نہ ہوں۔

پھر انکی زبردست انشاپردازی کے کمال کا حال یہ ہے، کہ کسی علم و فن، کسی موضوع و صنف سے مخصوص نہیں، دنیا میں بہت سے ایسے انشاپرداز ہیں جو اخبار کے لئے صرف سیاسی مضامین لکھ سکتے ہیں، بہت سے تاریخ ہی پر زورِ قلم دکھا سکتے ہیں، بعض بزمیہ مضامین سپردِ خامہ کرتے ہیں، بہت سے صرف رزم ہی پر قلم اُٹھاتے ہیں، اکثر، خوشی و مسرت، بہجت و سرور کے مناظر خوب دکھاتے ہیں، بعضے غم و الم کی تصویر کھینچتے ہیں اور کچھ لوگ ظریفانہ مضامین لکھتے ہیں۔ کہ وہی قلم اُس مخصوص موضوع و طرز کے علاوہ دوسرے مضامین میں اتنا عاری ہو جاتا ہے، کہ چند سطریں لکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بالفرض لکھی بھی گئیں، تو کیسی کہ انشاپردازی کا ابجد خواں اس سے کہیں بہتر لکھ سکتا ہے۔ لیکن پروفیسر آزاد کو خداداد قدرت حاصل ہے، کہ بزم کا نقشہ دکھاتے ہیں تو راحتِ حیات کو مجسم کر کے سامنے لے آتے ہیں۔ رزم کی تصویر دکھاتے ہیں تو تلواروں کی چمک الفاظ میں آنے لگتی ہے۔ مسرت و انبساط کے مناظر دکھاتے ہیں، تو سرور مجسم آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں، کہ پڑھنے والے کے چہرے پر رونق اور آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ واقعات غم و الم بیان کرتے ہیں تو مخاطب کے نظام و موی میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے چہرہ بے رونق، زرد اور حرکت قلب بہت دھیمی ہو جاتی ہے۔ انکا قلم جس طرح مسائل علمیہ، فلسفہ، تاریخ اور تحقیق السنہ میں زور دکھا سکتا ہے، ویسے ہی لطائف و ظرائف میں۔ واقعات کے بیان میں جسطرح

قلم رواں ہوتا ہے، ویسا ہی قصص پر، بلکہ انکی انشا پردازی کا مسلمہ کمال یہ ہے کہ واقعات بھی اپنے طرز خاص میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ فسانہ کا لطف حاصل ہوتا ہے۔
انشا پردازی وادب کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ کسی علمی موضوع وفن پر اُس کے اصطلاحات اور بڑے بڑے دقیق جملے، مشکل الفاظ میں لکھنا مشکل نہیں، بلکہ انشا پردازی کی معراج کمال یہ ہے کہ کیسا ہی مضمون ہو، تاریخی ہو کہ معاشرتی، سیاسی ہو کہ تمدنی، فلسفیانہ ہو کہ نقادانہ، ایسی زبان وعبارت میں لکھا جائے کہ طبیعت پر گراں نہو وہی روزمرے ومحاورے ہیں، سلیس عبارت ہیں، شستہ ترکیب ہو اور بیاختہ جملے، برجستہ الفاظ ہوں اور پسندیدہ استعارے، یہ معلوم ہو کہ قلم سے الفاظ خود بخود نکل رہے ہیں۔

علامہ آزاد دہلوی کی تمام تصنیفیں ایسی ہی ہیں، تاریخی ہیں کہ ادبی۔ آپ جس قدر آب حیات سے لطف اندوز ہوں گے اُتنا ہی بلکہ اُس سے زائد، دربار اکبری سے آپ کو جو خوبی سخندان فارس میں نظر آئے گی وہی قند پارسی میں بید نصیحت کے کرن پھول" سے جتنا محظوظ ہوں گے، اُتنا نیرنگ خیال سے مسرور، سفرنامہ سے آپ اُتنا ہی خوش ہونگے جتنا مکتوبات آزاد سے۔

آزاد کی جن خصوصیات پر نظر پڑتی ہے، وہ تحقیق السنہ، بے تکلفی وسادگی اور آزاد کا انداز بیاں جس سے انکی ہر تحریر مرصع وزرنگار معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً برج بھاشا پر عربی وفارسی اثرات دکھلاتا ہیں، ایک عام انشا پرداز، تحقیق وتدقیق کرکے، پیچیدہ عبارت میں بیان کریگا، مگر تکلف وتصنع سے آزاد یوں لکھتا ہے:۔

"جب دو صاحب زبان قومیں باہم ملتی ہیں، تو ایک کے رنگ روپ کا دوسرے پر ضرور سایہ پڑتا ہے اگرچہ اُس کے اثر، گفتگو، لباس، خوراک نشست برخاست، مختلف رسوم پر بھی ہوتے ہیں، لیکن چونکہ مجھے اس مقام پر زبان سے غرض ہے"

اس لیے اس میں گفتگو کرتا ہوں ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم میں آتی ہے تو اپنے ساتھ ملک کی صدہا چیزیں ایسی لاتی ہے کہ جو یہاں نہیں تھیں، اشیاء مذکورہ کبھی ضروری اور کبھی ایسی باعث آرام ہوتی ہیں کہ انھیں استعمال میں لینا ضروریات زندگی سے نظر آتا ہے اس لئے یہ لوگ انھیں غنیمت سمجھکر لیتے ہیں اور بخوشی کام میں لاتے ہیں، ان اشیاء میں سے بہتیری چیزیں تو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں، اور بہتیری نئی ترکیب سے یا اول بدل کر یہاں نیا نام پاتی ہیں اور یہ پہلا اثر دوسری زبان کا ہے، اس کے علاوہ جب یہ دونو ایک جگہ رہ سہکر شیر و شکر ہوتی ہیں تو ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظ بھی گھل مل جاتے ہیں۔

جب مہمان و میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں تو ایک خوشنما اور مفید تبدیلی کے لئے رستہ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ طبع انسانی کے اتحاد سے سب کے خیالات متفق یا قریب قریب ہوں، مگر انداز بیان سب کا جدا جدا ہے اور طبیعت ہمیشہ نئے انداز کو پسند کرتی ہے، اس لئے ادائے مطلب میں ایک دوسرے کے انداز بیان سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، پھر نئی نئی تشبیہیں، لطیف استعارے لیکر اپنی پرانی تشبیہوں و مستعمل استعاروں کا رنگ بدلتے ہیں، اور جس قدر زبان میں طاقت ہے، ایک دوسرے کے خیالات اور نئی طرز کو لیکر اپنی زبان میں نیا مزہ پیدا کرتے ہیں۔

یہ انقلاب حقیقت میں وقت بوقت ہر ایک زبان پر گزرتا ہے، چنانچہ قوم عرب نے جو ایک زمانہ میں روم یونان اور ہسپانیہ وغیرہ سے خلط ملط ہوئی تھی، ہزاروں لفظ علمی اور غیر علمی وہاں سے لئے، اسی طرح فارسی زبان عربی و ترکی وغیرہ الفاظ سے مالا مال نظر آتی ہے، انگریزی کے باب میں مجھے کہنا زیبا نہیں، کیونکہ اب روشن ضمیر انگریزی خواں بہت ہیں، اور وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں،

مگر اتنا کہنا کافی ہے کہ جس طرح ایک مہذب سلطنت کو تمام ضروریات سلطنت کے کارخانے اور ملکی سامان ہونے چاہئیں۔ اسی طرح سب قسم کے الفاظ اور تمام ادائے خیالات کے انداز انگریزی زبان میں موجود ہیں۔

اب مجھے اپنی زبان میں گفتگو کرنی چاہیے، لیکن پھر یاد دلانا واجب ہے کہ اُردو کہاں سے نکلی ہے اور کیونکر نکلی ہے؟ اُردو زبان اول لین دین نشست برخاست کی ضرورتوں کے لئے پیدا ہوگئی، ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں کی اولاد تھے، ہندوستان کو وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی، اسی طرح کوئی زبان، بے شاعری کے نہیں رہ سکتی، محمد شاہی دور تھا، اور عیش وعشرت کی بہار تھی، ان شرفا کو خیال آیا ہوگا کہ جس طرح ہمارے بزرگ اپنی فارسی کی انشا پردازی میں گلزار دکھلاتے تھے، اب ہماری یہی زبان ہے ہم بھی اس میں کچھ رنگ دکھائیں، چنانچہ وہی فارسی کے خاکے اُردو میں اُتار کر غزل خوانیاں شروع کر دیں اور قصیدے کہنے لگے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ قوت بیان یا لفظوں کی تراش یا ترکیبوں کی خوبصورتی یا تشبیہہ اور استعاروں کی رنگینی، غرض اول جو کچھ نصیب ہوا شعرائے اُردو کی بدولت ہوا، اور یہی سبب ہے کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ٹکسالی زبان کے لئے درکار ہوتے ہیں، اُس سے یہ زبان مفلس رہی، کیونکہ اُس عہد میں، علوم وفنون، تاریخ، فلسفہ۔ ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لیئے بھی الفاظ ہوجاتے، جن جن باتوں کا چرچا تھا، اُن ہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے، ہاں یہ کہنا ضرور چاہیئے کہ جو کچھ ہوا تھا اپنے رنگ پر خوب ہوا تھا"۔ (آبحیات (۲۵ - ۲۶)

لوگ کہتے ہیں کہ علامہ آزاد تحقیق کے میدان کے مرد نہ تھے آئین اور دیکھیں کہ اس سے زیادہ تحقیق اور

کیا ہوسکتی ہے ، ملاحظہ ہو ، الفاظ کی کیسی چھان بین کی ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے ، اب ہمیں
پھر مطلب پر آنا چاہیے کہ بھاشا نے اردو کے کپڑے پہننے کے لئے فارسی
سے کیا کیا لیا؟

"(۱) اُن چیزوں کے نام لئے جو عرب اور فارس سے آئیں اور اپنے نام
اپنے ساتھ لائیں مثلاً ۔ لباس میں فرغل ، لبادہ ، کرتہ ، قبا ، چوغا ، آستین ،
گریبان ، پائجامہ ، ازار ، عمامہ ، رومال ، شال ، دوشالہ ، تکیہ ، گاؤ تکیہ ،
برقع ، پوستیں وغیرہ کھانے کے ذیل میں دسترخوان ، چپاتی ، شیرمال ،
باقرخانی ، پلاؤ ، زردہ ، مزعفر ، قلیہ ، قورمہ ، متنجن ، فرنی ، ماقوتی ، حریرہ ،
ہریسہ ، لوز ، مربے ، اچار ، فالودہ ، گلاب ، بیدمشک ، خوان ، طبق ،
رکابی ، تشتری ، کفگیر ، چمچہ ، سینی ، کشتی چائے جوش وغیرہ متفرقات میں ،
حمام ، کیسہ ، صابون ، شیشہ ، شمع ، شمعدان ، فانوس ، گلگیر ، تنور ، رفیدہ ،
مشک ، نماز ، روزہ ، عید ، شب برات ، قاضی ، ساقی ، حقہ ، نیچہ ، چلم ،
تفنگ ، تختہ نرد ، گنجفہ اور اُنکی اصطلاحیں یہ سب چیزیں ، اپنے نام
ساتھ لیکر آئیں ، بہت سی چیزیں آئیں کہ بھاشا میں ان کے نام نہیں ،
سنسکرت کی کتابوں میں ہوں گے پستہ ۔ بادام ۔ منقے ۔ شہتوت ۔ بیدانہ ۔
خوبانی ۔ زنجیر ۔ سیب ۔ بہی ۔ ناشپاتی ۔ انار وغیرہ ۔

(۲) بہت سے عربی فارسی کے لفظ کثرت استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ
بیٹھے ہیں کہ اب ان کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈھ کر
لانا پڑتا ہے مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہو جاتا ہے ، یا زبان ایسی
مشکل ہو جاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں نہیں آتی ۔ مثلاً
دلال ، فراش ، مزدور ، وکیل ، جلاد ، صراف ، مسخرا ، نصیحت ،

لحاف، توشک چادر، صورت، شکل، چہرہ، طبیعت، مزاج، برف، فاختہ، قمری، کبوتر، بلبل، طوطا، پر، دوات، قلم، سیاہی، جلاب، رقعہ، پلنگ، صندوق، کرسی، تخت، لگام، رکاب، زین، تنگ، پوزی، نعل، کوتل، عقیدہ، دغا، جہاز، مستول، بادبان، تہمت، درہ، پردہ دالان، تہ خانہ، ملاح، تازہ، غلط، صحیح، رسد، سرباری، کاریگر، ترازو، شطرنج کے باب میں تعجب ہے خاص ہند کا ایجاد ہے مگر عرب اور فارس سے جو پھر کر آئی تو سب اجزاء کے نام اور اپنی اصطلاحیں بدل آئی" ۔ (آبحیات ص۲۴)

یوں تو علامہ آزاد کی تمام کتابیں تحقیق و تدقیق بلند پردازی و جدت پسندی سے پر ہیں، مگر آبحیات، سخندان فارس، و دربار اکبری، وغیرہ اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ قابل تسلیم ہے کہ تاریخ میں انکی تحقیق بہت سطحی ہے، اور جو بات مولانا شبلی میں ہے وہ نہیں اور حق یہ ہے کہ اُردو میں انکا سا مورخ نہیں گذرا، لیکن جیسا کہ اس کے قبل عرض کر چکا ہوں، ہم کو بحث انشا پردازی سے ہے اور اس لحاظ سے خلاقین اُردو میں کوئی اُنکے آگے سر اونچا نہیں کر سکتا، یہ بھی غلط ہے کہ آزاد کی تمام تحقیق قابل اعتنا نہیں، بلکہ انکی تحقیق السنہ اس درجہ کی ہے، کہ کوئی مصنف اس کا دعوی انکے روبرو نہیں کر سکتا، مذکورہ بالا اقتباس سے اس کا ثبوت ملتا ہے، سچ ہے کہ آزاد نے آبحیات لکھکر اُردو پر بہت بڑا احسان کیا، کہ اُردو کی ایسی مکمل تاریخ موجود ہے، آبحیات فقط چند شاعروں کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ اُردو کی ایک مکمل تاریخ اور مسائل السنہ کا نایاب مجموعہ، بہت سے شاعروں کے تذکرے لکھے گئے، آجتک کوئی اتنا کامیاب تذکرہ لکھنے پر کامیاب نہیں ہوا، جن لوگوں نے آزاد کی تصانیف پڑھی ہیں، وہ اس لطف خاص سے باخبر ہونگے، کہ آزاد اپنی ساحرانہ انشا پردازی سے ہم کو براۓ العین جو کہتا ہے دکھا دیتا ہے، آپ نے اگر آبحیات دیکھا ہے، تو ضرور ابتک آنکھوں کے

سامنے میر وسودا، جرأت وانشا، قتیل ومصحفی، ناسخ وآتش، ذوق وغالب کے جلسے پھر رہیں ہونگے۔

آزاد نے پیچیدہ سے پیچیدہ، مشکل سے مشکل مسائل بیان کیے ہیں، مگر سب اپنے انداز خاص میں۔ شعر وشاعری کا بیان جس لطیف پیرایہ میں کیا ہے، کہا جا سکتا ہے، کہ اس کا جواب نہیں، ہزارہا لوگوں نے شعر وشاعری پر بحث کی، لیکن نہ اتنی پُر لطف،

ملاحظہ فرمائیے، "اتنا دقیق مسئلہ، اور یہ کوثر کی دُھلی ہوئی زبان" سبحان اللہ!

"وہ فلاسفہ یونان کہتے ہیں کہ شعر خیالی باتیں ہیں، جنکو واقفیت اور اصلیت سے تعلق نہیں قدرتی موجودات یا اُس کے واقعات کو دیکھکر جو خیالات شاعر کے دل مین پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے، اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی، جب صبح کا نور وظہور دیکھتا ہے، تو کبھی کہتا ہے دیگ مشرق سے دودھ اُبلنے لگا، کبھی کہتا ہے، دریائے سیاب موج مارنے لگا، کوئی مشرق سے کافور اُڑا آتا ہے، صبح تباشیر بکھیرتی آتی ہے، یا مثلاً سورج نکلا اور کرن ابھی اُس میں نہیں پلٹی ہوئی وہ کہتا ہے، سنہری گیند ہوا میں اُچھالی ہے، صبح طلائی تھال سر پہ دھرے آتی ہے، کبھی مرغان سحر کا غل۔ اور عالم نور کا جلوہ، آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کر کے صبح کی دھوم دھام دکھاتا ہے، اور کہتا ہے، بادشاہ مشرق سبز خنگ فلک پر سوار تاج مرصع رکھے، کرن کا نیزہ لیے مشرق سے نمودار ہوا، شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے تو کہتا ہے مغرب کی چھپر کھٹ مین آفتاب نے آرام کیا، اور زنگاری چادر تانکر سو رہا، کبھی کہتا ہے، جام فلک خون سے چھلک رہا ہے، نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی، تاروں بھری رات میں چاند دیکھتا ہے تو کہتا ہے "لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکے ہوئے ہیں، دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے اور روپے کی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں، غرض ایسی ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں مگر اصلیت سے انھیں کچھ بھی غرض نہیں ہے۔"

باوجود اس کے صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت صنائع الٰہی سے ہے، اسے دیکھکر عقل حیراں ہوتی ہے کہ اول ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھتے ہیں، اور نثر میں پڑھتے ہیں پھر اُسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھکر دیکھتے ہیں تو کچھ اور ہی عالم ہو جاتا ہے، بلکہ اُسمیں چند کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں،

(۱) وہ وصف خاص ہے کہ جسے سب موزونیت کہتے ہیں،

(۲) کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے، اور مضمون میں ایسی تیزی آجاتی ہے کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے،

(۳) سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں، اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ جب خوشی یا غم و غصہ یا کسی قسم کے ذوق و شوق کا خیال دل میں جوش مارتا ہے، اور وہ قوت بیاں سے ٹکر کھاتا ہے، تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے، جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے،

اسی واسطے شاعر وہی ہے جس کی طبیعت میں یہ صفت خدا داد ہو، قدرتی شاعر اگرچہ ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا ہے، مگر حقیقت میں اُس کا دل اور خیالات ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، قدرت کے کارخانے میں جو چیز اُس کے حواس میں محسوس ہوتی ہے، اور اُس سے جو کچھ اثر اُس کی طبیعت اُٹھاتی ہے، وہ ہر شخص کو نصیب نہیں، خواہ لطف و شگفتگی ہو، خواہ آزردگی یا بیزاری، یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وہ آپ اُٹھاتا ہے اُس کے لئے ڈھونڈھتا رہتا ہے کہ کیسے لفظ ہوں، اور کس طرح اُنھیں ترکیب دوں، تاکہ جو کیفیت اُس کے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے، وہی کیفیت سننے والوں کے دل پر چھا جائے اور وہ بات کھول کر اثر کر جائے۔ (آبحیات ص ۶۲-۶۳)

آزاد نے آبحیات کے شعراء کو پانچ دور پر تقسیم کیا ہے، ہر دور کے شروع میں تمہید لکھی ہے، اسکو دیکھیے، اُردو کے انشاپردازوں کو ایسے لطیف تشبیہ و استعارے نہ ملے ہونگے، عبارت کے جملوں کو اس دروبست سے ترتیب نہ دیا ہوگا، ترکیبوں کی بندش اس حسن و خوبی سے نہ کی ہوگی، میں تھوڑا تھوڑا سب میں سے اقتباس کرتا ہوں، پہلے دور کی تمہید میں تحریر فرماتے ہیں :-

"نظم اُردو کے عالم کا پہلا دور ہے، نفس ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالم وجود میں آئی تھی، مگر بچوں کی نیند سوتی تھی، ولی نے آکر ایسی میٹھی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لیکر کروٹ لی، اور اثر اُسکا دفعۃً حرارت برقی کی طرح دل میں دوڑ گیا، گھر گھر شاعری کا چرچا ہے، جس امیر اور شریف کو دیکھو شعر کی سوچ میں غرق بیٹھا ہے، ان بزرگوں کی باتیں تو انکے شعروں سے سن بھی سکتے ہو، مگر حیران ہوں کہ صورت دکھاؤں تو کیونکر، اول تو حرفوں میں تصویر کھینچنی مشکل اُس پر میں زبان کا اپاہج، اُس رنگ کے الفاظ کہاں سے لاؤں جو ایسے لوگوں کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر کھینچ دکھاؤں، کہ ادب کی آنکھ اُنکی متانت پر نظر نہیں اُٹھا سکتی اور محبت کی آنکھ اُنکی پیاری حالت پر سے نگاہ نہیں ہٹا سکتی، دیکھو جلسہ مشاعرہ کا اُمراء و شرفا سے آراستہ ہے، معقول معقول بڈھے ہیں اور جوان ہیں برابر لمبے لمبے جامے، موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں، کوئی کٹار بھی باندھے ہے، کوئی سیف لگائے ہے، بعض وہ کہن سال ہیں کہ جنکے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے، بعض ایسے ہیں کہ عالم جوانی میں اتفاقاً داڑھی کو رخصت کیا تھا، اب کیونکر رکھیں کہ وضعداری کا قانون ٹوٹتا ہے، اس پر خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ اونکے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے، ان شوخیوں سے انھیں اور کچھ مطلب نہیں ہے مگر یہ کہ اپنے اوپر آپ ہنسیں اور اوروں کو خوش کریں"

(آبحیات صفحہ)

دوسرے دور کی تمہید یوں لکھی ہے: ۔

"دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس فصل میں زبان کے حسن قدرتی کے لئے موسم بہار ہے یہ وہ وقت ہے کہ مضامین کے پھول گلشن فصاحت میں اپنے قدرتی جوبن دکھا رہے ہیں، حسن قدرتی کیا شے ہے، ایک لطف خداداد ہے جس میں بناؤ سنگار کا نام بھی آجائے تو تکلف کا داغ سمجھکر سات سات پانی سے دھوئیں، انکا گلزار نیچر کی گلکاری ہے صنعت کی دستکاری یہاں آکر قلم لگائے تو ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں اسمیں تو کلام نہیں کہ یہ باکمال بھی ایک ہی شہد کی مکھی ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ دریائے بحث میں ڈوبے ہوئے ہیں، مگر اس خوبی کا وصف کسی زبان سے ادا نہیں ہوتا، کہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے، جون کا توں ادا کرتے ہیں، خیالی رنگوں کے طوطا مینا نہیں بناتے، ہاں طوطی و بلبل کی طرح صاف زبان اور قدرتی الحان لائے ہیں، انھوں نے اپنے نغموں میں ۔ گٹکری، اُپج، پلٹی، تان کسی گویے سے لیکر نہیں ڈالی، تم دیکھنا! بے تکلف بول اور سیدھی سادی باتوں سے جو کچھ دل میں آئیگا ۔ ایسا بیساختہ کہدینگے، کہ سامنے تصویر کھڑی کر دیں گے، اور جبتک سننے والے سنینگے، کلیجے پکڑ پکڑ کر رہجائینگے ۔ اس کا سبب کیا ہے، وہی بیساختہ پن، جس کے سادہ پن پر ہزار بانکپن قربان ہوتے ہیں ع ہے حسن وہی جس میں بے ساختہ پن نکلے ۔"

(آبحیات صفحہ ۱۱۷)

تیسرے دور کی تمہید میں اس طرح موتی پرو دئیے ہیں: ۔

"اس مشاعرہ میں اُن صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے، جنکے پا انداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے، اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے، زبان اُردو ابتدا میں کچا سونا تھی، ان بزرگوں نے اُسے اکثر کدورتوں سے پاک صاف کیا، اور ایسا بنا دیا جس سے ہزاروں ضروری کام، اور آرائشوں کے سامان حسینوں کے

زیور، بلکہ بادشاہوں کے تاج وافسر تیار ہوتے ہیں، اگرچہ بہت سے مرصع کار
مینا نگار پیچھے آئے مگر اس فخر کا نو لکھا ہار انھیں بزرگوں کے گلے میں رہا، جب
یہ باکمال چمن کلام میں آئے، تو اپنے بزرگوں کی چمن بندی کی سیر کی،
فصاحت کے پھول کو دیکھا، کہ قدرتی بہار میں حسن خداداد کا جوبن دکھا رہا ہے،
چونکہ انھیں بھی، ناموری کا تمغا لینا تھا، اس لئے بڑوں سے بڑھکر قدم
مارنے چاہے، یہ گردوپیش کے میدانوں میں بہت دوڑے، سب پھول کام میں
آئے ہوئے تھے، جب سامنے کچھ نہ پایا، تو ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اٹھایا،
تم دیکھنا! وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے، آسمان سے تارے اتارین گے،
قدردانوں سے فقط داد نہ لین گے، پرستش لیں گے، لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری
کی طرح عارضی ہو، ان کے کمال کا دامن قیامت سے بندھا پاؤ گے، یہ اپنی صنعت
میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا، جیسے گلاب کے پھول پر شبنم، یا تصویر پر
آئینہ، انکا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کریگا، اس کی خوبی کا پردہ
نہ ہوگا، تم میر صاحب اور خواجہ درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہونگے، سودا کا
کلام باوجود بلندی مضمون اور چستی بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا" (صفحہ ۱۱۸)

چوتھے دور کی تمہید کے باغ میں یوں گل کھلائے ہیں:-

"دھوم دھام کی آوازیں آتی ہیں، دیکھنا اہل مشاعرہ آن پہونچے یہ کچھ اور لوگ ہیں
، انکا آنا غضب کا آنا ہے، ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہونگے، کہ جنکی شوخی
اور طراری طبع بار متانت سے ذرا نہ دبیگی، اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک
جائینگے، مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھا ئینگے، نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے،
انھیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھرینگے، ایک مکان کو دوسرے مکان سے
سجائینگے، اور ہر شئی کو رنگ بدل بدل کر دکھائینگے وہی پھول عطر میں بسائینگے،

کبھی ہار بنائیں گے، کبھی طرّے سجائیں گے، کبھی انھیں پھولوں کی گیندیں بنالائیں گے اور وہ گلبازی کرینگے، کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائینگے، ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھا ملیگا، ایسے قدر دان ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول انکا چمن زعفران کے مول بکیگا۔

اس دور میں میاں رنگین سب سے نئے گلدستے بناکر لائے اور اہل جلسہ کے سامنے سجائے یعنی ریختہ میں ریختی نکالی" صفحہ ۲۱۴

پانچویں دور کی تمہید یوں باندھی ہے :۔

"دیکھنا! وہ لالٹینیں جگمگانے لگیں، اٹھو اٹھو استقبال کرکے لاؤ، اس مشاعرہ میں وہ بزرگ آتے ہیں جن کے دیدار ہماری آنکھوں کا سرمہ ہوئے، اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے ایک وہ جنھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین آئین سمجھا، یہ انکے باغوں میں پھریں گے، پرانی شاخیں زرد پتے کاٹیں چھانٹیں گے اور نئے رنگ نئے ڈھنگ کے گلدستے بناکر گلدانوں سے طاق وایوان سجائیں گے، دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دخان سے ایجاد کی ہوائیں اڑائینگے، اور بیج آتشبازی کی طرح اس سے رتبۂ عالی پائیں گے، انھوں نے اس ہوا سے بڑے بڑے کام لئے، مگر غضب یہ کیا، کہ گرد و پیش جو وسعت بے انتہا پڑی تھی اس میں سے کسی جانب میں متوجہ نہ ہوئے، بالا خانوں ہی سے بالا بالا اڑ گئے"

(آبحیات صفحہ ۳۱۷ مجتبائی پریس)۔

آزاد انشا پردازی کا خدا ہے، مطالب کو الفاظ کی جن صورتوں میں چاہتا ہے، ظاہر کرتا ہے، عبارت کی درستی و چستی میں بندش، برجستگی جتنا ضرورت سمجھتا ہے، خرچ کرتا ہے، سلاست و صفائی میں خرادتا ہے، استعارے و تشبیہ کے رنگ دیتا ہے، از فکار روشن دیگر فضائے صفحات پر دماغوں اور عقلوں کو معطل اور

بیکار کرنے کے لئے، آنکھوں کو مجسم کر کے دکھانے کے واسطے، جلوہ نشین کرتا ہے،" "واقعات اس کے قلم کے غلام ہیں، قلم جہاں چاہتا ہے، ہاتھ باندھے بند ہائے قصوں کو کھینچے لاتا ہے، کبھی طوفان کی آندھیاں چلاتا ہے، کبھی نسیم کی ہلکی لہروں کو فضائے صفحات میں تیرنے کو بلا لیتا ہے"

دربار اکبری جو بقول خواجہ حسن نظامی صاحب "تاریخ کی کتاب بھی ہے اور ادب و انشا کا چمن بھی" اس میں آزاد نے صرف عامیانہ طریقہ سے اکبر کی سوانحمری نہیں لکھی ہے، بلکہ اکبر کے زمانہ کا مفصل حال لکھا ہے" "اس زمانہ کی تاریخ کو صرف شاہی کارناموں تک محدود نہیں کیا، بلکہ اس زمانہ کے رسم و رواج، طرز بود و ماند، ملک کی عام حالت رعایا کی مرفہ الحالی، اور دیگر خیالات کا نقشہ کھینچ کر پڑھنے والے کو یہ یقین دلایا ہے کہ وہ اس زمانہ میں زندگی بسر کر رہا ہے" اور اپنی آنکھوں سے تمام حالات کا مشاہدہ کر رہا ہے"[۱]

اکبر کے دربار کا نقشہ کھینچ کے دکھایا ہے، میدان رزم کے معرکے اور بزم کے جلسے اپنے انداز خاص میں لکھے ہیں، دیکھئے اردو میں ایسی نادر، بےمثل، کتاب موجود ہونے پر تعجب ہوتا ہے، حیرت تو یہ ہے، اردو بیچاری جس کا سرمایہ ناز ابھی تک غالب کے رقعات "اردوئے معلی" تھے ایسی ترقی کر جائے، ایک دم سے ایسے بلند مقام پر پہونچ جائے، کہ اس سے زیادہ رفعت نہیں، جس کے آگے سب پستی ہے، یعنی جس انداز میں دربار اکبری لکھی ہے یہ امر بالکل طے شدہ ہے کہ آزاد ہی اردو کے انشا پرداز وہ نہیں سب سے پہلے شخص ہیں، جنھوں نے نثر کو نظم کا ہم پایہ بنا دیا، اور "الفضل للمتقدم" کا شرف انھیں کو حاصل ہے، کہ انشا پردازی میں اتنی قوت پیدا کی کہ ہر قسم کے مطالب ادا ہو سکیں۔

---

[۱] الناظر بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۱۲ء۔

انکی انشا پردازی میں یہ قوت خاص ہے، کہ ہر قسم ورنگ، ہر نوع اور ڈھنگ کے مطالب اُسی حسن وخوبی کے ساتھ جیسا کہ حق ہے ادا کرتے ہیں۔ اُردو کے بہت کم انشا پرداز یہ دعویٰ کر سکتے ہیں، کہ اپنے مافی الضمیر کو سلاست وروانی کے ساتھ ادا کرسکیں مورخوں اور سوانح نگاروں نے بادشاہوں کے تخت نشینی وتاج پوشی کے جشن دکھانے میں زور قلم خرچ کیا ہوگا، اور صفحے کے صفحے رنگے ہونگے، مگر آزاد کی اس بے تکلف وتصنع عبارت سے زیادہ اثر پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے ہونگے، سچ تو یہ ہے کہ مورخ زیادہ سے زیادہ یہی لکھیگا، کہ سنہ فلاں میں عنان حکومت ہاتھ میں لی، مگر ایک انشا پرداز اپنے ممدوح کو یوں تخت نشیں کرتا ہے"

"بموجب اتفاق رائے جمعہ کے دن ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ نماز کے بعد تیموری تاج نے اکبری اقبال کے رنگ میں جلوہ دکھایا، اسوقت اس کی عمر شمسی حساب سے ۱۳ برس نو مہینے کی اور قمری حساب سے ۱۴ برس کئی مہینے کی تھی، بموجب آئین چنگیزی وتیموری کے تمام رسمیں جشن شاہانہ کی ادا ہوئیں۔ بہار نے پھول برسائے، آسمان نے تارے اُتارے۔ اقبال نے خیر سنگہ سر پر سایہ کیا، اُمراء کے منصب بڑھے خلعت انعام جاگیریں تقسیم ہوئیں، فرمان جاری کئے۔" (دربار اکبری صفحہ ۱۲)

ہیموں بقال اور فوج شاہی میں جو جنگ ہوئی اسکو یوں شروع کیا ہے:

"لڑائی شروع ہوئی، پہلے توپ وتفنگ کے گولوں نے لڑائی کے پیغام پہنچائے نیزوں کی زبانیں جنبش میں آئیں، تھوڑی ہی دیر میں لشکر شاہی کا ہراول اور داہنا ہاتھ آگے بڑھا اور اس زور سے ٹکر ماری کہ اپنے سامنے کے حریفوں کو اُلٹ کر پھینک دیا۔"

مہرالنساء یعنی نورجہاں کا واقعہ اتنا دلچسپ ہے، کہ ایک صائب الرائے اہل قلم[1] کا اس کے متعلق خیال ہے:۔ کہ پروفیسر آزاد نے جس خوبصورتی سے اسکو

[illegible]

دکھایا ہے انشاپردازی کو آجتک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے" ۔ وہ واقعہ یہ ہے:۔
"دنیا کے معاملات سخت نازک ہیں، کوئی بات ایسی نہیں جس کے فوائد کے ساتھ نقصان کا
کھٹکا نہ لگا ہو، اسی آمدورفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خان کوکہ کی بیٹی پر آیا
اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا غنیمت ہوا کہ ابھی شادی نہ ہوئی تھی، اکبر نے خود
شادی کردی، لیکن قابل عبرت وہ معاملہ ہے جو کہن سال بزرگوں سے سنا ہے یعنی
یہی مینا بازار لگا ہوا تھا، بیگمات پڑی پھرتی تھیں جیسے باغ میں قمریاں یا ہریاول
میں ہرنیاں، جہانگیر ان دنوں نوجوان لڑکا تھا، بازار میں پھرتا ہوا چمن میں آنکلا
ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا ۔ سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ عالم کے سرور میں بہت
بھایا ۔ چاہا کہ توڑے ۔ دونوں ہاتھ رکے ہوئے تھے، وہیں ٹھہر گیا ۔ سامنے سے
ایک لڑکی آئی ۔ شہزادہ نے کہا کہ لو ذرا ہمارے کبوتر لے لو ۔ ہم وہ پھول توڑلیں
لڑکی نے دونوں کبوتر لے لئے ۔ شہزادہ نے کیاری میں جاکر چند پھول توڑے ۔ پھر کر آیا
تو دیکھا لڑکی کے ہاتھ میں ایک کبوتر ہے، پوچھا دوسرا کبوتر کیا ہوا؟ عرض کی صاحب عالم!
وہ تو اڑ گیا، پوچھا، ہیں! کیونکر اڑ گیا، اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسری مٹھی بھی کھول دی اور کہا
کہ حضور یوں اڑ گیا! اگرچہ دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے گیا، مگر شہزادے کا دل اس انداز پر
لوٹ گیا، پوچھا، تمھارا نام کیا ہے؟ عرض کی، مہرنسا خانم، پوچھا تمھارے باپ کا
کیا نام ہے؟ عرض کی مرزا غیاث، حضور کا ناظم بیوتات ہے، کہا، اور امرا کی
لڑکیاں محل میں آیا کرتی ہیں، تم ہمارے ہاں نہیں آتیں؟ عرض کی میری
اماں جان تو آتی ہیں، مجھے نہیں لاتیں، ہمارے ہاں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں
نکلا کرتیں، آج بھی بڑی منتوں سے یہاں لائی ہیں، کہا تم ضرور آیا کرو، ہمارے ہاں
بڑی احتیاط سے پردہ رہتا ہے کوئی غیر نہیں آتا"
وہ سلام کرکے رخصت ہوئی ۔ جہانگیر باہر آگیا، مگر دونوں کو خیال رہا،

تقدیر کی بات ہے، کہ پھر جو مرزا غیاث کی بی بی بیگم کے سلام کو محل میں جانے لگی، تو بیٹی کے کہنے سے اُسے بھی ساتھ لیا، بیگم نے دیکھا، بچپن کی عمر اُس میں ادب قاعدے کا لحاظ، سلیقہ اور تمیز اُس کی بہت بھلی معلوم ہوئی، باتیں چھبیں پیاری لگیں، بیگم نے بھی کہا کہ اسے تم ضرور لایا کرو، آہستہ آہستہ آمد و رفت زیادہ ہوئی، شہزادے کا یہ عالم کہ جب وہ ماں کے پاس آئے تو وہاں موجود، وہ دادی کے سلام کو جائے تو یہ وہاں حاضر، کسی نہ کسی بہانے سے خواہمخواہ اُس سے بولتا، بات چیت کرتا تو اُس کا طور ہی کچھ اور، نگاہوں کو دیکھو تو انداز ہی کچھ اور۔ غرض بیگم تاڑ گئی اور خلوت میں بادشاہ سے عرض کی، اکبر نے کہا مرزا غیاث کی بی بی کو سمجھا دو چندے وہ لڑکی کو یہاں نہ لائے، اور مرزا غیاث سے کہا کہ لڑکی کی شادی کر دو،

جب خان خاناں بھکر کی مہم پر تھا تو طہماسپ قلی بیگ ایک بہادر نوجوان شریف زادہ ایران سے آیا تھا، اور مہم مذکور میں کارنمایاں کر کے اُس کے مصاحبوں میں داخل ہو گیا تھا، وہ شریف نواز شرافت پرست اُسے ساتھ لایا تھا اور حضور میں اُس کی خدمتیں عرض کر کے دربار میں داخل کیا تھا، اُس نے شجاعت اور دلاوری کے دربار سے شیر افگن خاں کا خطاب حاصل کیا تھا، بادشاہ نے اُس کے ساتھ نسبت ٹھہرا دی، اور جلد ہی شادی کر دی، یہی شادی اُس جواں نامراد کی بربادی تھی، تدبیریں کوتاہی نہیں ہوئی، تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے؟ انجام اُس کا یہ ہوا کہ جو نہ ہونا تھا، سو ہوا، شیر افگن خان موت کا شکار ہو کر جوانمرگ دنیا سے گیا، مہرنسا بیوہ ہوئی چندر روز کے بعد جہانگیری محلوں میں آ کر نور جہاں بیگم ہو گئی،

افسوس نہ جہانگیر رہے نہ نور جہاں رہیں، ناموں پر دھبا رہ گیا + صفحہ ۱۵۶۔

رزم کی تصویر اس طرح کھینچی ہے، یہ کہہ سکتے ہیں، کہ کسی انشاپرداز نے ایسی تصویر نہ کھینچی ہوگی، یوں دکھانے کو خون کے دریا بہا دئے ہوں، کشتوں کے

پشتے لگا دیے ہوں، مگر ایسا واقعی نقشہ، میدان رزم کا کسی نے نہ کھینچ دکھایا ہوگا، کتنے لطیف استعارے اور باکیفیت تشبیہیں ہیں، پھر یہ محاورہ و روزمرہ؛ :-

سیستانی رستم نے جب حریف کی آمد آمد سنی تو حواس ودڑائے، لیکن بادشاہ کے آنے یا کمک منگانے کا کچھ خیال نہ کیا، فوج کو تیاری کا حکم سنایا اور امرا کو جمع کرکے مجلس مشورت آراستہ کی، میدان جنگ کے پہلو تقسیم کئے، پہلے ہی خبر آئی تھی، کہ ہیموں پیچھے آتا ہے، شادی خان سپہ سالاری کرتا ہوا فوج کو لاتا ہے، دفعتاً پرچہ لگا، کہ ہیموں خود ہی ساتھ آیا ہے، پانی پت سے ایک پڑاؤ آگے بڑھ کر گھرونڈہ پر مورچے باندھے ہیں، خان زماں کا آگے بڑھنے کا ارادہ تھا۔ مگر تھم گیا، اور شہر سے ہٹ کر مقابلے پر لشکر جمایا، چاروں پہلو امرا پر تقسیم کرکے فوجوں کا قلعہ باندھا، بیچ میں آپ اقبال کا نشان علم کیا، ایک بڑا سا چتر تیار کیا، اُسے اپنے سر پر لگایا، اور سپہ سالاری کی شان بڑھا کر قلب میں جا کھڑا ہوا، لڑائی شروع ہوئی، اور میدان کارزار گرم ہوا، طرفین کے بہادر بڑھ بڑھ کر تلواریں مارنے لگے، خان زمانی جان نثار بے جگر ہو کر حملے کرتے تھے، اور تلوار کی آنچ پر اپنی جان دے دے مارتے تھے، مگر باوجود اس کے کامیاب نہ ہو سکتے تھے، دھاوا کرتے تھے اور بکھر جاتے تھے، کیونکہ کم تھے، لیکن سیستانی شیر کا رعب سب کے دلوں پر چھایا ہوا تھا، کسی طرح باز نہ آتے تھے، رہ تے تھے، مرتے تھے، اور شیروں کی طرح بپھر بپھر کر جا پڑتے تھے،

ہیموں ہوائی[1] ہاتھی پر سوار، قلب لشکر کو سنبھالے کھڑا تھا، اور فوج کو لڑا رہا تھا۔ آخر کامیابی کا انداز دیکھ کر اُس نے ہاتھی ہول دئے، کالے پہاڑوں نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور کالی گھٹا کی طرح آئے، اکبری نمک خوار خاطر میں نہ لائے، بھاگے مگر ہوش و حواس سے، کالے پانی کے سیلاب کو رستہ دیا اور لڑتے بھڑتے،

---

[1] ہیموں کے ہاتھی کا نام ہوائی تھا، منہ

ہٹتے چلے گئے، لڑائی کے وقت لشکر کا رُخ اور دریا کا بہاؤ ایک حکم رکھتا ہے جدہر کو پھر گیا، پھر گیا، غنیم کے ہاتھیوں کی صف بادشاہی فوج کے ایک پہلو کو ریلتی ہوئی لیگئی، خان زماں اپنی جگہ کھڑا تھا، اور سپہ سالاری کی دوربین سے نظر دوڑا رہا تھا، اُس نے دیکھا، کہ سیاہ آندھی جو سامنے سے اُٹھی، برابر کو نکل گئی، اب ہیموں قلب لشکر کو لئے کھڑا ہے، یکبارگی فوج کو للکار کر حملہ کیا، حریف ہاتھیوں کے حلقے میں تھا، اور گرد بہادر افغانوں کا غول تھا، اُس نے پھر بھی، حلقے ہی کو ریلا، ترک تیروں کی بوچھار کرتے ہوئے بڑھے، اُدھر سے ہاتھی تلواریں سونڈوں میں پھراتے اور زنجیریں جھُلاتے آگے آئے۔ اس وقت علی قلی خاں آگے بیرم خانی جوان جانفشانی کر رہے تھے، جن میں حسین قلی خاں اس کا بھانجا سپہ سالار تھا، اور شاہ قلی محرم وغیرہ مصاحب سردار تھے، سچ یہ ہے کہ بڑا ساکھا کیا اور ہاتھیوں کے حملے کو حوصلے اور ہمت سے روکا، وہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھے، اور جب دیکھا کہ گھوڑے ہاتھیوں سے بدکتے ہیں تو کود پڑے اور تلواریں کھینچکر صفوں میں گھُس گئے، اُنھوں نے تیروں کی بوچھاڑ سے سیاہ دیوزادوں کے منہ پھیر دئے اور کالے پہاڑوں کو خاک تو وہ سا بنا دیا، عجب گھمسان کا رن پڑا۔ ہیموں کی بہادری قابل تعریف ہے، وہ ترازو باٹ کا اُٹھانے والا دال چپاتی کا کھانے والا ہودے کے بیچ میں ننگے سر کھڑا تھا، فوج کا دل بڑھاتا تھا اور فتح کا منتر جو کسی گیانی گنوار یا پنڈت بدیادان نے بتایا تھا، جپے جاتا تھا فتح شکست خدا کے اختیار ہے، سپاہ کا ستھراؤ ہو گیا، شادی خاں افغان اس کے سرداروں کی ناک تھا کٹ کر خاک پر گر پڑا، فوج اناج کے دانوں کی طرح کھنڈ گئی، پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری، ہاتھی پر سوار چاروں طرف پھرتا تھا، سرداروں کے نام لے لے کر پکارتا تھا کہ سمیٹ کر پھر جمع کر لے اتنے میں ایکا ایکی قضا کا تیر اس کی بھینگی آنکھ میں ایسا لگا کہ باہر نکل گیا، اُس نے اپنے ہاتھ سے

تیر کھینچکر نکالا، اور آنکھ پر رومال باندھ لیا، مگر زخم سے ایسا بیقرار اور بے حواس ہوا کہ ہودے میں گر پڑا، یہ دیکھکر اس کے ہوا خواہوں کے جی چھوٹ گئے، سب تتر بتر ہو گئے اکبر کے اقبال اور خان زمان کی تلوار پر اس مہم کا فتح نامہ لکھا گیا۔ (۲۰۲-۲۰۳)۔

خان زماں کی شجاعت و بہادری اس طرح دکھائی:۔

خان زماں لکھنؤ کے مقام میں تھا، کہ حسن خاں ۲۰ ہزار آدمی سے آیا، اور خان زماں کے پاس کل تین چار ہزار فوج، افغان دریائے سروہی سے اُتر آئے، بہادر خاں کی فوج نے گھاٹ پر روکا، خان زماں کھانا کھاتا تھا، خبر آئی کہ غنیم آن پہونچا، یہ ہنسکر کہتے ہیں کہ ایک بازی شطرنج تو کھیل لو، مزے سے بیٹھے ہیں اور چالیس چل رہے ہیں، پھر خبر دار نے خبر دی کہ غنیم نے ہماری فوج کو ہٹا دیا، آواز دی، ہتھیار لانا، بیٹھے بیٹھے ہتھیار سجے، جب خیمے ڈیرے لٹنے لگے اور لشکر میں بھاگڑ پڑی، تب بہادر خاں سے کہا کہ اب تم جاؤ، وہ آگے گیا، دیکھے تو دشمن دست و گریبان ہے جاتے ہی چھری کٹاری ہو گیا، پھر آپ تھوڑے سے رفیق کہ رکاب میں تھے، لیکر چلا، نقارہ پر چوٹ مار کر جو گھوڑے اُٹھائے تو اس کڑک کے ساتھ سے پہنچا کہ غنیم کے قدم اُٹھ گئے اور ہوش اُڑ گئے، ان کے انبوہ کو گٹھڑی کر کے پھینک دیا، افغان اس طرح بھاگے جاتے تھے جیسے گلہ بائے گوسپند، ستاکوس تک فرش کرتا چلا گیا کشتے کے پڑے تھے، اور زخمی لوٹتے تھے، سبد لیا و ردل سنگار اس لڑائی کے ہاتھیوں میں ہاتھ آئے تھے" صفحہ ۲۰۴

۹۷۹ھ میں بداؤں میں آگ لگنے کا سماں ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

وہ اس سال بداؤں میں بڑی آگ لگی، اور اتنے بندے خدا کے جل گئے کہ گنے نہ گئے سب کو چھکڑوں میں بھر کر دریا میں ڈال دیا، ہندو مسلمان کچھ معلوم نہ ہو

سے نہ تھے موت کی آنچ تھی، ہائے جان بڑی پیاری چیز ہے، مرد عورت فصیل پر
چڑھے اور باہر کود پڑے، جو بچ گئے، وہ جلے بھُنے، لنگڑے لولے رہے، اپنی
آنکھوں سے دیکھا، پانی آگ پر تیل کا کام کرتا تھا، شعلے دھڑ دھڑ کرتے تھے، اور
دور تک آواز سنائی دیتی تھی، آگ نہ تھی، خدا کا قہر تھا بہتوں کو خاک کر کے
پامال کر دیا، بہتوں کو گوشمالی دیدی، چند روز پہلے ایک مجذوب میاں دو آب کے
علاقہ سے آیا تھا میں نے اُسے گھر میں اُتارا، باتیں کرتے کرتے ایک دن کہنے لگا،
کہ یہاں سے نکل جا، میں نے کہا کیوں؟ بولا کہ یہاں خدائی کا تماشا نظر آئیگا،
خراباتی تھا، مجھے یقین نہ آیا (صفحہ ۴۳۳)۔

غربت و فلاکت، مصیبت اور آفت کے مناظر اس سے زیادہ بہتر طریقے سے دکھانا یقیناً ناممکن ہے؟۔

وہ اس حالت کی تصویر سے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ باپ دربار سے
رخصت ہو کر حج کو چلا گیا، گجرات پٹن پر ڈیرے ہیں، ابھی سورج جھلکتا ہے،
شام قریب ہے۔ خیال یہ کہ اب خانخاناں آتا ہے، خبر آئی کہ وہ تو مارا گیا،
اس کے مرتے ہی فوج میں تلاطم مچ گیا، پل کے پل میں گھر بار افغانوں نے
لوٹ لیا، کوئی گٹھری لئے جاتا ہے، کوئی صندوقچہ، کسی نے سند گھسیٹ لی
کوئی بچھونا لے چلا، اُس بیکس مردے کے کپڑے تک اُتار لئے، لاش بے جاں کو
کفن کون دے کہ اپنی ہی جان کا ہوش نہیں، وہ تین برس کی جان (مرزا
عبدالرحیم خانخاناں) کیا کرتا ہوگا؟ سہم کر رہ جاتا ہوگا، ماں کی گود میں
دبک جاتا ہوگا، ڈرتا ہوگا، انا کے پاس چھپ جاتا ہوگا، افسوس وہ بیچاریاں
کہاں چھپا لیں کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں، الٰہی تیری پناہ عجب وقت ہوگا،
شام غریباں اسی کو کہتے ہیں، رات قیامت کی رات گذری ہوگی، دن ہوا

توروز محشر" (صفحہ ۹۹ مرزا عبدالرحیم خانخاں)۔
نئی روشنی کا خاکہ کس ظرافت آمیز سنجیدگی میں اُڑایا ہے، رئیس کی تشریح کرتے ہوئے، تحریر فرماتے ہیں:۔

ہمارے شاہاں وقت تو اس سے ("رئیس") اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ ایک شخص نے مہم حبش یا کابل پر جاکر کبھی کسی سڑک یا عمارت کا ٹھیکہ لیکر کبھی نہر کی نوکری کرکے بہت سا روپیہ کما لیا ہو، وہ اپنے گھر بیٹھا ہے، بگی پر چڑھ کر ہوا کھاتا ہے، جب شہزادہ عالم ولایت سے آتے ہیں، یا کوئی لاٹ صاحب جاتے ہیں یا صاحب کمشنر ایک گنج بناتے ہیں اس میں سب سے زیادہ چندہ دیتا ہے، یہ سرکار میں رئیس ہے، اور اسے دربار میں کرسی ملنے کا بھی حکم ہے، صاحب ڈپٹی کمشنر نے ایک موری کھدی نکالی کہ جس میں تمام شہر کی کثافت نکل جائے، اس نے اس میں پہلے سے زیادہ چندہ دیا بس یہ بڑا صاحب ہمت رئیس ہے، اسے خان بہادر یا رائے بہادر کا خطاب بھی ملنا چاہیے، اور میونسپل ممبر بھی ہو اور آنریری مجسٹریٹ بھی اگر کوئی تحصیلدار یا سررشتہ دار جتاتا ہے کہ خداوند اس میں اہل خاندان اور اہل ریاست کی دل شکنی ہوگی، صاحب کہتے ہیں: دل یہ ہمت والا لوگ ہے یہ رئیس ہے، اگر وہ رئیس ہونا چاہتے ہیں تو ہمت دکھائیں ہم اُسے ستارۂ ہند بنائیں گے، تب وہ دیکھیں گے کہ نئے رئیس کا یہ عالم ہے کہ جب گھر سے نکلتے ہیں، تو چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہ ہمیں کون کون سلام کرتا ہے اور سب کیوں نہیں کرتے، خصوصاً جن لوگوں کو خاندانی سمجھتے ہیں، اُنھیں زیادہ تردد باتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہماری ریاست جبھی ثابت ہوگی، جب یہ جھک کر سلام کریں گے اب مجسٹریٹی، شہر کا انتظام اُنکے ہاتھ میں ہے سبکو جھکنا دا جب پڑا نہ جھکیں تو رہیں کہاں، مگر اس کی شیخیوں، اور قودوں اور

بار بار کے دباؤ کھانے سے فقط خاندانی ہی تنگ نہیں بلکہ اہل محلہ تنگ ہیں ، جنھوں نے اصل خاندانیوں کے بزرگوں کو دیکھا ہے ، وہ انھیں یاد کر کے روتے ہیں ، اور جو بھول گئے تھے ، اُنکے دلوں میں محبت کے مٹے ہوئے حرف روشن ہوجاتے ہیں ، اہل نظر نے ایسے رئیسوں کا انگریزی رئیس اور انگریزی اشرافت نام رکھا ہے ،

آجکل رئیس کا لفظ کبھی کبھی اپنے جلسوں میں بھی ہمارے کانوں تک پہنچتا ہے ، یہ کیفیت بھی سننے کے قابل ہے ، مثلاً دو بزرگ سفید پوش ایک جلسہ میں آئے ، ایک میر صاحب ۔ ایک مرزا صاحب "آئیے تشریف رکھئے" میر صاحب اہل جلسہ سے کہتے ہیں جناب آپ نے ہمارے مرزا صاحب سے ملاقات کی ، حضرت مجھے تعارف نہیں ! جناب آپ دہلی کے رئیس ہیں ، مرزا صاحب ایک طرف دیکھکر کہتے ہیں ، قبلہ ! ہمارے میر صاحب سے آپکی ملاقات ابتک نہیں ہوئی ! جناب بندہ تو محروم ہے ! "آپ لکھنؤ کے رئیس ہیں" اب لکھنؤ میں جاکر پوچھئے میر صاحب کہاں رہتے ہیں ، کچھ ہوں تو پتا لگے ، ماں ٹینی باپ کلنگ ، بچے دیکھو رنگ برنگ ، لاحول ولا قوۃ ، مرزا صاحب کو دہلی میں ڈھونڈئیے تو "باپ دُھنیا ماں پُدینا ، بٹیا مرزا انیا" نئی روشنی اصلیت کا اندھیر جو چاہے بن جائے ، (صفحہ ۵۷۳) ۔

محبت کی کتنی بلیغ تعریف کی ہے ! ۔

محبت تم جانتے ہو ؟ کیا شئی ہے ؟ ایک اتفاقی پسند ہے ، تمھیں ایک شئی بھلی لگتی ہے ، دوسرے کو بھلی نہیں لگتی ، کیا تم چاہتے ہو کہ جو چیز تمھیں بھاتی ہے وہی سبکو بھائے یہ بات کیونکر چل سکیگی ۔

چاروں کا مقابلہ

علامہ آزاد کی شخصیت بحیثیت انشا پردازی اتنی عظیم و برتر ہے، کہ انکا کسی سے مقابلہ کرنا ہی سرے سے غلط ہے، اُنکے ہمعصر انشا پردازوں نے آجتک اُنکی برابری کا دعویٰ کیا، نہ اُن کے بعد کسی کی یہ جرأت ہوئی، جہانتک انشا پردازی کا تعلق ہے، شبلی و حالی اور مولوی نذیر احمد میں کوئی ایسا نہیں، جسکو مد مقابل سمجھا جائے، بہت سے لوگ اس بات پر ناک بھوں چڑہائیں گے، مگر حقیقت سے انکار و اغراض ایک ناممکن سا ہے،

اگرچہ کہی ہوئی بات کا بار بار کہنا، چبائے ہوئے نوالوں کا چبانا ہے، جیساکہ اس کے قبل عرض کر چکا ہوں، کہ انکے باہم مقابلہ کرتے وقت دوسری خصوصیت کو وجہ ترجیح بنانا بالکل غلط ہے، ہم کو ان چاروں کا مقابلہ محض انشا پردازی میں کرنا چاہیئے۔

یہ مانا کہ مولانا شبلی کی تصانیف اُردو کی بہترین کتابیں ہیں، انکی تاریخ دانی سے انکار نہیں، مگر انشا پردازی میں ہرگز علامہ آزاد کا ساتھ نہیں دے سکتے، مولانا شبلی کی کل کتابوں میں سے الفاروق چوٹی کی تصنیف ہے، اور حق یہ ہے کہ خوب داد تحقیق دی ہے، اسمیں حضرت عمر فاروق کی ولادت ان الفاظ میں بیان کی ہے،

> حضرت عمر مشہور روایت کے مطابق ہجرت نبوی سے ۴۰ برس قبل پیدا ہوئے اونکی ولادت اور بچپن کے حالات بالکل نامعلوم ہیں، حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں عمرو بن عاص کی زبانی ایک روایت نقل کی ہے کہ میں چند احباب کے ساتھ ایک جلسے میں بیٹھا ہوا تھا، کہ دفعۃً ایک غل اُٹھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ

خطاب کے گھر بیٹا پیدا ہوا" اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر کے پیدا ہونے پر غیر معمولی خوشی کی گئی تھی" (الفاروق صفحہ ۱)۔
اس سے زیادہ کوئی مورخ نہیں لکھ سکتا جتنا کہ مولانا شبلی نے تحریر فرمایا، لیکن ایک انشاپرداز اور خالص انشاپرداز اپنے ممدوح کے پیدا ہونیکا حال یوں قلمبند کریگا، اس سے اچھے الفاظ میں غالبًا ہماری انشاپردازی نے آجتک کسی بڑے سے بڑے انسان کے پیدا ہونیکا حال نہیں لکھا، پروفیسر آزاد ابوالفضل کی پیدائش کا بیان ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں :۔

"۶ محرم ۹۵۸ھ اسلام شاہ کا عہد تھا کہ شیخ مبارک کے گھر میں مبارک سلامت کا چرچا ہوا، ادب نے آنکھ دکھائی کہ خاموش! دیکھو ادب و دانش کا پتلا پردۂ شکم سے نکل کر ماں کی گود میں آن لیٹا، باپ نے اپنے استاد کے نام پر بیٹے کا نام ابوالفضل رکھا، مگر وہ فضل و کمال میں اس سے کئی آسمان اوپر چڑھ گیا"

یہی حال حالی و نذیر احمد کا ہے، حالی کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز انکی جدید شاعری ہے، جس کے آدم سمجھے جاتے ہیں، حالانکہ یہ مسلمہ امر ہے، جس کو مولانا حالی نے بھی تسلیم کیا ہے، کہ جدید شاعری کی داغ بیل علامہ آزاد ہی نے ڈالی ہے' اور اس کی اولیت کا سہرا آزاد ہی کے سر بندھتا ہے، انکی مثنویاں کئی ہیں، اور سب لاجواب، ایک مثنوی موسم زمستان ہے جس کے ابتدائی شعر ہیں،

ہے جواں لیتا اسی شب میں جوانی کا مزا	اور جو بڈھا ہے لیتا ہے کہانی کا مزا
شب سرما ہی میں ہے گانے بجانے کا مزا	پان کھانے کا، گلوری کے چبانے کا مزا
ہند کو کابل و کشمیر بنا دیتا ہے	ملک تاتار کی تصویر بنا دیتا ہے

اس کے علاوہ مثنوی ابر کرم، مثنوی شب قدر وغیرہ موجود ہیں، غرضکہ جس طرح نثر میں پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اردو میں ہر قسم کے مضامین لکھے

ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے، اسی طرح، آجکل کی شاعری بھی آزاد ہی کی کاوشوں کی مرہون منت ہے مصنف "افادات مہدی" نے ان چاروں کا باہم مقابلہ کرتے ہوئے کیا ہی، مناسب اور واقعی بات کہی ہے، کہ نذیر احمد بلا مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہجائیں گے، حالی بھی جہانتک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں، لیکن آقائے اُردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جنکو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں،

مولانا شبلی خود فرماتے ہیں،

آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں تاہم ادھر اُدھر گپیں ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے،

حالی بھی آزاد کی اُستادی کا لوہا مانتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جارہا ہے، یعنی لٹریچر کے رقبہ کا طول و عرض بڑھ گیا، لیکن اسکا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا، یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی، لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کردی،

وہ نیرنگ خیال کی بہت کچھ داد دی ہے کیونکہ آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم و تشخیص کی، اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور فضائل انسانی کے فطری خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں جن سے اُردو لٹریچر ابتک خالی تھا، (افادات مہدی صفحہ ۳۰۹)۔

اب رہجاتا ہے اُردو کی خدمت کا سوال، اس میں بھی شمس العلما مولانا آزاد کسی سے پیچھے نہیں ہیں، بلکہ جو خدمات آپ نے اُردو کی، کی ہیں، یقیناً کسی سے نے

نہیں کی، اُردو کی خدمت یہ نہیں ہے کہ اس میں تصانیف کی طویل فہرست کا مالک ہو، بلکہ اُردو کی خدمت اور سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اُردو کو عام فہم بنایا جائے، اور لوگوں کی طبیعتوں میں اس کا ذوق پیدا کیا جائے،

آزاد نے تعلیم ہی میں زندگی بسر کی، اور انکی خدمت کا نتیجہ ہے، کہ پنجاب میں اُردو اس قدر رائج ہے، پنجاب کے باشندے جنکو اُردو دانی کا دعویٰ ہے اتسلیم کرتے ہیں کہ ہم کو حکمت اُستاد آزاد نے اُردو سکھائی، اور اُنھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اُردو نے پنجاب میں رواج پایا،

اس کا سبب دریافت کیا جائے گا؟ وجہ یہی ہے کہ آزاد کی تصنیف کی ہوئی کتابیں سررشتہ تعلیم میں داخل کورس ہیں، اور لاکھوں کی تعداد میں لڑکے پڑھتے، اور ایسی چاٹ لگجاتی ہے، کہ مادری زبان پر ترجیح دیتے ہیں،

آزاد نے اُردو کے عام فہم بنانے کی جتنی کوشش کی کسی خادم اُردو نے نہ کی ہوگی، انکی تصانیف میں یہ خداداد صفت ہے، کہ بچے بوڑھے جوان سب پسند کرتے ہیں، اور جاہل، کم لیاقت، اور پڑھے لکھے اپنے اپنے مذاق کے مطابق پاتے ہیں، کسی کو یہ شکایت کرتے ہوئے نہ پاؤ گے کہ اُنکی اُردو سمجھ میں نہیں آتی۔

محمد منظور۔ فاضل الہ آبادی

تصانیف مولانا محمد حسین آزاد مرحوم

آب حیات - مشاہیر شعرائے اردو کا تذکرہ جو پچاس سال سے دنیائے اردو سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے قیمت ے/

دربار اکبری - عہد اکبری کے دلچسپ حالات، تاریخ مین فسانہ کا مزہ ملتا ہے۔ قیمت صہ/

سخندان فارس - فارسی زبان کی تاریخ۔ علم الالسنہ مین اردو کی پہلی مستند کتاب۔ قیمت ے/

نگارستان فارس - فارسی کے مشاہیر شعرا کے حالات جو آزاد کے مسودات سے مرتب کیے گئے ہین۔ قیمت ے/

نیرنگ خیال (۲ حصے) کنایہ و رمز کے پیرایہ مین دقیق حکیمانہ خیالات، آزاد کی الہامی نثر کا بہترین نمونہ۔ قیمت عہ۸/

دیوان ذوق - آزاد نے اپنے اُستاد کا دیوان ترتیب دیا اور ایسا مقدمہ لکھا کہ ذوق کو زندہ جاوید بنا دیا قیمت ۶/

نصیحت کا کرن پھول - تعلیم نسوان کی تائید مین یہ دلچسپ مکالمہ لکھکر آزاد بھی اخلاقی تحریک مین شریک ہو گئے قیمت ۸/

سیر ایران - سیاحت ایران کے بعد حالات سفر پر مولانا آزاد نے ایک عام تقریر کی تھی۔ قیمت عہ۸/

مجموعہ مکتوبات آزاد - آزاد کے دلچسپ خطوط جو آزاد کے طبعی حالات کا آئینہ ہین۔ قیمت عہ۸/

ڈرامہ اکبر - اردو کا پہلا نثر ڈرامہ جسمین جہانگیر و نور جہان کی داستان معاشقہ بیان ہوئی ہے۔ قیمت عہ۸/

مجموعہ نظم آزاد - آزاد نثر کے شاعر تھے اور نظم جدید کے موجد اس مجموعہ کو ان کی ایجاد کا نمونہ سمجھنا چاہیے قیمت ۸/

جانورستان - پرندون، درندون، اور چرندون کے پالنے اور سکھانے کے طریقے علامہ فیضی کی تحقیق آزاد کی زبان سے قیمت ۱۰/

تذکرۂ علما - ہندوستان کے بعض اُن علما کے حالات جو ابتدائے عہد مین تعلیم کے علمبردار کہے جا سکتے ہین قیمت ۵/

بیاض آزاد - آزاد نے جن اشعار کو پسند و انتخاب کے بعد اپنی بیاض مین لکھا۔ اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ کیسے ہونگے۔ عہ/

فلسفۂ الٰہیات - وہ حکیمانہ جذبات جو آزاد نے عربی فارسی و سنسکرت سے اخذ کر کے عالم بیخودی مین قلمبند کر دیے عہ/

قند پارسی - سیاحت ایران کے بعد جدید فارسی سے اہل ہند کو روشناس کرنیکے لیے یہ رسالہ لکھا گیا قیمت ۱۰/

آموزگار پارسی - جدید فارسی سے اہل ہند کو واقف کرنیکے لیے یہ رسالہ ترتیب دیا گیا۔ قیمت ۱۲/

لغت آزاد - جدید فارسی کی لغت۔ قیمت عہ۸/

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس زمانہ میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ انجمن ادب اردو کے جلسہ میں ان چاروں مصنفین یعنی شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی اور شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد میں کون صدر اعظم مقرر کیا جاوے، جتنا یہ انتخاب دلچسپ ہے اُتنا ہی نہایت غور و خوض کا محتاج، اس انتخاب کا انحصار ہے وسعت معلومات وان مصنفین کے کارہائے نمایاں پر، جن لوگوں نے ان مصنفین کے تصانیف کا مطالعہ بہ نظر امعان کیا ہے، وہی خوب اسکی گرہ کشائی کر سکتے ہیں، ورنہ "سبکساران ساحل" سے اس انتخاب کی توقع رکھنا تحصیل حاصل ہے، سہولت تفہیم کے لیئے شاید یہ مثال کافی ہو کہ ایک صحبت میں چند احباب کا اجتماع ہے، اُسمیں یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ شبلی، حالی، آزاد و نذیر احمد میں سب سے بڑا انشاپرداز کون تھا، اور کس نے سب سے زیادہ اُردو کی خدمت انجام دی ہے، اس صحبت احباب میں ایک شخص ایسا ہے جو صرف دنیائے افسانہ نگاری سے دلچسپی رکھتا ہے وہ ڈاکٹر نذیر احمد کے حق میں ووٹ دیگا، دوسرا شخص وہ ہے جو عبارت آرائی، بیان کی لطافت، زبان کی سلاست، بندش کی چستی اور محاورے کی دل آویزی کو پسند کرتا ہے، وہ مولانا آزاد کا حلقہ بگوش ہو جائیگا،

تیسرا ایسا شخص وہاں موجود ہے جو نصیحت آمیز اشعار، نیچرل شاعری و تاریخی مضامین کا دلدادہ ہے وہ ضرور مولانا حالیؔ کا اسم گرامی پیش کریگا، لیکن اب اُن میں چوتھا شخص وہ ہے جو ہر صنف کا ذوق صحیح و سلیم رکھتا ہے، یعنی دینیات سے بھی دلچسپی رکھتا ہے اور عبارت آرائی و محاورے کی دل آویزی کا بھی خواہشمند، شاعری سے بھی شغف رکھتا ہے اور تاریخ و تنقید سے بھی وہ یقیناً علامہ شبلی کی موافقت کریگا،

راقم مضمون ہذا اسی چوتھے شخص کی تائید کرتا ہے، فی الحقیقت علامہ شبلی مرحوم زمانۂ حال کے ان چند مستند افاضل میں سے ہیں جن کا وجود ادب اُردو کے لئے مایۂ ناز رہیگا، انکی متعدد تصنیفات نے آسمان علم پر اُن کو آفتاب بنا کر چمکایا ہے، دور حاضرہ میں جو لوگ انشا پرداز تسلیم کئے گئے ہیں اُن میں سب سے نمایاں مولانا محمد حسین آزاد و مولانا الطاف حسین حالیؔ و ڈاکٹر نذیر احمد وغیرہ ہیں، ان بزرگوں کی انشا پردازی و کمال سے کسکو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر انصاف کی عینک لگا کر ان اصحاب کی انشا پردازی کا ملاحظہ فرمائیے تو ان میں سے ہر بزرگ کی تحریر میں کچھ نہ کچھ نقص یا کمی ضرور موجود پائیے گا، مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر میں زور و سادگی ہے لیکن بہت زیادہ خشک ہے اور کہیں کہیں رکیک الفاظ اور محاورے استعمال کر جاتے ہیں جو ایک انشا پرداز کے لیے نازیبا ہے مولانا حالیؔ کا طرز تحریر بھی مولانا آزاد کی طرح سادہ اور صاف ہے لیکن عام طور پر خشک اور کمزور ہے، ڈاکٹر نذیر احمد صرف ایک قادر الکلام اہل زبان ہیں، افسانہ نگاری آپ کا خاص جوہر ہے لیکن آپ سنجیدہ عبارت سے کوئی تعلق نہیں، فی الحقیقت من حیث المجموع اگر کسیکو کامل الفن انشا پرداز یا ادیب کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی ذات واحد ہے، سادگی، سلاست، اختصار،

بلندیٔ خیال، رنگینی، لطافت، فقروں کا دروبست، موقع شناسی نشست الفاظ کی خوبی، ترکیب کی دل آویزی غرض علامہ موصوف کا طرز تحریر انشا پردازی کی ان تمام خصوصیات کا جامع ہے' عام طور پر مشہور ہے کہ علامہ مرحوم ایک مورخ سب سے بہتا تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسطرح شاعری نے عمر خیام نیشاپوری کے دیگر علمی کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے اسی طرح تاریخی غلغلۂ کمال نے مولانا مرحوم کی مختلف خصوصیات کو دبا دیا ہے چنانچہ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ الفاروق و سیرۃ نبوی کا مصنف حسن لب بام کی اداؤں کا بھی لذت شناس ہے مولانا اس پایہ کے شخص تھے کہ اگر صانع قدرت اُنکے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا' مولانا کی مختلف خصوصیات کو بغور ملاحظہ فرمائیے تو صاف اس حقیقت کا انکشاف ہو جائیگا کہ وہ ادیب بھی تھے اور فلسفی بھی متکلم بھی تھے اور فقیہ بھی محدث بھی تھے اور مفسر بھی مورخ بھی تھے اور انشا پرداز و شاعر بھی'

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک انشا پرداز کے لیے کن کن اوصاف و کمالات کا ہونا لازمی و ضروری ہے سب سے پیشتر انشا پردازی کی ہمین تعریف کر دینا لازمی ہے تاکہ اس کسوٹی پر ہم مصنفین کو پرکھ لیں' انشا پردازی ایک مستقل فن ہے جس کے مندرجہ ذیل خصوصیات ہونا چاہییں' طرز تحریر پر زور ہو' الفاظ مختصر اور جامع ہوں' بلندیٔ خیال ہو' کوئی غیر فصیح و رکیک لفظ تحریر میں نہ آنے پائے' ہر لفظ و ہر فقرہ اپنی جگہ پر موزوں اور مناسب چسپاں کیا گیا ہو' جس قسم کا خیال ہو اُسی کے مطابق الفاظ بھی ہوں' اگر کوئی علمی یا فلسفیانہ بحث درمیان میں آگئی ہے تو الفاظ اُسی کے موافق سادے اور فلسفیانہ ہونا چاہئیں اگر ایسے موقع پر ظرافت یا رنگینی کا استعمال کیا جائیگا تو یہ بلاغت کے اصول کے منافی ہوگا' اگر کسی شخص کی سوانح عمری لکھنا ہے تو پیشتر یہ خیال کر لینا چاہیے کہ مخاطب

کون ہے کس رتبہ اور کس حیثیت کا ہے آیا اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے یا کمتر درجہ، جیسی حیثیت ہو اُسی کے مطابق الفاظ بھی استعمال کرنا چاہئیں، غرض جیسا موقع ہو اُسی لحاظ سے طرزِ تحریر میں بھی تبدیلی ہوتی رہنا چاہیئے، ظرافت، بلاغت، فصاحت و رنگینی وغیرہ کا ایک خاص موقع و محل ہوتا ہے جس کا لحاظ رکھنا ہر انشا پرداز کا اہم فرض ہے، منجملہ خصوصیات بالا کے ایک انشا پرداز کے لئے قوت ترتیب و انتخاب کی صفت بھی ہونا لازمی ہے

انشا پرداز کو یہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اُسکو کیا لکھنا ہے اور کیا نہیں لکھنا ہے اسی کے مطابق ترتیب و تنظیم کا لحاظ بھی رکھنا لازمی ہونا چاہیئے یعنی کون کون سی بات کہاں لکھنا چاہیئے، لیکن اسکا احساس بجز علامہ شبلی نعمانی کے دوسرے انشا پردازوں میں کم ہے، جس سے کتاب کی وقعت کم ہو جاتی ہے مثلاً آبِ حیات میں جو مولانا آزاد کی تصانیف میں خیر الکتب ہے ....
اسمیں جرأت و مصحفی کے حالات میں صفحے کے صفحے لکھ ڈالے ہیں لیکن میر انیس نے جو شاعری میں فصاحت و بلاغت کا شہنشاہ ہے جس نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دئے، ایک ایک مضمون کو سینکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہے مناظر قدرت اور جذبات انسانی کی تصویریں جو اُس نے کھینچی ہیں ان کا جواب اردو زبان میں ملنا دشوار بلکہ ناممکن ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور کا دریا بہہ رہا ہے اُسکے متعلق مولانا آزاد نے چند سطروں پر اکتفا کی ہے حالانکہ جرأت کو میر انیس سے کیا نسبت، دوسرے یہ کہ مولانا آزاد نے آبِ حیات میں دہلی کے قریب قریب ہر شاعر کا تذکرہ کیا ہے لیکن لکھنؤ کے شعرا میں سوائے خواجہ حیدر علی آتش و شیخ امام بخش ناسخ کے کسی دوسرے شاعر کا تذکرہ نہیں کیا، یعنی خواجہ وزیر، میر وزیر علی صبا، رند و اسیر وغیرہ کو ایک سرے سے نیست و نابود کر دیا حالانکہ ان میں کا ہر شاعر صاحب

دیوان ریختہ مشق تھا، دورِ حاضرہ کے مصنفین میں یہ خصوصیت مولانا شبلی کی
تصنیفات میں خاص طور پر نمایاں ہے مثلاً شعر العجم کو ملاحظہ فرمایئے، اکثر لوگوں کا یہ
اعتراض ہے کہ علامہ مرحوم نے اکثر نامور شعرا مثلاً ظہیر فاریابی، قاآنی وغیرہ کے تذکرے
قلم انداز کر دئے لیکن یہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ شعر العجم ایک خاص اصول پر مبنی ہے
یعنی علامہ مرحوم نے صرف انھیں شعرا کو لیا ہے جو کسی خاص طرز کے موجد تھے یا جنھوں نے
صنف شاعری میں کوئی مخصوص جدت و ندرت پیدا کی چونکہ شعرا متذکرہ بالا کسی
خاص طرز شاعری کے موجد نہ تھے بلکہ یہ دوسرے فارسی شعرا کے مقلد و پیرو تھے، بدیں وجہ
انکا تذکرہ لکھنا فضول سمجھا، بعض اصحاب کا یہ بھی اعتراض ہے کہ مولانا شبلی نے شعر العجم
حصہ اول میں عمر خیام نیشاپوری کے حالات بہت مختصر لکھے ہیں اُن کے حالات و سوانح
وضاحت سے لکھنا چاہیئے تھے، معترضین کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ مولانا مرحوم کا مطمح نظر
صرف عمر خیام کے شاعرانہ خصوصیات کا بیان کرنا تھا نہ کہ مکمل سوانح عمری کا لکھنا،
شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمدؒ کی معرکۃ الآرا کتاب اجتہاد ہے، اسمیں بھی ایک بڑا
نقص ہے یعنی مسائل کی بحث و تنقید میں کوئی تسلسل نہیں بلکہ اکثر خیالات غیر مربوط
و پراگندہ ہیں، مثلاً "وجود باری" کے بعد اسلام کی سہولتوں کا تذکرہ مولانا نذیر احمد
نے چھیڑ دیا ہے اور اس عنوان کے تحت میں اکثر غیر متعلق باتیں تحریر فرما دی ہیں مثلاً
ہجرت، معرکۂ بدر، اسلامی فتوحات وغیرہ کا اس عنوان سے کیا تعلق؟ بلکہ وجود باری
کے بعد اسلام کے مخصوص عقائد مثلاً توحید رسالت وغیرہ پر بحث کرنا چاہیئے تھی،
اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمدؒ کا دماغ فلسفیانہ نہ تھا اسلئے اُن کے خیالات
غیر مرتب شکل اختیار کر لیتے ہیں،
برعکس اس کے الکلام کو ملاحظہ فرمائیے، وہ ترتیب خیال کا ایک مرقع معلوم ہوتا ہے
ہر مسئلہ کی نہایت صاف و واضح طور پر بحث کی ہے اور مطالعہ کرنے والوں کو بالکل الجھن

محسوس نہیں ہوتی، وجود باری، توحید، نبوت، حقوق انسانی وملاحدہ کے اعتراض وغیرہ غرض ہر موضوع و ہر مبحث پر خاص فلسفیانہ بحث کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوت ترتیب و تنظیم ایک انشاپرداز کے لئے کس قدر لازمی ہے، وحدت، ازلیت و روح کے غیر فانی ہونے کی بحث اس طرح علامہ شبلی اپنی کتاب الکلام میں کرتے ہیں،

وحدت۔ "دو خدا اگر متعدد ہوں تو ضرور ہے کہ انمیں باہم کوئی جزء مشترک ہو جسکی وجہ سے وہ سب خدا کہلائیں اور کوئی جزء غیر مشترک جسکی وجہ سے انہیں باہم فرق اور امتیاز ہو اس صورت میں ترکیب لازم آئیگی اور ترکیب ایک قسم کی حرکت ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خدا میں کسی قسم کی حرکت نہیں،

ازلیت۔ جو شے ازلی نہ ہوگی وہ متحرک ہوگی کیونکہ عدم سے وجود میں آنا ایک قسم کی حرکت ہی اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خدا میں کسی قسم کی حرکت نہیں۔

روح کا غیر فانی ہونا۔ جب یہ ثابت ہو چکا کہ روح جوہر ہے اور جسمانی نہیں ہے تو خود ثابت ہو گیا کہ وہ فانی نہیں کیونکہ فانی ہونا اجسام کا خاصہ ہی جو چیز جسمانیت سے بالکل بری ہے وہ کیونکر فنا ہو سکتی ہے اور چونکہ روح مرکب نہیں ہے بلکہ بسیط ہے تو نہ اسکی تحلیل ہو سکتی ہے نہ اُسکے اجزاء بدل سکتے ہیں اسلئے اُسکا فنا ہونا غیر ممکن ہے"۔

علامہ شبلی شاعری کی تعریف اس طرح پر کرتے ہیں ملاحظہ ہو شعر العجم حصہ چہارم۔

"شاعری اُسی چیز کا نام ہے جسکو صلہ و انعام سے تعلق نہیں وہ ایک آگ ہے جو خود مشتعل ہوتی ہے ایک چشمہ ہے جو خود اُبلتا ہے ایک برق ہے جو خود کوندتی ہے، صلہ و انعام داد و دہش تحسین و آفریں سے کوئی علاقہ نہیں طبیعات میں تمام مسائل کی بنیاد محسوسات پر رکھی جاتی ہے اس لئے اُنمیں زیادہ مصروف ہونے سے محسوسات کا اسقدر دلپر اثر چھا جاتا ہے کہ یقین ہو جاتا ہے

کہ جو چیز محسوس نہیں وہ خیالی اور وہمی ہے اسیکا نتیجہ ہے کہ طبیعیات جاننے والے مجردات اور روحانیات کے منکر ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کا سلسلہ خدا تک پہونچ جاتا ہے کیونکہ وہ اعلےٰ المجردات ہے"۔

غرض اس عبارت کے نقل کرنے سے یہ ہو کہ مولانا شبلی مرحوم جس مبحث و موضوع پر قلم اُٹھاتے تھے اُسکو مثل آشنائے فن کے ادا کر دیتے تھے، یہی ایک انشا پرداز کی نمایاں صفت ہے جو دیگر مصنفیں میں کم نظر آتی ہے،

(فلسفی)۔ ایک انشا پرداز کے لئے فلسفی ہونا بھی ضروری ہے، اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ اُسنے بحیثیت ایک فن کے اُس کا مطالعہ کیا ہو، کیونکہ اکثر ایسے فلسفہ داں گذرے ہیں جو انشا پرداز نہ تھے بلکہ مقصد اس سے یہ ہے کہ فطری طور پر اُس کا دماغ فلسفیانہ تاکہ واقعات و مسائل کی بحث میں تحقیق و تنقید سے کام لے سکے، اگر ایک انشا پرداز کا فرض صرف اسقدر ہے کہ وہ کسی موضوع یا مبحث پر جسقدر معلومات مل سکے فراہم کر دے تو ہر صاحب علم انشا پرداز ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن ایک انشا پرداز کا رتبہ اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہے اس کا اصلی جوہر تحقیق و تنقید ہونا چاہیے، یعنی کسی مسئلہ یا مبحث پر قلم اُٹھاتے وقت یہ ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ اُس کو کیا لکھنا ہو اور کس ترتیب کے ساتھ لکھنا چاہیئے کون امر ضبط تحریر میں لانا ضروری ہے اور کون سا غیر ضروری، ان سب امور کا لحاظ اُسی شخص کو ہو سکتا ہے جو شخص فلسفی و حقیقت بیں ہو، وہ شخص جو فلسفی نہیں ہے وہ اُن امور کو مد نظر نہیں رکھ سکتا، تمثیلاً ہم مولانا محمد حسین آزاد کو لیتے ہیں موصوف کی آب حیات معرکۃ الآرا کتاب ہے، چونکہ مولانا آزاد فلسفی نہ تھے اسی وجہ سے آب حیات میں بہت نقائص نظر آتے ہیں، اول یہ کہ موصوف نے اردو شاعری کی صحیح معنوں میں تنقید نہیں کی، اُسکو شروع سے آخر تک مطالعہ کر جائے لیکن اس کا اندازہ

بالکل نہیں ہوتا، کہ اردو کی ابتدا کیونکر ہوئی کیا کیا دور قائم ہوئے، عہد بہ عہد کیا کیا ترقیاں ہوئیں، ملک اور قوم کا شاعری پر کیا اثر پڑا اور شاعری کا ملک وقوم پر کیا اثر ہوا، درحقیقت مولانا آزاد کا آب حیات لکھتے وقت یہ فرض تھا کہ ان امور کو پیش نظر رکھتے، ورنہ شعرا کے حالات و قصے ہر شخص جسکو کچھ بھی استعداد ہو فراہم کر سکتا تھا، چونکہ مولانا آزاد فلسفی نہ تھے بدیں وجہ ان اہم و نازک مسائل کو پیش نظر نہ رکھ سکے،

برعکس اسکے شعر العجم کو ملاحظہ فرمایئے، تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ کسی دقیق النظر انشا پرداز کی سحر بیانی کا مرقع ہے، چنانچہ علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم تالیف فرماتے وقت ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، فارسی شاعری کے ارتقائے تدریجی کا واضح طور پر تذکرہ کیا ہے، ہر دور کی شاعری پر مثلاً فلسفیانہ شاعری، صوفیانہ شاعری، عاشقانہ شاعری، اخلاقی شاعری و قصیدہ گوئی، ایران میں شاعری کیونکر پیدا ہوئی، شاعری کی تدریجی رفتار، نظام حکومت کا اثر شاعری پر کیا ہوا غرض ہر صنف پر جیسی جامع و مانع تعریف مثل آشنائے فن کے کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلاغت و فصاحت و مضمون نگاری کا دریا لہریں مار رہا ہے، مولانا مرحوم نے شعر العجم حصہ پنجم صفحہ ۱۶۱ میں فلسفیانہ شاعری پر بحث کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک فلسفی فلسفیانہ شاعری کا تذکرہ لکھ رہا ہے، پہلے فلسفہ کی تعریف کی ہے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ فلسفہ کیا چیز ہے:-

"کتب درسیات میں طبیعیات، عنصریات، فلکیات، الہیات ان سب کے مجموعہ کا نام فلسفہ ہے"

اسکی تعریف دوسری طرح یہ کی ہے کہ

"فلسفہ وہ علم ہے جسمیں موجودات کے متعلق وسیع ترین کلیات قائم کئے جاتے ہیں"

جس علم میں کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اُسکے عوارض انفرادی اور مختصات
شخصی و نوعی تمام یا تقریباً تمام حذف کر دیے جائیں اور
اس مسئلہ کی صرف کُلّی یا مجموعی حیثیت سے سروکار رکھا جائے،
اُسی کا نام فلسفہ ہے"۔

صوفیانہ شاعری کی اس طرح بحث کی ہے کہ گویا ایک صوفی تذکرہ لکھ رہا ہے۔
"تصوف کے مقامات میں سے اکثر مقامات ایسے ہیں جن سے جذبات کو تعلق ہے
مثلاً رضا، فنا، محویت وحدت، استغراق، اس لئے ان مقامات کے ادا کرنے
میں خود بخود کلام میں زور، جذبہ اور اثر پیدا ہوتا ہے، اور یہی چیزیں شاعری کی
روح ہیں، مثلاً رضا کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ عالم میں خیر و شر، نیک و بد،
حسن و قبح، رنج و راحت ہے سب فاعل مطلق کے حکم سے ہے، اسلئے ہمکو
چون و چرا کا حق اور گلہ و شکایت کا موقع نہیں خرابات مقام فنا کو کہتے ہیں،
سالک عارف باخبر کو کہتے ہیں، تصوف میں انسان کو اشرف المخلوقات اور
عالم اکبر مانا ہے، اسلئے صوفیانہ شاعری نے عزت نفس کا خیال پیدا کیا، انصوفا
نے بتایا کہ زمین و آسمان اور کون و مکان سب انسان کے لئے ہیں، ہم بادشاہ
ازل کے نور کے سایہ ہیں، ہم آدم و حوا کے فرزند نہیں، تصوف نے بتایا کہ فرشتے
اور افلاک انسان کا مرتبہ پہچاننے کے قابل نہیں، تصوف اصل میں زبان
و قلم کی حدود سے باہر ہے وہ وجدان ذوق و مشاہدہ کا نام ہے جو بیان میں نہیں
آسکتا، ایک تمثیلی حکایت لکھی ہے کہ کسی نے جگنو سے پوچھا کہ تم دن کو کیوں نہیں
نکلتے، اُس نے کہا میں تو دن و رات ایک ہی جگہ رہتا ہوں، لیکن آفتاب کی
روشنی کے ہوتے ہوئے میں لوگوں کو نظر نہیں آتا، یہی حال تمام عالم کا ہے کہ
خدا کی ہستی کے مقابلہ میں اُن کا وجود اس حال کو نظر نہیں آتا، اس حدت کو

وحدت شہود کہتے ہیں، اس وحدت کا خیال رفتہ رفتہ وجود کی حد تک پہونچایا، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں ثابت کیا ہے کہ درحقیقت خدا کے سوا کوئی اور چیز سرے سے موجود ہی نہیں یا یوں کہو جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے"۔

ایک ایک لفظ پر غور فرمایئے، کس قدر ادیبانہ وصوفیانہ انداز میں ڈوبا ہوا ہے مولانا کا وصف امتیازی یہی ہے کہ کتاب کے صفحے کے صفحے مطالعہ کر جایئے لیکن، کہیں پر بھی کوئی رکیک وغیر فصیح لفظ یا تبذل محاورہ نہ پایئے گا۔

وسعت معلومات:۔ ایک انشا پرداز کے لئے وسیع معلومات کا ہونا بھی ضروری ہے ترقیوں کی بوالعجبیاں، ایجادات کی بوقلمونی مرہون ہیں وسعت معلومات کی اور وسعت معلومات منت کش ہے مطالعہ کتب کی،

مشہور ضرب المثل ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں اور انشا پرداز بنائے جاتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں، شاعر اور انشا پرداز دونوں پیدا ہوتے ہیں اور دونوں بنائے جاتے ہیں، ایک انشا پرداز کے لئے وسیع المطالعہ بھی ہونا ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے نظر میں وسعت نہیں پیدا ہو سکتی، اور نہ کسی مسئلہ یا مبحث پر جامع ومانع بحث کی جا سکتی ہے، ممکن ہے کہ ایک صاحب علم میں لطافت، رنگینی، ندرت، واجتہاد ہو لیکن جامعیت کی صفت حاصل نہیں ہو سکتی، بجز علامہ شبلی کے یہ صفت دوسرے مصنفین میں کم پائی جاتی ہے، وجہ اسکی یہ ہے کہ علامہ مرحوم ایک واقعہ یا مسئلہ کی تلاش میں کتابوں کے صفحے کے صفحے مطالعہ کر جاتے تھے، ہر واقعہ کو تحقیق وتدقیق کے ساتھ لکھنا اور اُس کا ثبوت بھی بہم پہونچانا مولانا ہی کا حصہ تھا، جب تک مرحوم ہر واقعہ کو تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر خوب اچھی طرح پرکھ نہ لیتے، آگے بڑھنے کا نام نہ لیتے تھے۔

علامہ شبلی کا انداز تحریر اردو انشا پردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے وہ یہ وصف ازل سے لیکر آئے تھے، موصوف میں یہ خاص خصوصیت تھی کہ ہمیشہ اس امر کا لحاظ رکھتے تھے کہ مخاطب کون ہے، کس حیثیت کا ہے، کس موقع پر کس قسم کی عبارت لکھنا چاہیئے، اُسی کے موافق وہ الفاظ استعمال کرتے تھے، یہ صفت یعنی الفاظ کے انتخاب میں فرق مراتب کا لحاظ رکھنا بجز مولانا شبلی کے ڈاکٹر نذیر احمدؒ و مولانا حالی وغیرہ میں بہت کم پائی جاتی ہے، اب راقم مضمون ہذا ان چاروں انشا پردازوں کے تصانیف کے چند اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہے جن سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ انشا پردازی کا حقیقی معیار کیا ہے اور انشا پردازانہ حیثیت سے مولانا اپنے ہمعصروں میں کیا درجہ رکھتے ہیں۔

مولانا حالی یادگار غالب صفحہ ۱۲۵ میں اپنے اُستاد مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شان میں جن کے سامنے مولانا حالی نے زانوئے ادب تہ کیا ہے فرماتے ہیں۔

"مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست، جن سے نہایت بے تکلفی تھی، اکثر شام کو اُن کے پاس جاکر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اُسوقت بہت پُرلطف باتیں کیا کرتے تھے ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے، میر مہدی پاؤں دابنے لگے مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے، انھوں نے نہ مانا اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دید یجئے گا، مرزا نے کہا، ہاں اس کا مضائقہ نہیں جب وہ پیر داب چکے، انھوں نے اُجرت طلب کی، مرزا نے کہا بھیا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے وابے حساب برابر ہوا"۔

پلنگ پر پڑے ہوئے یہ بہت عامیانہ لفظ ہے جو اپنے سے کمتر درجہ کے

شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس موقع پر پلنگ پر لیٹے ہوئے "زیادہ موزوں تھا"

حیات انیس میں مولانا کا تبصرہ جو مرثیہ پر موصوف نے دیا ہے شائع ہوا ہے،
ملاحظہ ہو حیات انیس صفحہ ۴۹ "زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی
تعریف کو مرثیہ، عرب کی قدیم شاعری میں قصائد اور مرثیئے ایسے سچے اور صحیح حالات
و واقعات پر مشتمل ہوتے تھے کہ اُن سے متوفی کی مختصر لائف استنباط ہو سکتی تھی،
لہذا متاخرین کو اسکے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ مرثیہ میں کچھ جدت پیدا کریں اور
اور اُس کے مضامین میں کچھ اضافہ کیا جائے، ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی
نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں ایک قسم کا ایجاد تھا کہ حسن نظم کی بنیاد محض بین
اور مرثیت پر ہونی چاہیے تھی، اسمیں بین اور مرثیت کے علاوہ مدح اور قدح
فخر و مباہات رزم و بزم بھی نہایت شد و مد کے ساتھ شامل ہو گئی جس نے
اُردو شاعری میں بہت وسعت پیدا کر دی، پہلے جہانتک ہمکو معلوم ہے
میر ضمیر نے ایسے مرثیئے لکھے ہیں گویا وہی اس طرز کے موجد ہیں مگر میر انیس نے
نے کہ باوجود خداداد مناسبت کے چار پشت سے شاعری اور مرثیہ گوئی اُن کے
خاندان میں چلی آتی تھی اسپر اردو زبان کے مالک تھے اور لکھنؤ بنا ہوا تھا اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا"

"زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں" یہ محاورہ نہ اہل لکھنؤ کا ہے
نہ اہل دہلی کا بجائے قصیدہ بولنے کے اگر مولانا حالی اس جگہ قصیدہ کہتے ہیں
تحریر فرماتے تو موزوں ہوتا، علامہ شبلی نعمانی حیات انیس میں اسطرح مرثیہ پر تبصرہ
فرماتے ہیں ملاحظہ ہو صفحہ ۵۰ -

"عرب میں سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیے سے ہوئی اس کے بعد
شاعری اصلی حالت سے نکلکر کسب معاش کا ذریعہ بنی تو مرثیہ خود بخود
زوال پذیر ہو گیا کیونکہ قصائد کی طرح اُس سے کچھ صلہ نہیں ملسکتا تھا،

اسی زمانہ میں کربلا کا واقعہ پیش آگیا اُسوقت میں اگر عرب کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اس زور کے مرثیے لکھے جاتے کہ تمام دنیا میں آگ لگ جاتی، مگر زمانہ نے بنو اُمیہ اور بنی العباس کی سلطنت میں اس رنگ کو اُبھرنے نہ دیا، سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر مرزا دبیر کے اُستاد ہیں، اس سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے اب تحت اللفظ کا بھی رواج ہوا، غالباً پہلا شخص جنے ممبر پر بیٹھکر تحت اللفظ پڑھا وہ میر ضمیر تھے، نئی تشبیہیں نئے استعارے پسندیدہ مبالغے واقعہ نگاری مناظر قدرت کی تصویر وغیرہ تمام محاسن کلام میر ضمیر کے یہاں پائے جاتے ہیں، مگر اُن کے ہاں ان کا رنگ ہلکا سا تھا، میر انیس اور مرزا دبیر نے اسکو زیادہ شوخ کر دیا۔"

علامہ شبلی کا انداز تحریر اردو انشا پردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کس موقع پر کس قسم کی عبارت لکھنی چاہیئے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد اپنی کتاب اجتہاد صفحہ ۱۴۱ میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں،

"خدا کا کرنا پیغمبر صاحب کو عین وقت پر معلوم ہو گیا، اندھیرے میں چپکے سے سٹک گئے" "چپکے سے سٹک گئے" یہ عامیانہ درکیک الفاظ ایک معمولی شخص کے متعلق بھی کسی انشا پرداز کو استعمال نہ کرنا چاہئیں، چہ جائیکہ ایک پیغمبر کی شان میں، راقم مضمون کا قلم اس عبارت کو لکھتے ہوئے کانپا جاتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اپنی کتاب اجتہاد میں شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ ہو اجتہاد صفحہ ۸۴۔

"آخر دعوتِ اسلام کے چودھویں برس پیغمبر صاحب کو جان لیکر مدینہ بھاگ جانا پڑا"

"مدینہ بھاگ جانا پڑا وہ بھی جان لیکر" یہ الفاظ کوئی صحیح المذاق انشاپرداز کبھی ایک پیغمبر کی شان میں استعمال نہیں کر سکتا، حیرت اور سخت حیرت ہے، اب اسکے مقابلہ میں راقم مضمون ہذا علامہ شبلی نعمانی کی عبارت نقل کرتا ہے کہ وہ اس واقعہ کو کس طرح لکھتے ہیں، ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی جلد اول صفحہ ۱۹۸

"کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا، اور رات زیادہ گذر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا، آنحضرت اُن کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "کہ! تو مجھکو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھکو رہنے نہیں دیتے"۔

"قدرت نے اُن کو بے خبر کر دیا" اس فقرے کی بلاغت کو ملاحظہ فرمائیے، کفار کا بے خبر ہو جانا محض اتفاقی امر نہ تھا، بلکہ یہ تائید غیبی تھی، لیکن ڈپٹی نذیر احمدؒ کی عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت نے ہجرت صرف بزدلی کی وجہ سے کی تھی،

بیعت رضوان کا واقعہ ڈپٹی نذیر احمدؒ اپنی معرکۃ الآرا تصنیف الحقوق والفرائض حصہ دوم صفحہ ۹ میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں،

"یہ صلح پیغمبر صاحب نے دب کر کی اور مسلمانوں کی بڑی دل شکنی ہوئی، اس وقت بعض مسلمانوں کو یہ خیال ہوا، کہ پیغمبر صاحب نے یہ کیسا خواب دیکھا تھا، اور بعض منافقین یہ شبہہ کرتے تھے کہ اگر خدا اسلام کا حامی ہوتا تو یوں دب کر صلح نہ کیجاتی، اور کچھ لوگ شروع ہی سے پیچھے رہگئے تھے اُن کو یقین تھا کہ اہل مکہ ان مسلمانوں کو گھسنے نہیں دینگے"

اور ایسا ہی ہوا، فکر ہر کس بقدر ہمت اوست، حدیبیہ کی صلح بظاہر دب کر ہوئی تھی، مگر حقیقت میں اسمیں مسلمانوں کی بڑی جیت تھی، کہ ابتدائی حالت میں آئے دن کی لڑائی اُن کو نپینے نہیں دیتی تھی، مسلمانوں کو مُہلت آئی اور مکہ پر چڑھ دوڑے، خدا کا کرنا کہ مکہ بے لڑائی فتح ہوا، حدیبیہ سے لوٹے تو پیغمبر صاحب سیدھے خیبر پر جا چڑھے، اور اُسکو فتح کیا اور وہاں مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت بھی ہاتھ لگا، اس صلح حدیبیہ کے چند واقعات قابل تذکرہ ہیں، ایک بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے جسمیں حضرت عثمانؓ پیام صلح لیکر اہل مکہ کے پاس گئے تھے اُن کے آنے میں ہوئی دیر، یہاں یہ مشہور ہوگیا کہ حضرت عثمانؓ کو اہل مکہ نے مار ڈالا، تو اب چار دناچار لڑائی ٹھہری، اس پر پیغمبر صاحب نے مسلمانوں سے لڑنے مرنے کی بیعت لی، جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے اور وہ ایک کیکر کے درخت کے تلے ہوئی تھی، ایک آیت نازل ہوئی تو کفار نے طعن کیا کہ مسلمانوں کا خدا بھی کیسا خدا ہے، اونچی دوکان پھیکا پکوان، خدائی دعویٰ اور مکھی جیسی حقیر اور قابل نفرت چیز کا نام، ہمکو تو مکھی کا نام لیتے ہوئے بھی گھن آتی ہے، کمشنر سے اونچے درجے کے حکام کی خط وکتابت اُن کے عُلو مرتبہ کے لحاظ سے اُن کا سکرتری اپنے نام سے کرتا ہے، جسکو عوام جو انگریزی نہیں جانتے سکتر کہتے ہیں، سکتر بھی اپنے افسر کے ہاتھ تلے کا سر رشتہ دار ہے گو وہ اپنے نام سے خط وکتابت کرے، مگر حقیقت میں وہ خط وکتابت اُس کے افسر کی ہے، جس کا وہ سکتر ہے۔

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو الحقوق والفرائض حصہ دوم صفحہ ۱۷۔

یہودیوں کی عادت بہت کچھ تحریف کرنے کی تھی، چنانچہ ذبح گاؤ میں معلوم ہو چکا اللہ تعالے نے مسلمانوں کو اس طرح کی کرید سے منع فرما دیا ہے اور آیات کی منسوخی کے بارہ میں اسکی وجہ تلاش کرنی یہ بھی ایک قسم کی کرید ہے"۔

بیعت رضواں کے متعلق علامہ شبلی نعمانی اس طرح تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی حصہ اول صفحہ ۴۳۲)

"بیعت رضوان - بالآخر آپ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمرؓ کو انتخاب کیا، لیکن انھوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھکو بچا سکے، آپ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا، وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں مکہ گئے، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا، قریش نے اُن کو نظر بند کر دیا لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے، یہ خبر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو پہونچی تو آپ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے، یہ کہکر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھکر صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی، تمام صحابہ نے جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے، ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا، یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے، اس بیعت کا نام بیعت رضوان ہے، سورہ فتح میں اس واقعہ کا ذکر ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے۔

"خدا مسلمانوں سے راضی تھا جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا، تو خدا نے اُن پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی"

ڈپٹی نذیر احمدؒ سورۂ فتح کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔

"جب مسلمان ایک (کیکر) درخت کے تلے تمھارے ہاتھ پر (لڑنے مرنے) کی بیعت کر رہے تھے، خدا مسلمانوں سے خوش ہوا اور اُس نے اُن کی دلی عقیدت مندی کو جان لیا اور اُن کو اطمینان قلب عطا کیا، اور بدلے میں اُن کو سردست خیبر کی فتح دی"۔

ہجرت حبش کا تذکرہ ڈپٹی نذیر احمدؒ ان الفاظ میں فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو اجتہاد صفحہ ۳۹۔

"پیغمبر صاحب نے اپنی خاندانی وجاہت کے بھروسہ پر جہاں تک ہو سکا ان نو مسلموں کی حمایت کی، لیکن نری وجاہت ایسے لوگوں کی عام شورش کے مقابلہ میں کیا کام آئے، جو ہر وقت مار کٹائی اور بے حرمتی پر تلے رہتے تھے، آخر پیغمبر صاحب نے ان نو مسلموں کے تحفظ کے لئے ان کو نجاشی بادشاہ حبشہ کے یہاں چلتا کیا"۔

"مار کٹائی" "چلتا کیا" "بے حرمتی" کیا یہ الفاظ ایک پیغمبر کی شان میں کوئی صحیح المذاق انشاپرداز استعمال کر سکتا ہے؟ غور فرمائیے کس قدر یہ الفاظ عامیانہ ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اسی واقعہ کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی جلد اوّل صفحہ ۱۷۱۔

"قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا، تو رحمت عالم نے جان نثاران اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں"۔

ڈاکٹر نذیر احمدؒ اپنی کتاب اجتہاد میں قریش کے برتاؤ کو جو انھوں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا اس طرح بیان فرماتے ہیں

ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹ ۔

"وہ گرم مزاج لوگ بتوں کی تحقیر اور اپنے بزرگوں کی تحسین کی تاب نہ لاکر بھڑوں کی طرح چھتوں سے باہر نکل پڑے، اور پیغمبر صاحب کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی اور دشنام دہی اور موقع پاکر زدوکوب کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا"

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں ۔ ملاحظہ ہو اجتہاد صفحہ ۸۳ ۔

"اب تم ان حالات حقہ صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھکر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کرکے کس مفاد کی توقع کرسکتے تھے، اسی دعویٰ نے تو ان کی یہ گت بنوائی تھی، کہ

جھڑکی تو مدتوں سے مساوات ہو گئی ۔۔۔ گالی کبھو نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی

باقی ہو ماہ کہانی تو سن لو گے ایک دن ۔۔۔ اسکی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

اسی دعوے نے ان کو شہر بدر کرایا"

ملاحظہ کیجئے یہ بازاری و مبتذل اشعار ایک پیغمبر کی شان میں استعمال کئے گئے ہیں اب علامہ شبلی نعمانی اسی واقعہ کو کس طرح بیان فرماتے ہیں ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی جلد اول صفحہ ۳۸۰ ۔

"خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب کے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیاں کیں تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت صلعم کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت کی ایڑیوں کو لہولہان کردیا کرتے تھے، وہ

بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی ، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آکر ٹکراتا تھا ، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے"۔

یہی مختصر اور بلیغ فقرے درحقیقت انشاپردازی کی جان ہیں ،
مولانا محمد حسین آزاد رنگینی کے بادشاہ ہیں ، لیکن رنگینی کے ساتھ ساتھ لطافت اور شکوہ کا لحاظ رکھنا صرف علامہ شبلی کا کام ہے اسکا اندازہ آپ کو ان دونوں مصنفین کی عبارتوں سے ہوجائیگا جو کہ حسب ذیل ہیں :۔
شمس العلماء محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اپنے اُستاد محمد ابراہیم ذوق کی تعریف میں رنگینی اور فصاحت کا دریا بہادیا ہے ، ملاحظہ ہو آب حیات صفحہ ۴۰۵ ۔

"جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ سخن کے پھولوں کا تاج سجایا ۔ جن کی خوشبو شہرت عام بنکر جہاں میں پھیلی ، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی ، وہ تاج سر پر رکھا گیا ، تو آب حیات اُس پر شبنم ہوکر برسا ، کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے ، ملک الشعرائی کا سکہ اُس کے نام سے موزوں ہوا ، اور اُس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اسپر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا ، چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو ، سبب اسکا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ برباد ہوگیا ، نہ ہمصفیر رہے نہ ہمداستاں رہے ، نہ اُس بولی کے سمجھنے والے رہے جو خراب آباد اس زبان کے لئے ٹکسال تھا ، وہاں بھانت بھانت کا جانور

بولتا ہے "شہر چھاؤنی سے بد تر ہوگیا، اُمرا کے گھرانے تباہ ہو گئے، گھرانوں کے
وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے وہ جادو کار
طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دلپسند انداز اور عمدہ تراشیں
نکالتی تھیں، آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کے ایجاد
و اختراع کی فرصتیں دی ہیں وہ اور اصل کی شاخیں ہیں، انھوں نے
اور پانی سے نشو و نما پائی ہے، وہ اور ہی ہواؤں میں اُڑ رہی ہیں،
پھر اُس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ کیا مبارک زمانہ ہوگا، جبکہ شیخ مرحوم
اور میرے والد مغفور ہم عمر ہوں گے تحصیل علمی اُن کی عمروں کی طرح
حالت طفولیت میں ہوگی، صرف و نحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی اور
ایک اُستاد کے دامن شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے، ان لوگوں کی ہر ایک
بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی، وہ رابطہ اُن کا عمروں کے
ساتھ ساتھ بڑھتا گیا، اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا، کہ قرابت سے بھی
زیادہ تھا، ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول
سمجھینگے، مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان
کا نہ چھوڑوں، یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنیوالے
بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے، لیکن نہیں اس شعر کے پُتلے کا
ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا، ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے
پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو یہ کام کا نہیں اور کونسی حرکت اس کی
ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہونچتا ہے، اسی واسطے میں
لکھونگا، اور سب کچھ لکھونگا جو بات اُن کے سلسلہ حالات میں مسلسل
ہو سکے گی، ایک حرف نہ چھوڑونگا"

مولانا محمد حسین آزاد اپنی سب سے بہترین تصنیف دربار اکبری میں، جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان کی پیدائش کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں، ملاحظہ ہو۔ دربار اکبری صفحہ ا

امیر تیمور نے ہندوستان کو زور شمشیر سے فتح کیا، مگر وہ ایک بادل آیا تھا کہ گرجا برسا اور دیکھتے دیکھتے کھل گیا، بابر اسکا پوتا چوتھی پشت میں ہوتا تھا، سوا سو برس کے بعد آیا، اُس نے سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی کہ اُسی رستے ملک عدم کو روانہ ہوا، ہمایوں اُس کے بیٹے نے قصر سلطنت کی بنیاد کھودی، اور کچھ اینٹیں بھی رکھیں، مگر شیر شاہ کے اقبال نے اُسے دم نہ لینے دیا، اخیر عمر میں اُسکی طرف پھر ہوا ئے اقبال کا جھوکا آیا تو عمر نے وفا نہ کی، یہانتک کہ ۹۶۳ھ میں یہ با اقبال بیٹا جانشین ہوا، تیرہ برس کے لڑکے کی کیا بساط، مگر خدا کی قدرت دیکھو اُسنے سلطنت کی عمارت کو انتہائے بلندی تک پہونچایا، اور بنیاد کو ایسا استوار کیا کہ پشتوں تک جنبش نہ ہوئی، وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا، پھر بھی اپنے نیک نامی کے کُتابے کو ایسے قلم سے لکھ گیا ہے کہ دن رات کی آمد و رفت اور فلک کی گردشیں اُنھیں گھس گھس کر مٹاتی ہیں مگر وہ جتنا گھستے ہیں اُتنا ہی چمکتے آتے ہیں، اگر جانشیں بھی اسی رستے پر چلتے تو ہندوستان کے رنگا رنگ فرقوں کو دریائے محبت پر ایک گھاٹ پانی پلا دیتے، بلکہ وہی آئین ملک ملک کے لئے آئینہ ہوتے، اس کے حالات بلکہ بات بات کے نکتے اوّل سے آخر تک دیکھنے کے قابل ہیں۔

جن دنوں ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھ سے پریشان حال تھا، ایک دن ماں نے اُس کی ضیافت کی، وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی، اور دیکھتے ہی

اُسکے حسن وجمال کا عاشق شیدا ہو گیا، دریافت کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ حمیدہ بانو بیگم اس کا نام ہے، ایک سید بزرگوار شیخ زندہ پیل احمد جام کی اولاد میں ہیں، اور آپ کے بھائی مرزا ہندال کے اُستاد ہیں، یہ اُنکے خاندان کی بیٹی ہے، ہمایوں نے چاہا کہ اُسے عقد میں لائے، ہندال نے کہا، مناسب نہیں، ایسا نہ ہو کہ میرے اُستاد کو ناگوار ہو، ہمایوں کا دل ایسا نہ آیا تھا کہ کسی کے سمجھائے سمجھ جاتا، آخر محل میں داخل کر لیا"۔

تذکرہ بالا عبارت مولانا محمد حسین آزاد کی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن اسکو علامہ شبلی نعمانی کے "ظہور قدسی" سے کیا نسبت ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی حصہ اول صفحہ ۱۲۲ "ظہور قدسی"

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جسکے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجزہ طرازی موسیٰ، جان نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز، شہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے، آج کی صبح وہی صبح جان نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے

۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا،
لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین
کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شرک آتش کدۂ کفر
آذر کدۂ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک
میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں
دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے، توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں
بہار آ گئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا
آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔"

سرنامہ سیرۃ نبوی جلد اول میں یہ الفاظ علامہ شبلی نے تحریر فرمائے ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نگینہ پر شیشے جڑے ہیں،

"ایک گدائے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں، اخلاص وعقیدت کی
نذر لیکر آیا ہے، ز چشم آستین بردار وگوہر را تماشا کن"۔

علامہ شبلی نعمانی کی تحریر میں ایک بڑا کمال یہ ہے کہ جس موقع پر جو الفاظ
خاص موزوں ہو سکتے ہیں وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں، آقا وخادم،
چھوٹے اور بڑے کے مختصات ادب کے لئے جو الفاظ مناسب ہیں وہی صرف کرتے
ہیں، مولانا موصوف ثقیل لفظوں کو بالکل ناپسند کرتے ہیں اور اُن کو کیسا ہی
مضمون ہاتھ لگے لیکن جبتک وہ فصیح لفظوں کو ڈھونڈھ نہیں لیتے اُس مضمون کی
طرف متوجہ نہیں ہوتے، مولانا شبلی کا طرز تحریر بلاغت کی جان، سلاست کی
روح اور فصاحت کی کان ہے، مولانا موصوف فصیح لفظوں کو اس خوبی سے
ترتیب دیتے ہیں جیسے جڑنے والا نگینوں کو نہایت صحیح مناسبت کے ساتھ
تھیوروں میں بٹھاتا ہے، مولانا کے تسلسل بیان میں وہ خوبی ہے کہ کہیں سے

کوئی کڑی علیحدہ ہی نہیں ہوتی، اور ایک کڑی دوسری کڑی سے اس خوبصورتی کے ساتھ ملی ہوئی ہے جو پہچانی نہیں جاتی، جیسے مرصع زیورات میں اعلیٰ کاریگر کا لگایا ہوا ٹانکا جو بالکل وصول ہوجاتا ہے اور دو حصوں کو وصل کردیتا ہے۔

مولانا حالی کا طرز تحریر سادہ اور صاف ہے لیکن عام طور پر خشک اور کمزور۔ ملاحظہ ہو حیات سعدی صفحہ ۱۔

"اسکا نام شرف الدین اور مصلح لقب ہے، اور سعدی تخلص ہے، سر گور اوسلی نے اُسکی ولادت ۵۸۹ ہجری مطابق ۱۱۹۳ء میں لکھی ہے، مگر وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفرالدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے، شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکن ہوا تھا، چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا، اس لئے اُس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا، شیخ کا باپ جیسا کہ اُسکے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک باخدا اور متورع آدمی تھا، شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں، کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے، اور بچپن ہی میں اُسکو عبادت، شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔"

علامہ شبلی اپنی کتاب شعرالعجم حصہ دوم صفحہ ۲۲ میں شیخ سعدی کے حالات اس طرح بیان فرماتے ہیں، مولانا موصوف خشک تاریخ کو مضمون کی چاشنی میں ہمارے دسترخوان پر پیش کرتے ہیں۔

"مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا، اُن کے والد اتابک سعد بن زنگی

بادشاہ شیراز کے ملازم تھے اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا،
سال ولادت معلوم نہیں، وفات کی نسبت سب متفق ہیں کہ ۶۹۱ھ میں ہوئی
عمر کی مدت تذکروں میں ۱۰۲ برس لکھی ہے لیکن اس حساب سے سال ولادت
۵۸۹ھ ہوگا، شیخ نے تصریح کی ہے کہ وہ ابوالفرح ابن جوزی کے شاگرد ہیں
اور غالباً یہ وہ زمانہ ہوگا جب شیخ بغداد میں تحصیل علم کے لئے آئے ہیں
سلطان محمود ۵۸۹ھ میں مرا ہے اس لئے اس زمانہ میں ان کی عمر ۱۰ برس کی
ہوگی لیکن واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی شاعری اور
کمالات نے کم از کم ۳۰، ۴۰ برس کی عمر میں شہرت پائی ہے'
اُن کے باپ ان کی تربیت اسطرح کرتے تھے جس طرح ایک عارف سالک
مُرید کو تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کراتا ہے، وہ بات بات پر اُن کو ٹوکتے تھے
اور اُن کی غلطیوں پر تنبیہ کرتے تھے، اُن کے اثر سے شیخ کو بچپن ہی میں
زہد و عبادت کا چسکا پڑ گیا تھا''

غور فرمایئے ایک ایک لفظ کسقدر ادیبانہ انداز میں ڈوبا ہوا ہے،
مولانا شبلی نے باوجود تاریخی مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اُس کو ادا کیا
ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخی اصلیت بدستور اپنی
اصلی صورت پر موجود ہے'

علامہ شبلی نعمانی جب کبھی رنگیں عبارت لکھتے ہیں کیونکہ مولانا عموماً
سادہ لکھا کرتے ہیں تو مولانا آزاد باوجود اپنی قادر الکلامی کے اس حد تک
نہیں پہونچ سکتے، ملاحظہ ہو شعر العجم حصۂ چہارم صفحہ ۲۱۵،

"ایران ایک قدرتی چمن زار ہے، ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پہ
آب رواں سبزہ زار، اور آبشاریں ہیں، بہار آئی اور تمام سرزمین تختۂ

زمردیں ہنگی، بادِ سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپیٹ، سبزہ کی لہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور، وہ سماں ہے، جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آسکتا" ملاحظہ ہو شعر العجم حصہ چہارم صفحہ ۲۳
"وہ بلبل نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہے، پروانے اس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں، شمع سے رات رات بھر وہ سوزِ دل کہتا رہا ہے، نسیم سحری کو اکثر اس نے قاصد بنا کر محبوب کے یہاں بھیجا ہے بارہا اس نے غنچہ کی عین اسوقت پردہ دری کی جب وہ معشوق کا تبسم چرا رہا تھا"

حضور سرورِ کائنات کی جامعیت کبریٰ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتے ہیں، ملاحظہ کیجئے سیرۃ النبی جلد اوّل صفحہ ۲۔

"لیکن اسوقت تک دنیا کی جسقدر تاریخ معلوم ہے، اسنے اس قسم کے نفوس قدسیہ جو پیش کئے ہیں وہ فضائل اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتب درس میں صرف حلم وتحمل، صلح وعفو، قناعت وتواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائل اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراق تعلیم میں عفو عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی، اور اس لئے عام انسانی تکمیل کے لئے زمانہ ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا، جو صاحب شمشیر و نگیں بھی ہو گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشورکشا بھی ہو، اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی، ....

مفلس قانع بھی ہو اور دریادل بھی، یہ برزخ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفہ یزدانی عالم کون کی آخری معراج ہے"

غور فرمائیے کسقدر بلیغ اور پرشکوہ الفاظ ہیں، یہ ایک ایسے اعلیٰ انشاپرداز کی عبارت ہے جس کے دماغ کو بلند نظری و عالی خیالی نے آسمان تک پھونچا دیا ہے،

حضرت عمرؓ کی جامعیت کو ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو الفاروق حصہ دوم صفحہ ۲۴۴۔

"اب حضرت عمرؓ کے حالات اور ان کی مختلف حیثیتوں پر نظر ڈالو، صاف نظر آئے گا کہ وہ سکندر بھی تھے اور ارسطو بھی، ابراہیم ادہمؒ بھی تھے اور امام ابوحنیفہؒ بھی، مسیحؑ بھی تھے اور سلیمانؑ بھی، نوشیروان بھی تھے اور تیمور بھی"۔

ان دونوں عبارتوں میں علامہ شبلی نے پیغمبر اور خلیفہ کے مراتب کا لحاظ رکھا ہے، اسی وجہ سے ایک خاص فرق نظر آتا ہے، پیغمبر کی شان میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ نسبتاً زیادہ پرشکوہ اور شاندار ہیں، ان مراتب کا لحاظ رکھنا صرف علامہ شبلی ہی کا کام ہے، یہ لحاظ مولانا آزاد، مولانا حالی و ڈاکٹر نذیر احمدؒ کو نہیں ہو سکتا،

ان مثالوں سے آپ کو کامل طور پر اندازہ ہو گیا ہوگا کہ علامہ شبلی نعمانی اپنے معاصرین کے مقابلہ میں کیا درجہ رکھتے ہیں، مولانا موصوف کا طرز تحریر اردو انشاپردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے جسکی پیروی ہر انشاپرداز کے لئے ضروری ہے،

اب ہیں ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم کی رائے عالی جو انھوں نے

مولانا شبلی کی کتاب "المامون" پر ظاہر فرمائی ہے نقل کرتا ہوں کیونکہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی رائے سے بھی میرے دعوی کی تائید ہوتی ہے' اسکے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی' ملاحظہ ہو "المامون" حصہ اول صفحہ ۲

"اس کے حاشیوں پر جسقدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کسقدر جانکاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے ہزار ورق تاریخوں کے اُلٹنے پڑے ہوں گے' اور اسی کے ساتھ جب یہ خیال کیا جاوے کہ مصنف نے ان جزئیات کو ایسی کتابوں سے تلاش کیا ہے' جنکی نسبت خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ انہیں مامون کے حالات ہوں گے تو اس محنت کی وقعت دوقدر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے' یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے' اور ایسی صاف وشستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اسپر رشک آتا ہوگا' اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے"

ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم جو خود بہت بڑے اردو کے انشا پرداز تھے' فرماتے ہیں کہ "دلی والوں کو بھی اسپر رشک آتا ہوگا" غور فرمائے اس سے بڑھکر ہمارے لیۓ اور کیا سند ہو سکتی ہے'

اب دوسرا سوال غور طلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ اردو کی خدمت کس نے انجام دی راقم مضمون ہذا اسمیں بھی علامہ شبلی نعمانی کا اسم گرامی پیش کرتا ہے' کیونکہ مولانا کی ذات ادب اردو کے لئے ہمیشہ مایۂ ناز رہیگی' آنکی متعدد تصنیفات نے آسمان علم پر ان کو آفتاب بنا کر چمکایا ہے'

علامہ مرحوم نے "تاریخ نگاری کی بنیاد ایسے زمانہ میں ڈالی جب کہ فن

تاریخ کا شوق ہمارے دلوں سے محو ہو چکا تھا، اردو زبان تاریخی کتابوں سے
بالکل تہی مایہ تھی، اور ملک کا مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھا، ایسے
وقت میں علامہ موصوف کے قلم نے اس فن کے احیاء میں وہ قابل عزت
خدمت کی ہے، جسکو زمانہ ابدالآباد تک فراموش نہ کر سکے گا تاریخ میں انکی
وسعت معلومات کا اندازہ علامہ مرحوم کی مختلف الموضوع تصنیفات سے
لگایا جا سکتا ہے، فارسی نظم کی تاریخ کی کم مائیگی دیکھکر مولانا نے شعر العجم
تصنیف کی، اس موضوع پر اردو زبان میں کوئی کتاب اس سے پیشتر کسی نے
نہیں لکھی، ملک نے بھی علامہ مرحوم کی تصنیفات کی قدر خوب دل کھولکر کی۔

یہ بات ادب اردو کی دنیا میں ضرب المثل ہے کہ اردو زبان بوجہ اپنی کم عمری
کے تہی مایہ ہے اور وہ ابھی ایک کامل الفن زبان کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہے،
یعنی ہنوز اُسمیں اسقدر سرمایہ جمع نہیں ہوا کہ اس سے وہ ایک مستقل زبان بن سکے
اسی بناء پر ارباب فکر عرصہ دراز سے اس امر کی کوشش میں مصروف رہے ہیں
کہ اس اپنی اردو زبان میں کثرت سے تصنیفات و تراجم کیے جائیں، غیر زبانوں
سواد و خیالات اردو زبان میں منتقل کیے جائیں اس فرض اہم کو سوائے
مولانا شبلی کے کسی دوسرے مصنف یعنی مولانا آزاد و مولانا حالی و ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے
اُس سے زیادہ انجام نہیں دیا اور لارڈ مکالے کے اس قول کو رد کر دیا وہ کہا کرتے تھے
کہ "انکی دیسی زبان میں سوائے دودھ کے سمندروں اور ہیرے کے پہاڑوں
وغیرہ کے اور کوئی تذکرہ کرنیکی صلاحیت نہیں، وہ جب اپنے اردو کے کتب خانوں میں
پہونچتے ہیں تو انھیں اردو کے ذخیرہ میں بجز دیوان سودا اور ہیرامن طوطے کے
قصے کے کچھ نہیں ملتا" افسوس! اگر دور حاضرہ میں لارڈ مکالے ہوتے تو کبھی یہ نہ کہتے
کیونکہ علامہ شبلی نے اردو زبان کو متعدد کتابیں خصوصًا تاریخی تصنیف فرما کر

مالا مال کر دیا ہے، اگر مولانا مرحوم کی تصنیفات اُردو ذخیرہ میں سے علیحدہ کر لی جائیں
تو ہمارا اردو کا ذخیرہ بہت خالی ہو جائے اور اُسکی کوئی وقعت نہ رہے، اسکا اعتراف
ہر شخص کو غالبًا کرنا پڑیگا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے اردو زبان کی تقدیر کھولی،
انھوں نے تمام مغلق اور مقفی عبارتوں کو یک قلم برطرف کر دیا، شاہراہ قدیم سے
ہٹا کر اردو شاعری کے لئے ایک نئی راہ نکالی، مرحوم نے مولانا حالی کو نیچرل
شاعری کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ اس کے ثبوت کے لئے نظمیں، شب قدر،
صبح امید، حب وطن، برکھا رُت پیش کیجاتی ہیں،

مولانا آزاد کی نثر میں دو قسم کی کتابیں ہیں اول وہ جو انھوں نے پنجاب کے
سر رشتہ تعلیم کے واسطے لکھیں۔

جن میں اردو کا قاعدہ، پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی کتابیں
و قصص ہند وغیرہ ہیں، دوسری وہ کتابیں جو انھوں نے خود اپنے
شوق سے لکھیں جن میں آب حیات، دربار اکبری و نیرنگ خیال بہت مشہور
ہیں، آزاد مرحوم کی دربار اکبری بہترین کتاب اُردو تاریخ میں خیال
کی جاتی ہے لیکن فلسفہ تاریخی کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ اُس کو تاریخی
حیثیت سے کیا وقعت حاصل ہے؟ مولانا آزاد کی چند کتابیں اردو میں ہیں
وہ بھی سب تاریخی ہیں، نیرنگ خیال میں مولانا آزاد نے خیالی طوطا مینا
اُڑا کر ناظرین کو خوش کر دیا ہے "صنف لطیف" کے لئے سوائے "نصیحت کا
کرن پھول" کے کوئی دلچسپی و کام کی کتاب نہیں، برخلاف اس کے علامہ شبلی
کی مختلف الموضوع تصنیفات سے زن و مرد مساوی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں،
مولانا مرحوم نے شعر العجم و سیرۃ نبوی تصنیف فرما کر جو زبان اردو پر احسان کیا ہے
وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتا،

ڈاکٹر نذیر احمدؒ نے اردو کو دہلی کے گھرانے اور محل سرائے سے نکال کر شاہراہ عام پر بٹھا دیا، مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، مولانا نذیر احمدؒ نے ترجمہ قرآن شریف میں ایسی ہی رواجی اور خانگی اُردو کو ٹھونس دیا ہے اور قرآن عظیم کی اعلیٰ متانت کا خیال نہیں رکھا، ان کا ترجمہ قرآن شریف ناپسندیدہ اور قابل تنسیخ ہے، مولانا نذیر احمدؒ کی تمام تصنیفات دینیات پر مبنی ہیں، اُس سے ہر ملت و مذہب کا شخص مستفیض نہیں ہوسکتا، زیادہ تر کتابیں "جنس لطیف" کی دلچسپی کے لئے لکھی ہیں، مثلاً ایامیٰ، محصنات، بنات النعش، مراۃ العروس وغیرہ جیسیں ایک ہندوستانی گھرانے کی معاشرت کے ساتھ اخلاقی تعلیم کا بیان ہے،

مولانا نذیر احمدؒ کی اردو ایک زمانہ شناس بڑی بی بی معلوم ہوتی ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کی تصانیف میں یادگار غالب، حیات سعدی اور حیات جاوید مشہور کتابیں ہیں اور اردو نثر کے ذخیرہ میں صرف یہ تصانیف یادگار ہیں، مولانا ایک ناصح مشفق شاعر تھے، زبان اُردو پر اُن کا یہ احسان ہمیشہ رہیگا کہ مرحوم نے جسقدر نئے خیالات نظم کئے ہیں کسی دوسرے شخص نے نظم نہیں کئے، اسکا ثبوت مسدس حالی ہے، یہ اردو زبان میں بہت قابل قدر کتاب ہے، اسمیں مولانا نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی جو تصویر دکھائی ہے اُس سے زیادہ موثر کوئی چیز نہیں ہوسکتی، سرسید مرحوم نے اس مسدس کو قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "خدا جب مجھ سے پوچھیگا کہ کیا لایا ہے تو اس مسدس کو پیش کروں گا" اور ہمیں امید ہے کہ مسدس اُن کی ان مولانا دونوں کی نجات کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو مولانا شبلی سے زیادہ کسی نے آجتک اُردو کی خدمت

نہیں کی، مولانا مرحوم کی تصانیف میں سیرۃ نبوی و الفاروق اور شعر العجم وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جو سوائے اردو کے کسی زبان میں نہیں، آنحضرت کی سوانح عمریاں متعدد زبانوں میں لکھی گئیں لیکن ایسی جامع و مانع و مستند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری مولانا مرحوم کی سیرۃ نبوی سے بیشتر کسی نے نہیں لکھی، اسمیں خاص بات یہ لحاظ کے قابل ہے کہ جو اعتراض کسی معترض کے دلمیں پیدا ہوتا ہے اُسکا کافی جواب آگے مطالعہ کرنے سے ملجاتا ہے،

مہاتما گاندھی نے بھی یرودا جیل میں اس کا مطالعہ کیا ہے اور جو اثر مہاتما موصوف پر سیرۃ نبوی مطالعہ کرکے ہوا اُس کا اظہار انگریزی اخبار "کامریڈ" مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں کیا ہے، مولانا شبلی کی تصانیف سے ہر ملت و مذہب کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، موصوف کی تصنیفات نثر میں بہت کثرت سے کتابیں یادگار ہیں، الفاروق، المامون، سیرۃ نبوی شعر العجم، رسائل شبلی خاص کر قابل تذکرہ ہیں اُردو نظم میں مثنوی صبح امید نالہ، شبلی اور بوئے گل یادگار ہیں، مولانا شبلی معدودے چند مصنفوں میں ہیں جنھوں نے کریٹی سیزم تنقید کے اصلی مفہوم کو سمجھا ہے، اور کوشش کی ہے کہ تنقید کا حق اُردو زبان میں بھی ادا کیا جائے۔

غرض علامہ شبلی نعمانی کی ذات اردو زبان کے لئے نہایت قابل قدر تھی، مرحوم نے اس راستہ کو اتنا سہل گزار بنا دیا ہے کہ اُس کے پیرؤوں کو چلنے میں بہت سہولت ہوگئی ہے اور مختلف الموضوع کتابیں تصنیف فرماکر اردو زبان کو مالا مال کر دیا ہے،

راقم مضمون ہذا اپنے دعویٰ کے ثبوت میں مسٹر براؤن آف کیمبرج کی

وہ تحریر پیش کرتا ہے جو موصوف نے شعر العجم مطالعہ کرنے کے بعد ڈیلی نیوز
" [illegible] " میں شائع کرائی تھی، کون کہہ سکتا تھا؟ کہ ۱۹۱۱ء
میں دفعتہ علامہ شبلی کا وجود یورپ میں نمودار ہوگا اور پروفیسر براؤن آف
کیمبرج سے جو آجکل مستشرقین یورپ میں ایک زبردست شخصیت رکھتے ہیں
اور جن کو مشرقی لٹریچر سے خاص دلچسپی ہے خراج تحسین وصول کرے گا،
پروفیسر موصوف نے شعر العجم کی عبارتیں بطور استناد تاریخ ادبیات
ایران میں نقل کی ہیں، الغرض یہ بات اردو زبان کے لئے نہایت باعث فخر ہے
کہ دوسری زبان آس سے سند لے، کیا اب بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ علامہ شبلی
سے زیادہ کسی دوسرے مصنف نے اردو زبان کو ترقی دی؟ موصوف نے جب سے
تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا اسوقت سے لیکر اس جہان فانی کو
خیرباد کرتے وقت تک مصروف رفتار رہے، جس کا ثبوت علامہ موصوف کی
اس رباعی سے ملتا ہے،

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستان لکھی | مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم | خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

راقم مضمون محمد عبد اللطیف صدیقی طالب العلم ایف۔ اے کلاس
محلہ دوگانواں، لکھنؤ۔

تصانیف مولانا شبلی مرحوم

سیرۃ النبی صلعم ۔ جلد اوّل حصہ اوّل (مجلد) قیمت باختلاف کاغذ و جلد ۔

" " حصہ دوم " " " "

جلد دوم " " " "

الفاروق ۔ خلیفۂ دوم سیدنا حضرت عمر فاروق کے سوانح زندگی اور آپ کا طرز حکومت

سیرۃ النعمان ۔ امام ابو حنیفہؒ کی سوانحعمری اور انکے اجتہادات و مسائل

الغزالی ۔ امام غزالی کی سوانح عمری اور اُن کا فلسفہ

سوانح مولانا روم ۔ مولانا جلال الدین رومی کی سوانحعمری، مثنوی اور دیگر تصانیف پر تقریظ

المامون ۔ خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہد سلطنت کے حالات

رسائل شبلی ۔ مولانا شبلی کے مختلف علمی مضامین کا مجموعہ

مقالات شبلی " " " "

مضامین عالمگیر ۔ شہنشاہ اورنگ زیب پر اعتراضات اور اُنکے جوابات

علم الکلام ۔ مسلمانوں کے علم کلام کی تاریخ ۔ اسکی عہد بعہد کی ترقیاں اور علمائے متکلمین کے نظریات

الکلام ۔ جدید علم کلام، عقلی دلائل سے مذہب کا اثبات، اور ملاحدہ و منکرین کا رد

شعر العجم ۔ (حصہ اوّل) شاعری کی حقیقت، فارسی شاعری کا آغاز اور قدما کا دور

" (حصہ دوم) شعرائے متوسطین کا دور

" (حصۂ سوم) شعرائے متاخرین کا دور

" (حصۂ چہارم) فارسی شاعری پر ریویو

" (حصۂ پنجم) فلسفیانہ، صوفیانہ، اور اخلاقی شاعری پر تبصرہ

سفرنامۂ روم و مصر و شام ۔ تینوں ملکوں کی معاشرت و تمدن کا بہترین مرقع ۔

موازنۂ انیس و دبیر ۔ ایک ہی فن کے دو معاصر اُستادوں کے کلام پر تبصرہ جو ادبی تنقید کا بہترین نمونہ ہے قیمت

آغاز اسلام ۔ ابتدائے عہد کی اسلامی تاریخ جو فارسی میں لکھی گئی تھی اُسکا ترجمہ ۔ قیمت

مجموعۂ کلام شبلی (اردو) مثنوی صبح اُمید (اردو) کلیات شبلی (فارسی)

متفرق مضامین ۔ اسلامی حکومت ، اسلامی مدارس ، زیب النسا ، جہانگیر ، کتبخانہ اسکندریہ

ملنے کا پتہ ۔ الناظر بک ایجنسی ۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد میں اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟

ہمارے اردو لٹریچر کے اربعہ عناصر یعنی شبلی، حالی، نذیر احمد اور مولانا آزاد کا نام نامی آسمان شہرت پر آفتاب بنکر چمکا ہے، جنکے خامہ جادو نگار کی دایہ نے دربار شاہجہانی کی اس ننھی سی چھوکری کو مدتوں کی جانفشانیوں کے بعد پال پال کر اس لائق کر دیا ہے کہ وہ اپنی ہمسایہ بہنوں کے پاس جہاں نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی، اب چار چار آنکھیں ملانے لگی ہے، ورنہ ایک وقت تھا کہ اردو کا دائرہ اسقدر تنگ اور غیر وسیع تھا کہ بیچاری گمنامی کے ظلمات میں جا پڑی تھی، علوم وفنون کا اس کے یہاں بہت کم وجود تھا، ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ حیثیت سے بالکل کوری تھی، البتہ اس کے مرتبوں کے دفتر میں شعراء کا نام تھا جو اسے عالم خیال کی سیر کراتے مگر واقعات کے میدان سے دور ہی دور لئے پھرتے تھے، مگر للہ الحمد کہ ایک مدت کے بعد ان بزرگوں (شبلی، حالی، نذیر احمد اور آزاد) کے سہارے پر گمنامی کے عالمگیر تاریکی سے اس نے جو سر نکالا تو آفتاب شہرت کی شعاعیں اس پر عکس فگن تھیں، اس سماں کو دیکھکر اپنی اس عالم بیکسی پر انکی ذرہ نوازیوں کو یاد کر کے بزبان حال وہ بول اٹھی،

شاہان چہ عجب گر بنوازند گدا را"۔

لیکن اتفاق سے ان دنوں بعض علمی حلقوں میں یہ سوال گشت لگا رہا ہے

ہے کہ اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز ان چاروں بزرگوں میں سے کون ہے، خاکسار
کا اس باب میں نتیجہ فکر یہ ہے کہ اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز محمد حسین آزاد ہے
اردوے معلی کا ہیرو ہے آگے چلکر ہم اس کو بخوبی ثابت کریں گے، مگر اول اول
ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انشا پردازی کا اطلاق کن کن اشیا پر ہوتا ہے، انشا پردازی
اعلے درجہ کی لٹریری قابلیت کا نام ہے جسکو فصاحت اور بلاغت کے بیمثل پیرایہ
میں اس طرح ادا کیا جاے کہ اگر کسی واقعہ یا تخیل کی تصویر کھینچنی منظور ہو تو اس کی
زندہ تصویر کا سماں آنکھوں کے روبرو پھر جاے، فصاحت سے یہ مطلب ہے کہ الفاظ
ثقیل بھدے اور غیر مانوس نہوں اور قواعد صرفی کے رو سے صحیح ہوں، اور روزمرہ
اور محاورہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا
ایک فرد خاص ہے[1]، بلاغت اسے کہتے ہیں کہ کلام فصیح مقتضاے حال کے
مناسب ہو، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر خوشی اور فرحت کا موقع ہو تو سرور
وانبساط کی روح پھونکی جاے، اگر غم والم کی داستان بیان کرنی ہو تو رنج ومصیبت
کی تصویر کھینچی جاے، مگر اکثر مواقع ایسے آپڑتے ہیں کہ جہاں کلام کا نشتر دلپر اسی وقت
کھٹکتا ہے جبکہ اسکو گوناگوں طریقہ سے تشبیہ، استعارے اور ضرب الامثال کے
قالب میں ڈھال دیا جاے کیونکہ یہ چیزیں حسن کلام کا زیور ہیں بلکہ سچ یہ ہے
کہ نظم ونثر تصویر اور تحریر میں جو کچھ جادوگری ہے، بہت کچھ انھی کی بدولت ہے[2]
بشرطیکہ اسمیں اعتدال ہو ورنہ اصل مضمون خاک میں ملجائیگا اور فسانہ عجائب
اور پنج رقعہ کے مضامین کی طرح مقصود مبالغہ کے کانٹوں میں الجھکر رہجائیگا، اسکی
مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ مثلاً کوئی اپنے بیٹے کے مرجانے پر بجاے یہ کہنے کے کہ
"میرا عزیز بیٹا مرگیا" یوں کہے کہ "میری آنکھ پھوٹ گئی" یا "میرا گل مرجھا کر

[1] دیکھو موازنہ انیس ودبیر صفحہ ۲، تعریف فصاحت [2] موازنہ انیس ودبیر صفحہ ۵۵

خاک پر گر گیا" تو مضموں کہاں سے کہاں تک بلند ہو جاتا ہے،
اسی طرح ضرب الامثال اور تشبیہات بھی لٹریچر کی روح خیال کیجاتی ہیں جیسے
"دو دلی دو راست، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، چھوٹا منہ بڑی بات" وہ جملے ہیں
جن سے بڑے سے بڑے مضمون کو باتوں باتوں میں ادا کر سکتے ہیں، کبھی معشوق کیلئے
"گل"، زلف کے لیے "بنفشہ" آنکھ کے لیے "نرگس" قاصد کے لیے "باد سحر" لاکر کلام کو
بہت بلیغ بنا دیتے ہیں، اسی طرح کلیجہ پر سانپ لوٹنا، ہوا سے باتیں کرنا آسمان سے
زمیں پنوانا، وہ جملے ہیں جو کلام کے لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں، غرضیکہ
یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بغیر بعض اوقات انشا پردازی کا جمال قائم نہیں رہسکتا
"خلاصہ یہ کہ انشا پردازی کے لیے حسب ذیل چیزیں ازبس لازمی ہیں"

(۱) کلام کا فصیح ہونا، یعنی عیوب ثلاثہ سے پاک صاف ہونا، اگر اس کے
ساتھ ساتھ روزمرہ اور محاورات بھی ہوں تو کلام کی فصاحت اور بڑھ جائیگی، کیونکہ
یہ چیزیں اسکا ایک فرد خاص ہیں،

(۲) کلام کا بلیغ ہونا، اور اس کے لئے مناسب موقع پر تشبیہہ استعارہ اور
ضرب الامثال سے کام لینا جو لٹریچر کی جان ہیں اور حسن کلام کا زیور،

(۳) معانی کا بلیغ ہونا، کیونکہ اعلےٰ درجہ کی بلاغت معانی کی بلاغت ہے،
الفاظ سے اسکا چنداں تعلق نہیں، محض مضامین کو بلیغ یا غیر بلیغ کہہ سکتے ہیں،
"بلاغت الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے"[۱]

غرضیکہ انشا پردازی کے شرائط یہ ہیں، جنکا ایک ادیب یا انشا پرداز میں پایا جانا
لازمی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ انشا پردازی کی یہ تعریف کس کے کلام پر بدرجۂ
اتم صادق آتی ہے، تاکہ اس کو سب پر فوقیت دیجائے، مگر اسکے معلوم کرنے کا

[۱] موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۴۲،

ایک اور بھی ذریعہ ہے وہ یہ کہ اگر ان بزرگوں میں سے کوئی صاحب کسی خاص فن کے دائرہ میں مقید نہ ہونگے بلکہ اس سے نکلکر ہر قسم کے تخیلات پر بھی بہ نسبت دوسروں کے نہایت کامیابی کے ساتھ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں تو ان کو اس حیثیت سے دوسروں پر ترجیح ہوگی، لیکن مشکل یہ ہے کہ ان بزرگوں نے ایک ہی مسئلہ پر بہت کم قلم آزمائی کی ہے، البتہ کہیں کہیں بعض بعض مقامات متحد المعنا میں نظر آگئے ہیں جن کو پہلے موازنہ کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں،

علامہ شبلی شیراز کی مشہور سیرگاہ چشمۂ رکنا باد کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں،

"رکنا باد جو ایک چشمہ ہے شیراز کی مشہور سیرگاہ ہے، اب تو محض ذرا سی نہر رہگئی ہے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں وسیع چشمہ ہوگا، اس کے کنارے بیٹھ کر لطف اٹھاتے ہیں، دوست احباب جمع ہوتے ہیں، ہر قسم کی صحبتیں رہتیں، اکثر اشعار میں مزے لے لے کر اسکا ذکر کرتے ہیں،

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت ۔۔۔ کنار آب رکنا باد وگلگشت مصلیٰ را[۵۱]

آزاد اسکو یوں فرماتے ہیں"

"در بیں مذکور سبزہ وگل کا وطن ہے، خصوصًا فصل بہار میں کہ جب سبزہ فرش خاک پر زمرد سجاتا ہے، پھول سبزہ کے سر پر تاج رکھتا ہے، در و دیوار سے بہار برستی ہے، شادابی ہوا میں موجیں مارتی ہے، شیراز کے گلزار، خاک مصلیٰ، چشمہ رکنا باد، اصفہان کے مرغزار، کوہ الوند کی چوٹیاں، اور دامن پھولوں سے بھرے، ان کے اتار چڑھاؤ پر پانی کی چادریں گرتی ہیں، اور گھاٹیوں میں گرجتے بادلوں کی طرح گرداگرداتی چلی جاتی ہیں وہیں سے لہراتی لہریں نکلتی ہیں۔ لہکتی جھکتی ہوا میں کبھی ابر کبھی بادلوں کی بہار، کبھی مینہ کا پھوار،

۵۱ شعر العجم جلد دوم صفحہ ۲۲۱۔

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت　　کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

اب غور سے دونوں بزرگوں کی عبارت کو دیکھو، کسقدر فرق نظر آتا ہے، دکھانا تو یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے سامان تفریح چشمہ رکنا باد کے کنارے کس قسم کے تھے، مگر آزاد نے اس کے لئے ایک خاص طرز بیان ایجاد کیا ہے جو علامہ کے یہاں بہت پھیکا ہے، خصوصاً خط کشیدہ جملے بہت پر شکوہ اور فصیح ہیں جنھیں محاورہ کے طور پر اکثر بولا کرتا ہیں"

گلستان سعدیؒ کی عالمگیر شہرت اور اسکی عام مقبولیت پر مولانا حالی لکھتے ہیں، اگرچہ اس کے ساتھ بوستان کا بھی ذکر ہے۔

"ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا لب لباب کہنا چاہئے، ظاہراً فارسی زبان میں کوئی کتاب اس سے زیادہ مقبول خاص و عام نہوئی"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بچپن میں اسکی تعلیم شروع ہوتی ہے، اور بڑھاپے تک مطالعہ کا شوق رہتا ہے، لاکھوں استادوں نے انہیں پڑھایا، اور کروڑوں شاگردوں نے انہیں پڑھا، اس کے بیشمار نسخے خوشنویسیوں کے قلم سے لکھے گئے، اور بے انتہا اڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے، مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے، مشائخ اور علمانے اسکی قدر کی[1]"

آزاد اسپر فرماتے ہیں،

"عجائب اتفاق سے ہے کہ اس عہدی کے ۶۵۶ھ میں شیخ سعدی کی زبان پر جوش طبیعت نے ایک چشمہ کھولدیا، اس میں فصاحت نے شربت اور سلامت نے دودھ بہایا، اور گلستان ایک ایسی کتاب سر سبز ہوئی جسکا آجتک جواب نہیں، ادنےٰ سے اعلےٰ تک کوئی پڑھا لکھا نہوگا جس نے اس سے سبق نہ پڑھے ہوں، مگر

[1] سخندان پارس صفحہ ۲۱۲

اس عالم میں پڑھا ہے کہ گویا نہیں پڑھا، .... عجب تر یہ کہ عالم
عارف اور پارسا سے نذیبے حیا تک سب پڑھتے ہیں اور اپنے اپنے مزے لیتے ہیں،
پھر کیسی طبیعت اور کیسا مزاج لیکر آیا تھا کہ شاہانہ، فقیرانہ واعظانہ، نصیحت بزرگانہ
جس مضمون کی حکایت کو چاہو پڑھ لو، اسکی شوخی اپنے انداز سے کبھی بھی نہیں چوکتی،
یہ بھی قدرتی اتفاق ہے کہ حسن قبول نے اُسے محبت کے ہاتھوں پر لیا[9]

آزاد اور حالی کی اس عبارت میں بہت فرق ہے، حالی کی عبارت بالکل سادہ ہے، لیکن آزاد نے کچھ اس ڈھنگ سے لکھا ہے کہ فصاحت کا دریا بہا دیا، اور اسپر خط کشیدہ جملے خاص لطف دیتے ہیں، نذیر احمد کا کوئی مشترک مضمون نہیں ملتا مگر کم سے کم بطور امتحان کے ہم انکی ایک عبارت نقل کیے دیتے ہیں، جسکو انھوں نے لکھکر ایک خاص موقع پر پڑھا تھا، فرماتے ہیں۔

جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے، وہ ایک وقت تھا کہ عربی لٹریچر کے جوبن پر بہار آ رہی تھی، لوگوں میں یہ مادہ ایسا برسر ترقی تھا کہ کوئی متنفس مذاق شعری سے خالی نہ تھا، یہ تو عربی زبان کے عروج کا زمانہ تھا، یوں بھی عرب کو اپنی بولی پر بلا کا ناز تھا، انھوں نے اپنے سوا دوسروں کا نام رکھا تھا "عجم" یعنی گونگے کہ جن کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں، ایسے لوگوں سے کیسی ہی اچھی بات کہی جاتی وہ ہوتی حلیہ فصاحت سے عاری تو اس کے کان پر جوں بھی نہ چلتی، پس ضرور تھا کہ کسی داؤ سے پچھاڑا جائے جو ان کو خوب سا دل لگا ہو یعنی فصاحت" قرآن نازل ہوا تو جو اپنے اپنے وقت کے سرسید، محسن الملک، سید محمود اور حالی شبلی تھے سب کے چھکے چھوٹ گئے[10]

ڈپٹی صاحب کی یہ عبارت جسقدر شوخ اور ظریفانہ انداز میں نظر آتی ہے اگرچہ ایک سلیم الطبع انسان کو ناگوار خاطر معلوم ہوگی لیکن انصاف سے دیکھو

[9] سخندان پارس صفحہ ۶۳، [10] لکچرز آف ڈپٹی نذیر احمد،

تو انشا پردازی کا اعلےٰ نمونہ ہے مگر تاہم آزاد کے جدت فی اختراع کو نہیں پہنچ سکتی ،
جو آگے چلکر مجموعی حیثیت سے معلوم ہوگا ، موازنہ کی یہ چند صورتیں گزر گئیں سب میں
آزاد ہی کو مجموعی لحاظ سے ترجیح رہی ، اور چونکہ اب اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی
اسلئے ہم ہر شخص کے خصوصیات انشا یعنی کلام کی فصاحت بلاغت اور ان کے دائرۂ
سخن کے حدود کی تعیین کے متعلق فرداً فرداً مفصل گفتگو کریں گے ، جس سے یہ اندازہ
لگانا بالکل آسان ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے کس کو ترجیح ہے ، چنانچہ پہلے ہم
علامہ شبلی کے خصوصیات کلام کو دکھلاتے ہیں ، علامہ فرماتے ہیں ،

سب سے اخیر کوکبہ نبوی نمایاں ہوا ، جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش
بچھا جاتا تھا ، حضرت زبیر بن العوام علم بردار تھے ، ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر
پڑی تو پکار اٹھے کہ حضور نے سنا ؟ عبادہ کیا کہتے ہوئے گئے ، ارشاد ہوا کہ عبادہ
نے غلط کہا ، آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے یہ کہکر حکم دیا کہ فوج کا علم عبادہ سے لیکر
ان کے بیٹے کو دیدیا جائے[1] ،

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں ،

"جو لوگ اختیار کے قائل ہیں انکا منتہای استدلال یہ ہے کہ انسان کو خدا نے یہ
اختیار دیا ہے کہ وہ دو متناقض کاموں میں سے جس کام کو چاہے اختیار کرلے ،
اسلئے انسان کو ارادہ اور اختیار حاصل ہے اور اسلئے وہ مجبور نہیں کہا جا سکتا ،
لیکن اسکی تہ میں بھی غلطی ہے ، بے شبہ خدا نے انسان کو ارادہ اور قدرت عطا کی
ہے ، لیکن اس ارادہ پر بھی وہ مجبور رہے ، یعنی جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے
تو ایسے اسباب جمع ہوتے ہیں کہ وہ اس کام کے ارادہ پر مجبور ہوتا ہے ،
لوگوں نے یہ سمجھکر کہ ہمارا نفس بد ہمکو برے کام کا حکم دیتا ہے ، نفس بد کا نام

[1] سیرت النبی صفحہ ۷۷ ،

نفس امارہ رکھا ہے، لیکن خود یہ نفس امارہ کسکا مامور ہے[1]

ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے، کہ علامہ کی عبارت کسقدر صاف شفاف اور سلیس ہوتی ہے، اور مشکل و اطناب طلب مضمون کو وہ کس خوبی سے چند جملوں میں ادا کر دیتے تھے، اسکی بہتیری مثالیں ہم انکے کلام سے پیش کرتے ہیں مگر چونکہ وہ بہت طول طویل ہیں جو کسی طرح یہاں لکھی نہیں جا سکتیں، اسلئے ہم محض چند حوالے پر اکتفا کریں گے،

(۱) غزوۂ بدر ایک مختلف فیہ تاریخی واقعہ ہے، اسمیں مسلمانوں کے پیش قدمی کے علل اور اسباب کا دریافت کرنا کہ آیا انکا مقصد اس سے مشرکین کے حملوں کا دفاع تھا، یا کارواں قریش کو لوٹنا، ایک معرکۃ الآرا مبحث ہے، اور ضرورت ہے کہ اسکے لئے سیکڑوں صفحے کم سے کم وقف کر دیے جائیں، مگر علامہ نے کس خوبی سے قرآن وغیرہ کے چند اصول قائم کر کے محض آٹھ صفحوں پر "غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر" کے عنوان سے لکھدیا ہے،

(۲) ذبیح کون ہے؟ اس طویل المبحث مضمون کو فقط دو ورق میں باوجود پیچیدہ ہونے کے طے کر دیا،

(۳) مکہ معظمہ کی تعیین کے اختلاف کو تین صفحوں میں ادا کیا،"

ان سب باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تاریخ کے مشکل سے مشکل مسائل کو کس آسانی کے ساتھ بات بات میں حل کر دیتے، اور عبارت نہایت سلیس اور رواں ہوتی، اور یہی انکا اصلی کمال ہے، تمام سیرت نبوی، شعر العجم اور ان کی تمام سوانحات کو اٹھا کر دیکھو، سب کو اسی رنگ میں رنگی ہوئی پاؤ گے یعنی عبارت سادہ سلیس صاف شفاف اور رواں ہوگی، البتہ سیرت نبوی میں

[1] شعر العجم جلد پنجم صفحہ ۲۱۶

میں جنکو مولانا نے نہایت جوش اور خروش کے ساتھ لکھی ہے، کہیں کہیں وقعات کے ضمن میں اپنی بہترین انشا پردازی کا جوہر بھی دکھلایا ہے، مگر ان مقامات کو اگر یکجا جمع کر دیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس کے لئے چار ورق درکار ہوں گے، اس جگہ ہم انکی چند بہترین عبارات کو نقل کرتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں،

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم کو اس سروسامان سے سجائی ہیں، کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہگئیں ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے ہیں، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جانواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے، آج کی صبح وہی صبح جانواز وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیاں میں لکھتے ہیں "کہ" آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتشکدہ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہوگیا، لیکن سچ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدہ کفر آذرکدہ گمرہی سرد ہوکر رہگئے، صنمخانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں ملگئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک

کر کے جھڑ گئے، توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا[1] اس سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا نے ولادت نبوی اور اس کے ضمن میں دیگر تاریخی واقعات کو جس گوناگوں انداز میں دکھلایا ہے اس سے اُن کی تاریخی واقعات کو نہایت عمدگی سے قلمبند کرنے کی شہادت ملتی ہے، لیکن خط کشیدہ جملے تبلاتے ہیں کہ عبارت کی ساری شان فارسی الفاظ کی خوشگوار آمیزش نے رکھ لی ہے، اگرچہ فی نفسہ ہم اسے برا نہیں کہتے کیونکہ اردو زبان فارسی کی ہمیشہ سے خوشہ چیں رہی ہے لیکن کسی استاد کے اس مقولہ کو کہتے ہیں اسے زبان اردو "جسمیں تھوڑا رنگ فارسی کا"

پر نظر پڑتی ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ اردو کی یہ شان نہونی چاہیئے، تم خود دیکھو، پیر کہن سال دہر، متاع ہائے گراں ارز، معجز طرازی موسیٰ، آذر کدہ گبر، اوج چیں کے قصر ہائے فلک بوس، کیا یہ جملے اردو جیسی شیریں اور سلیس زبان کے لیئے کسی طرح زیبا ہیں،

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"اب ایک طرف نود سالہ پیر ضعیف ہے جسکو دعا ہائے سحر کے بعد خانداں نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جسکو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لیئے اسکی آستینیں چڑھ چکی ہیں، اور ہاتھ میں چھری ہے، دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے، اب باپ ہی کا مہر پرورہاتھ اسکا قاتل نظر آتا ہے، ملائکہ قدسی فضائے آسمانی سے عالم کائنات کا یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں،

[1] سیرت نبوی جلد اول صفحہ

اور انگشت بد نداں ہیں کہ دفعتہً عالم قدس سے یہ آواز آتی ہے،

طفیاں ناز ببیں کہ جگر گوشۂ خلیل   در زیر تیغ رفت وتمہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا، اسکا صلہ یہی تھا کہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اسکی یادگار رہجائے[1]،

بہرکیف اس ساری داستان سے معلوم ہوا کہ مولانا کی ادبی معرکہ آرائیوں کا جولانگاہ فقط تاریخ ہے جسپر انھوں نے فلسفہ کا رنگ چڑھایا ہے اور انکی عبارت نہایت صاف شفاف اور سلیس ہوتی ہے اسی کو انکا اصلی کمال سمجھنا چاہیے، ملک کا ایک مشہور انشا پرداز لکھتا ہے،

"جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا ہے اردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہونچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہین[2]"

فصاحت وبلاغت کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ کی عبارت چونکہ حشو و زوائد سے پاک اور سلاست اور روانی کا بہترین نمونہ ہے اسلئے فصیح ہے، اور مشکل سے مشکل مسائل کو وہ چند لفظوں میں ذہن نشیں کرا دیتے ہیں اسلئے بلاغت کی جان ہے،

لیکن ایک بات یہاں اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ روزمرہ اور محاورات وغیرہ کی ان کے یہاں بیحد کمی ہے، تاریخی واقعات وغیرہ سے ہٹکر مولانا نے بہت کم لکھا ہے، شعر العجم میں خیال تھا کہ دائرہ تحقیق سے ہٹکر عام تخیلات پر کچھ لکھیں گے مگر اسمیں بھی تمامتر تحقیق ہی تحقیق ہے، البتہ ایک جگہ شاعری کی تعریف کرتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:-

"کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اس شے کی اصل تصویر آنکھوں میں

[1] سیرت نبوی جلد اول صفحہ ۱۰۷، [2] افادات مہدی صفحہ ۲۱۶

پھر جائے تو اس پر شعر کی تعریف صادق آئیگی، دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی یا رنج و غم، غیظ و غضب جوش و محبت، افسوس و عبرت خوشی ان اشیاء کا اسطرح بیان کرنا کہ ان کی صورت آنکھوں میں پھر جائے، یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے، یہی شاعری ہے[1]،"

مگر اس قسم کی مثالیں آپ کو بہت کم ملیں گی، غرضیکہ ان کے خصوصیات کلام کی تلخیص حسب ذیل یوں کیجا سکتی ہے۔

(۱) ان کے ادبی فتوحات کا دائرہ محض فلسفہ تاریخ تک محدود ہے، جسکو انھوں نے سلیس صاف اور رواں عبارت میں لکھا ہے،

(۲) انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، البتہ روزمرہ اور محاورات اور امثال وغیرہ کی ان کے یہاں بہت قلت ہے،

(۳) وہ مضامین جو کسی واقعات یا خاص معلومات سے تعلق نہیں رکھتے اور سراسر تخیلات کے دفتر ہوا کرتے ہیں علامہ کے قلمرو سخن کے حدود سے باہر ہیں،

رہے حالی سو ان کے ادبی کارناموں کو دیکھنے کے لئے ہم ان کی کتابوں کے چیدہ چیدہ اقتباسات ذیل میں درج کر دیتے ہیں، جن سے آسانی کے ساتھ ہم ان کے خصوصیات انشا معلوم کر سکتے ہیں، فرماتے ہیں،

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہوتی تھی، اہل شہر تحفہ بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے، باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا،

[1] شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۲،

مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا، نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے، اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی راے بیان کر رہا تھا، کہ اسمیں کیا خوبیاں ہونی چاہییں، جب سب لوگ اپنی اپنی راے کہہ چکے، تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی راے بیان کرو، مرزا نے کہا، بھئی، میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہییں، میٹھا ہو اور بہت سا ہو سب حاضرین ہنس پڑے[۱]

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"اگرچہ جس زمانہ میں کہ پہلی بار راقم کا دلّی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی، کچھ لوگ دلّی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھکو ہمیشہ فخر رہیگا، وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا، کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچہ بدل گیا اور جس ہوا میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی[۲]"

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی میں ایجاز بیانی کسقدر تھی، وہی مضمون جو دوسروں کے یہاں کئی صفحوں پر نہیں آسکتا ان کے یہاں اس کے لئے فقط چند سطریں کافی ہیں، پھر اسپر عبارت کا سلجھاؤ اور اسکا حشو و زوائد سے پاک صاف ہونا عجیب لطف دیتا ہے، حیات جاوید میں ایک جگہ لکھتے ہیں،

آئین اکبری اول تو زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی، دوسرے جس قسم کے مضامین اسمیں بیان کئے گئے ہیں... فارسی لٹریچر میں کبھی اس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوے تھے، اسلئے اس کے

[۱] یادگار غالب صفحہ ۴۲، ۴۳، [۲] یادگار غالب صفحہ ۱۔

پڑھنے سے جی الجھتا تھا، پھر آئین اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو و خطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے، اسلئے اسکا صحیح کرنا بہت دشوار تھا، سر سید نے اول جہاں تک مل سکے اس کے متعدد نسخے بہم پہونچائے، اسمیں ایک دو نسخہ صحیح بھی مل گیا[1]
انکی ان عبارتوں کو دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ فن سوانح نگاری میں وہ ایک کہنہ مشق استاد کی حیثیت رکھتے تھے، اور جیسا کہ لائف نگاری چاہتی ہے کہ جہانتک ہو اختصار کے ساتھ تمام واقعات زندگی قلمبند کر دے جائیں تاکہ پڑھتے وقت طبیعت میں الجھن نہ پیدا ہو، وہ حتی الامکان ایجاز سے کام لیتے اور حشو و زوائد کو ہاتھ نہ لگاتے تھے، عبارت میں ایک خاص سلجھاؤ تھا اور یہی انکا اصلی کمال ہے جس نے انکو ممتاز بنادیا، اس سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو وہ اس سے ہٹکر انشا پردازی کے عام منظر پر بھی نکل آئے ہیں، شعر و شاعری کا مقدمہ اسکی بہترین نظیر ہے، مسدس حالی کے دیباچہ میں وہ فرماتے ہیں"

البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا، ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت و جنوں کی خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا، کبھی نالہ نیم شبی سے ربع مسکوں کو ہلا ڈالا، کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا، آہ و فغاں کے شور سے کروبیوں کے کان بہرے ہو گئے، شکایتوں کی بوچھاڑ سے زمانہ چیخ اٹھا، طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہو گیا، جب رشک کا تلاطم ہوا ساری خدائی کو رقیب سمجھا، یہانتک کہ آپ اپنے سے بدگمان ہو گئے، جب شوق کا دریا امڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا، بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے .... اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے، گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار ڈالا اور جب چاہا

[1] حیات جاوید

پہن لیا، میداں قیامت میں اکثر گذر ہوا، بہشت دوزخ کی بارہا سیر کی، بادہ نوشی پر آئے، تو خم کے خم لنڈھا دئے، اور پھر بھی سیر نہوے، کبھی خانہ خمار کی چوکھٹ پر جبہ سائی کی، کبھی مے فروش کے در پہ گدائی کی، کفر سے مانوس رہے، ایماں سے بیزار رہے، پیر مغاں کے ہاتھ پہ بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے، بت پوجے، زنار باندھا، قشقہ لگایا، زاہدوں پر پھبتیاں کیں، واعظوں کا خاکہ اڑایا، دیر و بتخانہ کی تعظیم کی، کعبہ و مسجد کی توہین کی، خدا سے شوخیاں کیں، نبیوں سے گستاخیاں کیں، اعجاز مسیحی کو ایک کھیل جانا، حسن یوسفی کو ایک تماشا سمجھا، غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں، قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور باد خوانوں کے منہ پھیر دئیے[۱]۔

اس عبارت کو دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ جسطرح وہ فن لالف نگاری کے استاد تھے وہ ایک کامل انشا پردازبھی تھے، مقدمہ شعر و شاعری کو انھوں نے اسی رنگ میں لکھا ہے مگر انکا بہترین کارنامہ سیرت نگاری ہے، ان کے خصوصیات انشا یہ ہیں،

(۱) سیرت نگاری، اس فن میں جتنی کتابیں انھوں نے لکھی ہے سبکی عبارت سلیس اور بالکل سادہ ہے،

(۲) لالف نگاری سے ہٹکر وہ عام تخیلات میں بھی اپنی انشا پردازی کا بہترین ثبوت دے سکتے ہیں، مقدمہ اسکی دلیل ہے، مگر یہ انکا اصلی کمال نہیں،

(۳) انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، فصیح یوں ہے کہ ان کے یہاں عیوب ثلاثہ سے عموماً الفاظ پاک ہوتے ہیں اگرچہ زیادہ تر سادہ ہی کیوں نہوں، بلیغ اس وجہ سے ہے کہ زیادہ تر اں کی تصانیف فن سیرت میں ہے، یہ فن ایجاز طلب ہے اور ایجاز

[۱] دیباچہ مسدس حالی صفحہ۲،

سلجھاؤ اور حشو زوائد کا نہ ہونا ان کے کلام کا جزو اعظم ہے' اور یہ حد درجہ کی بلاغت ہے
کہ جو فن جیسا ہو اسکو اسی رنگ میں ادا کر دیا جائے'

آقائے اردو علامہ نذیر احمد کا اعلیٰ وصف دہلی کی ٹکسالی زبان کو معیار ترقی پر پہونچا دینا ہے' ان کی بے مثل فصاحت اور اعلےٰ درجہ کی بلاغت لٹریچر کی جان ہے' جسکا اندازہ ان کے اقتباسات کلام سے ہوتا ہے'

فرماتے ہیں' -

"خداوند کریم کا شکر اپنی گویائی کی بساط بھر تو ادا ہو ہی نہیں سکتا اسکی بندہ نوازیاں اور ہزاروں لاکھوں نعمتوں کی مکافات کا حوصلہ' چھوٹا منہہ بڑی بات پیغمبر صاحب کی مدح' اپنی ارادت ناقص کی قدر تو بن ہی نہیں پڑتی ان کی شفقتوں اور دلسوزیوں کی تلافی کا دعویٰ' اتنی سی جان گز بھر کی زبان[1] "

ان جادو بھرے جملوں کو دیکھو' اور پھر اسپر ضرب الامثال کا اضافہ سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے' ایک جگہ فرماتے ہیں'

حسن آرا کے مزاج کی افتاد' ایسی بری پڑی تھی کہ اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا' نہ ماں کا ادب' نہ آپا کا لحاظ' نہ باپ کا ڈر' نہ بھائیوں سے ملاپ' نوکر ہیں کہ آپ نالاں ہیں' لونڈیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں' غرض حسن آرا سارے گھر کو سر پر اٹھائے رہتی تھی' شاہ زمانی بیگم کے آنے سے چاہیئے کہ بڑی خالہ سمجھکر حسن آرا گھڑی دو گھڑی کو چپ ہو کر بیٹھ جاتی' کیا ذکر شاہ زمانی بیگم کو پالکی سے اترے دیر نہوئی تھی اکہ لگاتار دو تین فریادیں آئیں' نرگس روتی ہوئی آئی کہ بیگم صاحب دیکھئے چھوٹی صاحبزادی نے

[1] دیباچہ مراۃ العروس صفحہ

اس زور سے تھپیڑ مارا کہ میری آنکھیں پھوٹتے پھوٹتے بچ گئیں، سوسن نے آفریاد کی کہ بیگم صاحب چھوٹی صاحبزادی نے مجھ سے کہا کہ دیکھوں سوسن تیری زبان جوں ہی ہینے دکھانے کو زبان نکالی نیچے سے تھوڑی ہی میں ایسا مکا مارا کہ سارے دانت زبان میں بیٹھ گئے، گلاب بلبلا اٹھی کہ ہائے میرا کان خونا خون ہوگیا، دائی چلائی کہ دیکھیے مجھ کمبخت کے ایسے زور سے لکڑی ماری کہ بازو میں بدھی پڑ گئی، باورچی خانہ سے ماما نے دہائی دی کہ اچھے کوئی ان کو سمجھانا سالن کی پتیلیوں میں مٹھیاں بھر بھر کر راکھ جھونک رہی ہیں، شاہ زمانی بیگم نے آواز دی کہ حسنا یہاں آؤ، خالہ کی آواز پہچان بارے حسن آرا چلی تو آئی، نہ سلام نہ دعا، ہاتھوں میں راکھ پاؤں میں کیچڑ اسی حالت میں دوڑ خالہ سے لپٹ گئی، خالہ نے کہا حسنا تم بہت شوخی کرنے لگی، حسن آرا نے کہا اس سنبل چڑیل نے فریاد کی ہوگی، یہ کہکر خالہ کی گود سے نکل لپک کر بیخطا بیقصور سنبل کا سر کھسوٹ لیا، ہتیرا خالہ ایں ایں کرتی رہیں ایک نہ سنی[1]"

عبارت سے اعلےٰ درجہ کی انشا پردازی ٹپکتی ہے، طرز ادا بہت دلکش ہے اہل زباں کے روزمرہ کا چٹخارہ اگر دیکھنا مقصود ہو، تو اس عبارت کو پڑھو کہ کس خوبی سے مضموں کو ادا کیا ہے، محاورات کی بھی کثرت ہے۔

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

" یوں دیکھنے اور کہنے کو تو حسن آرا اکیلی مکتب میں بیٹھی مگر کوئی درجن بھر لونڈیاں اسکے ساتھ تھیں اور کوئی کوڑی بھر سہیلیاں، لونڈیاں کا تو یہ قاعدہ تھا کہ بے ضرورت بھی ہر دم اور ہر لحظہ چاروں طرف حسن آرا کو گھیرے رہتیں اور کچھ کام نہیں تو بات بات میں خوشامد بات بات پہ تعریف، ذرا ٹھٹھک لی کہ سب کی سب

[1] نبات النعش صفحہ ۲، ۳،

بول اٹھیں بسم اللہ بسم اللہ، چھینک لی تو سب چلائیں شکر الحمد للہ، مانی جی ہیں کہ جھکے ہی چپکے قل ہو اللہ کی تسبیحاں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی ہیں، انا ہیں کہ بار باران یکاذ دم کرتی جاتی ہیں، اور جو کہیں حسن آرا نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو کوئی جلدی جلدی پنکھا جھلنے لگی، کوئی چوری یا رومال ہلانے کھڑی ہو گئی، کوئی بولی واری جاؤں گلوری کھالو یا گولے ہی کے دو دانے ڈال لو، دیر ہوئی منھ بدمزہ ہو گیا ہوگا، کوئی کہنے لگی، صدقے گئی، ایک گھونٹ شربت ہی پی لو، نگوڑے ہونٹھ ہیں کہ سوکھے جاتے ہیں پپڑیاں بندھ گئی ہیں، بہاڑ میں جائے ایسا پڑھنا اور آگ لگے ایسے مکتب کو، لڑکی کا مونہ تو دیکھو کیسا ذرا سا نکل آیا ہے، یہ کہکر جلدی سے لپک کر چٹاچٹ بلائیں لے حسن آرا کو گلے سے لگا لیا، جس شخص پر حسن آرا کی طرح ایسے لونڈیوں کا غضب الٰہی اور ایسے نوکروں کی بلا مسلط ہو اسکے مزاج کا درست رہنا عجب کی بات ہے، فرشتہ بھی ہو تو ایسی صحبت میں تو بہ بہوتا سے بدتر ہو جائے[1]،

اس عبارت پر نگاہ ڈالو، اہل زبان کے روزمرہ کی بول چال اور اسپر اضافہ یہ کہ محاورات و امثال کی کثرت کو علامہ نذیر نے جس خوبی کے ساتھ اپنے کلام میں جگہ دی ہے، اس سے ان کی انشا پردازی کی غیر معمولی قابلیت کا پتہ چلتا ہے، حق تو یہ ہے کہ دہلی کی ٹکسالی زبان ان کے قلم کے سایہ میں پلکر بام ترقی کے انتہائی زینہ تک پہنچ گئی، اور ان کے قلم کے فیوض و برکات سے مالا مال ہو گئی، رویائے صادقہ کی وہ عبارت جہاں انھوں نے دہلی کی سوسائیٹی کا نقشہ کھینچا ہے، خصوصًا اس بلا کی ہے کہ اسکے متعلق ملک کے ایک مشہور انشا پردار کو یہ کہنا پڑا کہ اس سے بڑھکر چند سطریں لکھنا کسی طرح امکان میں نہیں آ سکتا، مجھے تعجب ہے

[1] بنات النعش صفحہ ۱۰، [2] ایم مہدی۔

ان لوگوں پر جو بے سوچے سمجھے زباں سے کہہ گذرتے ہیں کہ علامہ نذیر احمد کا کلام بلیغ نہیں، ان کی حقیقت بھیڑوں کے غول سے زیادہ نہیں کہ جس راستہ پر ہولیا اندھے ہو کر اسی پر ہمیشہ ہمیشہ چلتے رہے، انکا منتہای استدلال یہ ہے کہ ان کے لکچر ٹو دی پوائنٹ نہیں ہوتے، بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ جس شخص کے لکچروں کا کوئی مستقل عنوان نہیں ہوتا اس کے ٹو دی پوائنٹ ہونے کے کیا معنی! ڈپٹی صاحب محض تفریحاً جلسے میں کھڑے کئے جاتے اور جہانتک ان سے ہو سکتا اپنی جادو اثر تقریر اور اپنی بے مثل فصاحت کا جوہر دکھاتے، کسی خاص مسئلہ پر بولنے کے لیے وہ شاید ہی اسٹیج پر آئے ہوں، اگر بالفرض وہ آتے تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ اپنی بے مثل قادر الکلامی اور اعلے درجہ کی علمی قابلیت کے ہوتے ہوئے ناکام رہجاتے، کیا توبۃ النصوح یا دیگر کتابوں کے لکھنے میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہوئے، الحقوق والفرائض میں انھوں نے ایماں بالقدر کے دقیق مسئلہ کو جس خوبی سے ثابت کیا ہے اس سے ان کی بے مثل بلاغت کی داد دینی پڑتی ہے، البتہ اس جگہ ایک بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ ان کے لکچروں یا دیگر تصانیف میں انگریزی وغیرہ کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ اس طرح آگئے ہیں کہ اس کے کلام کے غیر فصیح ہونیکا دھوکہ ہوتا ہے اگر شرط انصاف یہ ہے کہ ان سب نکتہ چینیوں سے انکا کلام بے نیاز رہیگا، چنانچہ اس کے متعلق امور ذیل کا لحاظ رکھنا کافی ہے،

(۱) ہر زباں کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ وہ دوسری زباں کے بہت سے الفاظ اپنی زباں میں استعمال کرنے لگتے ہیں، مصر و شام میں یورپ کے عام زبانوں کے بہت سے الفاظ معرب ہو کر آگئے ہیں، حالانکہ انکی جگہ خود ان کی زبان میں الفاظ موجود ہوتے ہیں، جیسے پروانہ راہداری کو قدیم عربی میں تذکرہ مرور کہتے ہیں مگر مصریوں نے اس کے ہوتے ہوئے پاسپورٹ کا معرب بسابورط بنا لیا ہے،

(۲) ان کے یہاں ایسے الفاظ بہت کم آپ کو ملیں گے لہذا اس قلت عیوب کی کثرت محاسن کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں، اور نہ اس سے ان کی فصاحت پر کچھ دھبہ آتا ہے مرزا غالب اردو کے مسلم الثبوت شاعر ہیں مگر نقادان سخن اکثر ان کے کلام پہ سخت چوٹ کر بیٹھتے ہیں، لیکن کیا اس معمولی خامیوں سے ان کے اصلی کمال کو کوئی صدمہ پہونچتا ہے گلاب کا پھول دنیا کی بہترین نعمت ہے مگر اسکا حال یہ ہے کہ کانٹوں میں الجھا ہوا ہوتا ہے،

(۳) ہم نے مانا کہ ایسے الفاظ حلیہ فصاحت کے لیے زیبا نہیں، مگر انھوں نے انھیں کچھ اسطرح ادا کیا ہے کہ یہی الفاظ جو دوسروں کے یہاں بیگانہ ہیں، ان کے زور بیان میں آکر اس طرح جذب ہو گئے ہیں کہ اجنبیت کا ذرہ برابر احساس نہیں ہوتا اور نہ اس سے ان کے مخصوص طرز کو کچھ صدمہ پہونچتا ہے، یہ سارا قصور ان کے زور بیان کا ہے،

(۴) اصول نمبر ۳ میں ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اصلی بلاغت معنی کی بلاغت ہے، لہذا نذیر احمد کا کلام اگر بلیغ ہے تو پھر ان چند بے جوڑ اور غیر مانوس الفاظ کی سبک شکنہ چینیوں سے انکی بلاغت ہمیشہ بے نیاز رہیگی،

مگر ان کی ساری کتابوں کو پڑھکر ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ مذہبی دائرہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتے، تاریخ کی طرف جسمیں تحقیق کے ساتھ ساتھ استخراج نتائج کی سخت ضرورت ہے وہ عموماً نہیں آتے، اور یہی انمیں ایک کمی ہے، ان کے خصوصیات انشا کی تلخیص یوں کی جا سکتی ہے،

(۱) وہ مذہبی دائرہ سخن میں رہکر فصاحت و بلاغت کا دریا بہا سکتے ہیں مگر اس سے الگ ہو کر وہ دوسرے کوچہ میں قدم نہیں رکھتے، اور یہی ان میں ایک کمی ہے،

(۲) دہلی کی ٹکسالی زبان کو انھوں نے ترقی دی اور اسپر جا بجا محاورات اور ضرب الامثال کی کثرت لٹریچر کی روح ہے، کلام نہایت فصیح اور بلیغ ہے،

پروفیسر آزاد کے خصوصیات سخن کو ہم دو طرح سے بتلانا چاہتے ہیں، ایک تو وہ جسکا خاص کر تاریخی یا دیگر قسم کے واقعات سے تعلق ہے، دوسرے وہ جو محض تخیلات یا افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں، تاریخی واقعات،

آزاد فرماتے ہیں،

حضرت عشق نے شادی کی تھی، اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا، ہمایوں کو دم بھر جدائی گوارا نہ تھی، دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا، ابھی پنجاب میں ہے، ابھی سندھ میں ہے، ابھی بیکانیر اور جیسلمیر کے ریگتانوں میں سرگرداں چلا جاتا ہے، پانی ڈھونڈھتا ہے تو منزلوں تک میسر نہیں جدھر کا رخ ہے، کہ ادھر سے امید کی آواز آئی ہے، قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی دغا آواز بدل کر بولی تھی، وہاں تو موت منھ کھولے بیٹھی ہے، ناچار الٹے پاؤں پھرا آتا ہے، یہ سب مصیبتیں ہیں، مگر پیاری بی بی دم کے ساتھ ہے، کئی لڑائیوں کے مقاموں میں اس کے سبب سے خطرناک خرابیاں اٹھانی پڑیں، مگر اسے تعویذ کی طرح گلے لگائے پھرا، جب وہ جودھپور کے سفر میں تھا، تو اکبر ماں کے پیٹ میں باپ کے رنج و راحت کا شریک تھا، اس سفر سے پھرے اور سندھ کی طرف آئے، ایام ولادت بہت نزدیک تھے، اس لئے بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑا اور آپ آگے پرانی لڑائی کو تازہ کیا، اس عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک، اقبال کا تارا طلوع ہوا، یہ ستارا ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اٹھی، مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا وہ آفتاب ہوکر چمکیگا اور سارے ستارے اسکی روشنی میں دھندلے ہوکر نظروں سے غائب ہوجاینگے،

ہمایوں کے پاس جب سوار یہ خبر لایا تو اسکی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دائیں بائیں
دیکھا کچھ نہ پایا، آخر یاد آیا کہ کمر میں ایک مشک نافہ ہے، اسے نکال کر توڑا اور
ذرا ذرا سا مشک سب کو دیدیا کہ شگون خالی نہ جائے، اللہ اللہ تقدیر نے کہا ہوگا،
کہ دل میلا نہ کیجیو، اس بچے کی شمیم اقبال مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلیگی،" [1]

اس واقعہ کو پڑھو، آزاد نے ہمایوں کی پریشانی، حمیدہ بیگم سے اس کی شادی اور اکبر کی ولادت کے واقعات کی تصویر کس بلیغ اور دلستان انداز میں کھینچی ہے کہ واقعہ کی زندہ تصویر آنکھوں میں پھر گئی، یہی وہ بلاغت ہے جس پر جسقدر ناز کیا جائے بجا ہے، ملا بدایونی نے ہر چند ہمارا اکبری کی تاریخ لکھی مگر آزاد کی دربار اکبری کے گرد کو نہیں پہنچ سکتی، سبب اسکا یہ ہے کہ ملانے فقط اہم واقعات کو یکجا جمع کر دیا ہے اور درباری امراء پر چھوڑ دے کیا ہے، مگر آزاد نے اس زمانہ کی زندہ تصویر اور اکبر کے کرایکٹر کا مکمل خاکہ کھینچا ہے کہ گویا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی دربار لگا ہے، اور یہ حد درجہ کی بلاغت ہے، اکبر کی سواری کی کیفیت وہ یوں بیان کرتے ہیں،

اب دولہا کے سامنے عروس دولت کی برات گذرتی ہے، نشان کا ہاتھی آگئے،
اس کے بعد اور ہاتھیوں کی قطار، پھر ماہی مراتب اور اور نشانوں کے ہاتھی، جنگلی
ہاتھی پر فولادی پاکھر بن، پیشانیوں پر ڈھالیں، بعض کی مستکوں پر دیوزادی
نقش ونگار، بعض کے چہروں پر گینڈوں، ارنے بھینسوں اور شیروں کی
کھالیں کلوں بہت چڑھی ہوئی ہیبت ناک صورت، ڈراونی مورت، سونڈوں بانیں
گرز، برچھیاں تلواریں لے، سانڈنیوں کا سلسلہ جن کے سو سو کوس کے دم، گردن
کھنچی، سینے تنے، جیسے لقا کبوتر، پھر گھوڑوں کی قطاریں، عربی ایرانی، ترکی
ہندوستانی آراستہ پیراستہ ساز و یراق میں غرق، چالاکی میں برق اچھلتے مچلتے

[1] دربار اکبری صفحہ ۲،

کودتے شوخیاں کرتے چلے جاتے تھے، پھر شیر پلنگ، چیتے گینڈے، بہتیرے
جنگل کے جانور سدھے سدھائے شائستہ چیتوں کے چھکڑوں پر نقش و نگار،
گل گلزار، آنکھوں پر زردوزی غلافت دہ اور ان کے بیل کشمیری شالیں،
مخمل و زربفت کی جھولیں اوڑھے، بیلوں کے سروں پر کلغیاں اور تاج سینگ
مصوروں کی قلمکاری سے قلمدان کشمیر، پاؤں میں جھانجن، گلے میں گھنگرو
چھم چھم کرتے چلے جاتے تھے، شکاری کتے کہ شیر سے منھ نہ پھرائیں، شکار کی
بو پر پتال سے پتا نکال لائیں[1]"

یہاں سواری کی کیفیت کس پرزور عبارت میں بیان کی ہے، الفاظ کا زور شور
خصوصًا کس غضب کا ہے کہ گویا کوئی تفنگ چلا رہا ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتا،
ایک جگہ ذوق مرحوم کی خوش نصیبی کی داستاں لکھتے ہیں،

جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے
فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جس کی خوشبو شہرت عام بنکر
جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی، وہ تاج
سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر
نہ پہونچے، ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے
شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا، چنانچہ اب ہرگز امید
نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستاں میں پیدا ہو، سبب اسکا یہ ہے کہ جس
باغ کا وہ بلبل تھا وہ باغ برباد ہو گیا، نہ ہمصفیر رہے، نہ ہمدستاں رہے
نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے جو خراب آباد اس زباں کے لیے ٹکسال تھا،
وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے، شہر چھاونی سے بدتر ہو گیا، امرا کے گھرانے

[1] دربار اکبری صفحہ ۱۴۳، ۱۴۴،

تباہ ہوگئے، گھرانوں کے وارث علم وکمال کے ساتھ روٹی کھانے سے محروم ہوکر حواس کھو بیٹھے، وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دلپذیر انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کے ایجاد واختراع کی فرصت دی ہیں وہ اور اور کی شاخیں ہیں، انھوں نے اور پانی سے نشوونما پائی ہے وہ اور ہی ہواؤں میں اڑ رہے ہیں"[1]

تم نے ان اقتباسات کو دیکھا، آزاد نے ان واقعات میں کسطرح انشا پردازی کی روح پھونکی ہے، واقعات اپنی اپنی جگہ پر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، کسی میں محض اتنا ہے کہ ہمایوں نے اپنی پریشانی کے زمانہ میں حمیدہ بیگم سے شادی کی اور اکبر کی ولادت ہوئی، ایک میں ہے کہ اکبر کی سواری کی کیا کیفیت تھی، دوسرے میں ہے کہ ذوق مرحوم کی خوش نصیبی کا کیا عالم تھا، مگر آزاد نے کس فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اسکو ادا کیا، غرضیکہ ان اقتباسات کا تعلق واقعات سے تھا جسکے اندر رہکر انھوں نے اپنی انشا پردازی کا جوہر دکھلایا ہے،

(۲) عام تخیلات کی چند مثالیں،

برسات کا سماں دکھلاتے ہیں،

برسات کا سماں باندھتے ہیں تو کہتے ہیں، سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اٹھی، ابر دھواں دھار ہے، بجلی کوندتی چلی آتی ہے ایسا ہی میں سارس اور بگلوں کی سفید سفید قطاریں بہاریں دکھا رہی ہیں، جب بادل کڑکتا ہے اور بجلی چمکتی تو پرندے کبھی دبک کر ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں، کبھی دیواروں سے لگ جاتے ہیں، مور جھنگھارتے ہیں، پپیہے الگ پکارتے ہیں، مجت کا متوالا جنبیلی کی جھڑ مٹ میں آتا ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگ... کر بھار بھی پڑنے لگی ہے، مست ہوکر وہیں

[1] آب حیات صفحہ ۵۴۴، ۶۴۴، ۷۴۷،

بیٹھ جاتا ہے اور شعر پڑھنے لگتا ہے[۵]"

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"جب صبح کا نور ظہور دیکھتا ہے، تو کہتا ہے دیگ مشرق سے دودھ ابلنے لگا، کبھی کہتا ہے دریائے سیماب موج مارنے لگا، کوئی مشرق سے کافور اڑاتا چلا آتا ہے، صبح تباشیر بکھیرتی آتی ہے یا مثلاً سورج نکلا اور کرن ابھی اسمیں نہیں پیدا ہوئے وہ کہتا ہے سنہری گیند ہوا میں اچھالی ہے، صبح طلائی تھالی سر پہ دھرے آتی ہے کبھی مرغان سحر کا غل، اور عالم نور کا جلوہ، آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کرکے صبح کی دھوم دھام دکھلاتا ہے، تو کہتا ہے، بادشاہ مشرق سبز خنگ فلک پہ سوار، تاج مرصع سر پہ رکھے، کرن کا نیزہ لئے مشرق سے نمودار ہوا، شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے تو کہتا ہے مغرب کی چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا اور شنگرفی چادر تان کر سورہا، کبھی کہتا ہے جام فلک خون سے چھلک رہا ہے، نہیں مغرب کے ایوانوں میں آگ لگی ہے، تاروں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکے ہوئے ہیں، دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے اور روپے کی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں[۶]"

حق تو یہ ہے انشا ان عبارتوں پر جھومتا اور ناز کرتا ہے، کثرت تشبیہات نے کلام کو بالاتر بنادیا ہے۔

آزاد فسانہ کے طور پر اپنے ایک خواب کو بیان کرتے ہیں،

یکایک آنکھ لگ گئی، دیکھتا ہوں — کہ میں ایک باغ نوبہار میں ہوں جسکی وسعت کی انتہا نہیں، امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے، آس پاس سے لیکر جہاں تک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگیں اور شاداب ہے، ہر چمن رنگ و روپ کی دھوپ سے

۵؎ آب حیات صفحہ ۸۵، ۶؎ آب حیات صفحہ ۸۶،

چمکتا، خوشبو سے مہکتا، ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے، زمین فصل بہار کی طرح گلہائے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے، اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں یہ سماں ہاں کا دلگیر دلپر ایک عالم طاری ہوا کہ سرتاپا محو ہو گیا، جب ذرا ہوش آیا تو ان چمنہائے دلکشا کو نظرِ غور سے دیکھا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو، پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہوئے ہیں، آب زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں، جو جانور دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں، چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں[1]،

ان چند اقتباسات سے ان کی ہر مضمون پر بے نظیر قادر الکلامی کا کافی ثبوت ملتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ الفاظ کی شیرینی اور ان کی موزونیت اس درجہ کی ہے کہ اس کا خاتمہ کیا جائے، مضمون اسقدر دل میں گھر کرنیوالا ہے کہ بلاغت کی جان اس پر فدا ہے لیکن ان کے کلام میں بعض بعض جگہ انگیزی وغیرہ کے غیر مانوس الفاظ بھی آگئے ہیں جو ایک حد تک ثقیل معلوم ہوتے ہیں، مثلاً ایلکٹریسٹی بل ڈاگ[2]، کڈھب اگاڈزو غیرہ وغیرہ، مگر غور سے دیکھو تو اسکا بھی یہی جواب ہے جو ہم علامہ نذیر احمد کے متعلق دے چکے ہیں، ان کے خصوصیات انشا کا خلاصہ یوں ہوگا،

(۱) وہ تاریخی واقعات اور اس سے الگ ہو کر یعنی عام تخیلات ہر دو اصناف پر کامل مہارت اور قدرت رکھتے ہیں، خلاصہ یہ کہ وہ کسی چیز یا سہارے کے محتاج نہیں، ہر مضمون پر یکساں قادر ہیں،

[1] نیرنگ خیال صفحہ ۳۵، ۳۶)

(۲) انکا کلام نہایت فصیح اور بلیغ ہے، کلام میں کثرت محاورات تشبیہات، استعاروں کی دلفریبی شاعرانہ تخئیل، عبارت کی بیساختگی اور برجستگی لڑیچر کی جان ہیں،

آپ کے سامنے ہر شخص کے خصوصیات کلام اس کے عیوب و نقائص اور ہر شخص کے ادبی معرکہ آرائیوں کی داستان پوری طرح سے بیان کردی گئی خود ہی فیصلہ کو قلم ہاتھ میں لیجئے اور انصاف سے دیکھیے کہ کس کو ترجیح دیجائے خاکسار کا فیصلہ تو یہ ہے کہ اردو کا سب سے بڑا انشا پردازان میں آزاد ہے اسکا، سبب یہ ہے کہ مذکورہ بالا تقریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ہیں کہ ان کے سارے ادبی کارنامے محض تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ وابستہ ہیں، اس سے الگ ہوکر یعنی اگر تاریخ ان سے لے لیجائے تو وہ کچھ نہیں رہجاتے انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، البتہ محاورات روزمرہ تشبیہات اور استعارات وغیرہ کی جو حسن کلام کے زیور ہیں انکے یہاں بہت کمی ہے کمال یہ ہے کہ وہ محض سیرت نگاری کے استاذ ہیں، انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، اس سے الگ ہوکر وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں مگر یہ انکا اصلی کمال نہیں، نذیر احمد کی ساری فصاحت و بلاغت مذہب کے میدان میں کام آسکتی ہے، مگر ان کے کلام میں سوقیت بھی بہت زیادہ ہے،

مگر آزاد، شبلی حالی اور نذیر احمد کی طرح کسی خاص فن کے دائرہ میں مقید نہیں وہ ہر مضمون پر نہایت کامیابی کے ساتھ لکھ سکتے ہیں، خواہ انکا تعلق واقعات سے ہو یا تخیلات سے، اور اعلےٰ درجہ کی انشا پردازی کا یہی کمال ہونا چاہیے، دوسری بات یہ ہو کہ اگرچہ ان تینوں بزرگوں کا کلام فصیح اور بلیغ ہے مگر آزاد کے کلام کو استعاروں کی دلفریبی شاعرانہ تخئیل اور تشبیہات و محاورات کی کثرت کی وجہ اس کے کلام پر فوقیت ہے، غرضیکہ مجموعی حیثیت سے آزاد کو اوروں پر ترجیح ہے،

ملک کا ایک انشا پرداز لکھتا ہے،

وہ سر سید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہجائیں گے، حالی بھی جہانتک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں، لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جنکو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، اس لئے واقعات بھی انھوں نے جسقدر لکھے ہیں قصص (ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں افسانۂ یاراں کہن سمجھئے[1]

اب اردو کی خدمت کا سوال ہے کہ اسکی سب سے زیادہ ان بزرگوں میں سے کس نے خدمت انجام دی، چنانچہ ہم ہر شخص کے متعلق اس کے دائرہ سخن کے حدود کی تعین کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ کس نے کس فن میں کسقدر تصانیف چھوڑی ہیں، تاکہ آسانی کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کیا جاسکے،

مولانا حالی کے کارنامے،

(۱) ادب میں مقدمہ شعر و شاعری، دیوان حالی اردو مسدس حالی، بیوہ کی مناجات، چپ کی داد، وغیرہ،

(۲) فن سیرت میں حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالب،

نذیر احمد کے کارنامے،

(۱) ادب میں مراۃ العروس، نبات النعش، توبۃ النصوح، رویائے صادقہ، الحقوق والفرائض، اجتہاد، مبادی الصرف۔

(۲) فن منطق میں مبادی الحکمۃ،

مولانا آزاد کے کارنامے،

[1] اشارات عہدی صفحہ ۱۷۶،

(۱) ادب میں۔ آب حیات، نیرنگ خیال، سخندان پارس، مجموعہ نظم اردو، نصیحت کے کرن پھول، دیباچہ دیوان ذوق، مکتوبات آزاد، سیر ایران، قند پارسی وغیرہ،

(۲) فن تاریخ میں۔ دربار اکبری،

(۳) فن سیرت میں۔ نگارستان فارس (شعرار فارسی کی مختصر سوانح)

علامہ شبلی کے کارنامے،

(۱) ادب میں۔ شعر العجم ۵ جلدوں میں، مجموعہ کلام شبلی اردو، مثنوی صبح امید، مکاتیب شبلی دو حصہ میں،

(۲) فن سیرت میں سیرت نبوی دو جلدوں میں، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، المامون، سوانح مولانا روم،

(۳) تاریخ میں۔ مقالات شبلی، (تاریخی مضامین کا مجموعہ) عالمگیر پر ایک نظر، رسائل شبلی، وغیرہ

(۴) فلسفہ میں۔ علم الکلام، الکلام،

(۵) مذہبیات میں۔ "ظل الغمام فی قرأۃ خلف الامام"

اسکے علاوہ علامہ حیدر آباد میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہ چکے ہیں، وہاں ان کے اہتمام میں السنہ یورپ کی بہتری کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا، انمیں فلسفہ اجتماع، اور تاریخ تمدن، خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

الندوہ کے سرپرست رکھر مدت تک انھوں نے اردو زبان کی خدمت کی اب ہر شخص کے علمی کارنامے آپ کے سامنے موجود ہیں، اور بجز علامہ شبلی کے کسی نے مذکورہ بالا فنون میں کافی کتابیں نہیں لکھیں، نذیر احمد نے افسانہ کے طور پر چند رسالے لکھدئے، تاریخ سیرت اور فلسفہ کی طرف انھوں نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا

مولانا حالی نے فن سیرت اور کچھ ادب میں کتابیں لکھ کر اپنا کام ختم کر دیا، لہذا نذیر احمد
اور حالی تو خدمت کے لحاظ سے علامہ شبلی کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اب رہے آزاد تو انکی
زیادہ کتابیں فن ادب ہی میں ہیں، فلسفہ یا فن سیرت میں انھوں نے کچھ نہ لکھا،
البتہ نگارستان فارس فن سیرت میں ایک مختصر سا رسالہ ہے، مگر علامہ نے فن ادب کے
علاوہ سیرت اور فلسفہ میں بھی متعدد کتابیں لکھیں، یہی وہ سبب ہے جس سے
کہنا پڑتا ہے کہ اردو زبان کی سب سے زیادہ انجام دینے کا سہرہ علامہ شبلی کے سر ہے،
دوسری حیثیت سے دیکھیں تو یہ حضرات مولانا کے پاسنگ کو بھی نہیں پہونچے، اسکی
وجہ یہ ہے کہ اردو میں فن تاریخ اور سیرت وغیرہ کی بہتیری کتابیں پہلے ہی سے موجود
تھیں، مولوی ذکاء اللہ نے دس ضخیم جلدوں میں ہندوستان کی اسلامی اور برٹش
حکومت کی مفصل تاریخ لکھی، فسانہ عجائب ادب کی بہترین کتاب موجود تھی،
مگر اسلام کے تاریخی واقعات کی سچی داستان کسی کو معلوم نہ تھی،

علم کلام اور فلسفہ یونان کے متعلق زبان اردو میں کچھ ذخیرہ نہ تھا، لیکن علامہ شبلی
نے اس خدمت کا بار گراں اپنے سر لیا اور برسوں کی دماغ پاشی اور طرح طرح کی
جانفشانیوں کے بعد اسلامی واقعات کی تحقیق کی (جو تھیں رسائل شبلی میں مل سکتے
ہیں) اور علم الکلام اور الکلام لکھ کر اس کمی کو ایک حد تک پورا کیا، علامہ کی سب سے
بڑی اردو زبان کی خدمت دار المصنفین کا قائم کرنا ہے جسکے اردو زبان کی خدمات
کا سلسلہ ہمیشہ غیر فانی رہیگا، ملک کا ایک مشہور انشا پرداز لکھتا ہے،

"نذیر احمد اپنی لائق رشک عربیت کے ساتھ کچھ یوں ہی سے رہے،
یادش بخیر! حالی نے مسدس کے ساتھ مقدمہ شعر و شاعری اور حیات
جاوید لکھکر اپنا ٹھکانا کر لیا، لیکن شبلی قطعاً غیر فانی ہیں، آج ہزاروں
صفحے متعدد جلدوں میں ان کے قلم سے نکل چکے ہیں، اور جس موضوع پر

جو کچھ لکھا گیا ہے کسی زبان میں اس سے بہتر مجموعۂ خیال موجود نہیں[1]"
اسلئے علامہ شبلی کی خدمات سب سے اعلیٰ اور ارفع ہیں۔

الراقم محمد یوسف متعلم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، ڈاکخانہ
سرائمیر، ضلع اعظم گڈھ،

[1] افادات مہدی صفحہ ۱۰۸،